

خواتین اور مرد شہزادوں کیلئے ایسٹریکٹ ہندی کا منفرد نامہ

یہاں ڈائجسٹ

MAY
2015

PDFBOOKSFREE.PK

ماڈل: افرات

میک اپ: پرویز بیوٹی پارلر
فوتو گرافی: مسعودی رضا



منہدی کی لائبریری
ماہنامہ ”زرد“ کی سہولت ہو رہی ہے
میں نے اس سہولت کی ذمہ داری سنبھالی ہے
میں نے اس سہولت کی ذمہ داری سنبھالی ہے





صالح محمود

پھول اور سبز رتوں کا موسم دل کو ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔ ذرا سی دیر کو سوچے تاجہ نظر پھول کھلے ہوں اودے، نیلے، پیلے، سرخ، سفید، ہفتا زاروں سے بھینی بھینی مہک آرہی ہو۔ آبشاروں کی گنگناہٹ، ہواؤں کی سرسراہٹ دور بیٹھے ہوئے کسی گھائی پر ہم دیکھ رہے ہیں۔ صبح بیتی کہ شام آن پہنچی دیکھتے ہی دیکھتے نیلے آسمان پر چاند نکل آیا۔ جھک کر دیکھا تو نیلے پانیوں میں سنہرا سنہرا چاند نظر آرہا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ ہر طرف پھول ہی پھول تاجہ نگاہ ایک خاموشی کا عالم اور آپ تنہا.....! تھوڑی دیر کے لیے آپ یہ محسوس کر کے دیکھیں زندگی ہستی ہوئی لوٹ آئے گی۔ مضطرب اداسی ایک پل کو دور ہو کر کہیں دور چلی جائے گی۔ یہ نسخہ ہائے زندگی ہے۔ ڈپریشن اور اداسی دور کرنے کے لیے یہ بہت اہم ٹپ ہے۔ رنگ موسم بہار کے لمحوں میں یہ بات گرہ میں باندھ لیں۔ پریشانیوں میں کام آئے گی۔ رونے سے زندگی کبھی نہیں گزرتی ہنسنے سے سہل ہو جاتی ہے۔ کوئی کسی کے لیے نہیں رکتا لیکن نیکیاں روشنی کے سفر پر لے جاتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی نیکیاں خوشی کے انبار بنتی ہیں۔ محبت، خلوص، ایمان کی حرارت میں سچائی کا دخل ہے۔ ہر عمل میں دانائی، فکر اور محبت کی تکمیل ہے۔ زندگی بار بار نہیں ملتی نہ ہی ادوار پلٹ کر آتے ہیں۔ سو ہم ایک ایک پل کی قدر کریں کہ یہ پھر پلٹ کر نہیں آئیں گے اور وقت گزر جائے گا اور کوئی کسی کے لیے نہیں رکے گا۔ سو ہر کام کو کرتے وقت یہ ذہن میں رکھیے کہ یہ کام یہ چیز آپ کی اپنی ہے اسے تکمیل کے مراحل تک لے جانے کے لیے اسے محبت اور ایمانداری کی ضرورت ہے۔

میں بہت محبت اور یقین کے ساتھ اپنے ہر عمل کو اجاگر کرتی رہتی ہوں۔ زندگی کا آنے والا کل تجربات سے ہی اخذ کیا گیا ہے۔ مایوسی اور دوسروں کی تلخ کلامی پر بد دل ہونے کے بجائے آپ یہ سوچئے کہ دوسروں کے اس طرز عمل سے آپ کو اجر مل رہا ہے۔ آخرت میں بھی اور دنیا میں بھی۔ سو جو بچیاں کسی اور کے عمل سے دکھی یا پریشان ہوں تو اس بات کا یقین رکھیں دوسرے کے طرز عمل سے آپ کو اجر مل رہا ہے یہ نسخہ ہائے کیا ہے جو ہر بچی اپنے پلو سے باندھ لے۔ دوسرے جب دکھ دیتے ہیں تو پلٹ کر اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے بجائے خاموش رہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ صبر کرنے والوں کے لیے بڑا اجر ہے۔

سند یہ ضرور لکھیے ہم جواب ضرور دیں گے۔ آپ اپنی تحریر کو مختصر کیجیے، با مقصد بنائیے لکھتے وقت بنیادی طور پر یہ ذہن میں رکھیے اخلاق، محبت، روایات، مشرقی تہذیب ذہن میں رکھیے۔ خود کشی قتل جیسے موضوعات سے دور رہیے۔ دعاؤں میں یاد رکھیے۔

آپی



صالح محمود

کتاب وسنت کو مضبوطی سے پکڑنا

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں تم میں سے کسی آدمی کو اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی چار پائی پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو۔ اس کے پاس میرے ان احکام میں سے جن کا میں نے حکم دیا ہے یا جن سے میں نے منع کیا ہے کوئی حکم پہنچے تو وہ کہے کہ میں نہیں جانتا جو حکم ہم نے اللہ تعالیٰ کی کتاب میں پایا، ہم نے صرف اس کی پیروی کی۔“ (ابوداؤد، ابن ماجہ، عن ابی رافع)

وضاحت: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار حدیث کے فتنے میں مبتلا ہونے والوں کی پیش گوئی فرمادی ہے جو بالکل صحیح ثابت ہوئی کہ آج کے دور میں بھی کچھ لوگ اس فتنے (کبیرہ گناہ) میں مبتلا ہیں اور جب ان کے سامنے کوئی حدیث پیش کی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہمیں بس اللہ کی کتاب ہی کافی ہے۔ انکار حدیث حقیقت میں قرآن مجید کا انکار ہے کیوں کہ قرآن مجید میں بار بار کہا گیا ہے کہ ”رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اللہ رب العزت کی پیروی ہے۔“

(مزید معلومات کے لیے پڑھیے ترجمہ و تفسیر آل عمران 3 آیت 31، النساء 4 آیت 80)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو آدمی (مسلمانوں کی) جماعت سے ایک بالشت بھی علیحدہ ہو اس نے اسلام کا پٹا اپنی گردن سے نکال دیا۔“ (ابوداؤد، عن ابی ذر)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مجھے قرآن اور اس کے ساتھ اس کے مثل حدیث بھی دی گئی ہے۔ خبردار، عنقریب ایک پیٹ بھرا انسان جو اپنی پٹنگ پر ٹیک لگائے ہوگا، وہ اپنے ساتھیوں سے کہے گا۔ ”اس قرآن کو لازم سمجھو اس میں جو حلال ہے اس کو حلال سمجھو اور جو حرام ہے اس کو حرام سمجھو۔“ حالانکہ جو کچھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام فرمایا ہے وہ اسی کی طرح ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے۔ تمہارے لیے گھریلو گدھے اور چکلی والے درندے حلال نہیں ہیں اور کسی ذمی (وہ کافر جس سے مسلمانوں کا عہد ہو) کا گرا ہوا مال حلال نہیں ہے البتہ اگر اس کے مالک کو اس کی ضرورت نہ ہو اور وہ اس کو چھوڑ دے، جو آدمی کسی قوم کا مہمان ہو تو اس قوم پر لازم ہے کہ وہ اس کی اچھی مہمان نوازی کرے۔“ (ابوداؤد، عن مقدم بن معدیکرب)

(وضاحت: قرآن کی مثل سے مراد یہاں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہیں۔) (مزید معلومات کے لیے پڑھیے انجم 53 آیت 3-4)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مجھ سے خواب میں کہا گیا کہ ایک آقا نے ایک محل تعمیر کیا۔ اس میں دسترخوان لگایا پھر ایک بلانے والے کو لوگوں کو بلانے کے لیے بھیجا جس شخص نے بلانے

freedom to live happily!

freedom

HP A-17/B, S.I.T.E Karachi-75700, Pakistan Ph: 2560911-13, Fax #: 2562570-2560911, e-mail: freedomthp@yahoo.com

راستوں کی طرف بلاتا ہے۔“ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی: (ترجمہ) ”اور میرا یہ راستہ سیدھا ہے تم اس کی پیروی کرو۔“ (الانعام 6: آیت 153)۔ (نسائی۔ عن عبد اللہ بن مسعود)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں بن سکتا جب تک اس کی نفسانی خواہشات میری لائی ہوئی شریعت کے مطابق نہ ہو جائیں۔“ (شرح السنہ۔ عن عبد اللہ بن عمرو)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے میری کسی ایسی سنت کو زندہ کیا جو میرے بعد مٹ چکی تھی تو اس کو ان لوگوں کے ثواب کے برابر اجر ملے گا جنہوں نے اس پر عمل کیا اور ان کے ثواب میں بھی کچھ کمی نہیں ہوگی اور جس نے کوئی بدعت کا کام ایجاد کیا جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پسند نہیں فرماتے تو اس کو ان لوگوں کے گناہوں کے برابر گناہ ملے گا۔ جنہوں نے اس پر عمل کیا اور ان کے گناہوں میں کچھ کمی نہیں ہوگی۔“ (ترمذی۔ عن بلال بن حارث مرفی)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بلاشبہ دین اسلام حجاز (مکہ مکرمہ اور اس کے مضافات) میں اس طرح سمٹ کر آجائے گا جس طرح سانپ اپنے بل میں سمٹ آتا ہے اور اسلام حجاز میں اس طرح جگہ بنائے گا جس طرح پہاڑی بکری پہاڑ کی بلندی پر اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ بلاشبہ دین اسلام آغاز کے وقت غریب تھا۔ یقیناً اس کا اختتام بھی اس کے آغاز کی طرح ہوگا۔ پس خوش خبری ہے اے غریبوں کے لیے جو میرے بعد میری ایسی سنتوں کی اصلاح کریں گے جنہیں لوگ بگاڑ چکے ہوں گے۔“ (ترمذی۔ عن عمرو بن عوف)

☆.....

والے کی دعوت کو قبول کیا وہ محل میں داخل ہوا اور دسترخوان سے تناول کیا آقا اس سے خوش ہوا اور جس نے بلانے والے کی دعوت کو رد کر دیا، نہ تو وہ محل میں داخل ہوا اور نہ ہی دسترخوان سے کچھ کھایا تو آقا اس سے ناراض ہو گیا۔“ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”آقا سے مراد اللہ رب العزت ہیں، بلانے والے سے مراد میں (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور محل سے مراد اسلام ہے اور دسترخوان سے مراد جنت ہے۔“ (داری۔ عن ربیعہ جرشی)

ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری امامت کروائی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بڑا موثر وعظ فرمایا، جس سے آنکھیں اشک بار ہو گئیں اور دل خوف زدہ ہو گئے۔ ایک صحابی نے عرض کیا۔ ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ تو آپ کا الوداعی وعظ معلوم ہو رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کوئی وصیت فرمادیں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ تم اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری بات سنو اور اطاعت کرو اگرچہ وہ جھشی غلام ہی کیوں نہ ہو پس تم میں سے جو آدمی میرے بعد زندہ رہا وہ بہت زیادہ اختلافات دیکھے گا پس تم میری اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو تھامے رکھو۔ ہر سنت کو مضبوطی سے پکڑو اور اپنے آپ کو دین میں نئے کام ایجاد کرنے سے بچاؤ۔ ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے (اور ہر گمراہی دوزخ میں لے جانے والی ہے)۔“ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، عن عریاض بن ساریہ)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سمجھانے کے لیے ایک سیدھا خط کھینچا اور فرمایا: ”یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے۔“ پھر اس کے دائیں اور بائیں کچھ خطوط کھینچے اور فرمایا: ”یہ شیطان کے راستے ہیں اور ہر راہ (کے کنارے) پر شیطان ہے جو لوگوں کو ان

انتظام کروں گی۔“ اس نے وضاحت دینے کے ساتھ ہی جتایا بھی۔
 ”ایسی نہیں ہے میری بہو، دوپہر تک تم لوگوں کا ناشتہ چلتا ہے۔“ انہیں ضمیر ان کی بات پسند نہیں آئی۔
 ”حباب تم ان کے لیے ناشتہ بناؤ میں دیکھتی ہوں ان تینوں کو۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کے کہا اور خود ان تینوں کو اٹھانے چلی گئیں۔

”آپ آخر مجھ سے ایسا سلوک کیوں کر رہے ہیں۔“ حباب کو غصہ آنے لگا تھا۔
 ”یہ آپ مجھ سے کہہ رہی ہیں؟ میں آپ کے ساتھ ایسا سلوک کر رہا ہوں! میں! میں! میں!“ اس نے اخبار کو سمیٹ کر زور سے صوفے پر رکھا۔ حباب ہم کر پیچھے ہو گئی۔
 ”تمنا تو آپ نے میرا ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ سیدھا سا انسان تمہیں مل گیا ہے ناشکری بنی ہوئی ہو۔“ وہ تو بہت ہی غصے میں تھا۔ حباب نے کسمپاس کے اطراف میں دیکھا اگر رضوانہ آگئیں یا کوئی بھائی تو اتنی شرمندگی ہوگی۔

”آہستہ تو بولے۔“
 ”بڑی فکر ہے کوئی سن نہ لے ارے سن لے۔“ وہ تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔
 ”آجائے شہر یار میں اس سے بھی بات کرتا ہوں تم نے بہت ڈرامے کر لیے۔“ حباب تو ہٹا کے گھبرا کے جلدی سے اٹھ گئی۔

ضمیر ان نے کچھ مسکرا کے لب بھینچ لیے اس نے اندازہ کر لیا کہ حباب اس سے ڈر گئی ہے۔
 ”آف اگر ای سن لیتیں تو کتنی شرمندگی ہوتی اور آج یہ کس لہجے میں بات کر رہے تھے۔ کتنا غصہ بھی ہو رہے تھے۔“ وہ خود سے ہمکلام صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔

کچھ ہی دیر میں ضمیر ان بھی کمرے میں آ گیا وہ اعتماد انداز میں بیٹھی رہی تھی۔
 ”کب تک آپ نے میرے ساتھ یہی رویہ رکھنا ہے؟“ وہ اس کے قریب ہی بیٹھا۔
 حباب گھبرا کے اٹھنے لگی ضمیر ان نے ہاتھ پکڑ کر واپس بٹھالیا۔
 ”چھوڑیے میرا ہاتھ۔“ وہ غصہ اور ناراضی دکھانے لگی۔

”انداز تو بڑے پُر اعتماد ہوتے ہیں مگر ڈر کیوں رہی ہو۔“ اس کی آنکھوں میں کچھ شوخی اور شرارتیں لگ رہی تھیں۔

حباب نے اس کے وجہ چہرے کو غور سے دیکھا۔ نگاہوں کے تصادم پر ضمیر ان کے لب مسکرانے لگے۔
 ”زبردستی میری سرشت میں شامل نہیں ہے مگر تمہاری غلط فہمیوں کا میں کیا کروں جو تم نے پال رکھی ہیں۔
 مجھے آج کچھ زیادہ ہی غصہ آ گیا۔“

”آپ مردوں کی یہی نفسیات ہے۔ جب بات نہیں بنتی تو اپنے رتبے اور مردانگی کا زعم چڑھ جاتا ہے۔“ وہ دانت پیس کے طنز کرنے لگی۔

”اگر ایسی بات ہوتی تو تم اور میں فاصلوں پر نہیں سو رہے ہوتے۔“ وہ معنی خیزی سے گویا ہوا۔
 ”اپنی ویز تم جو کرنا چاہو وہ کرو اور مجھے جو کرنا ہے وہ میں کروں گا۔“ اس نے حباب کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام کر خود سے قریب کیا۔

”کیا شکایت کریں گے؟“ وہ چھڑانے لگی۔

”تمہیں بتا کے نہیں کروں گا۔“ وہ پھر مسکرایا حباب کو غصہ آنے لگا اور ہاتھ چھڑا کے باہر نکل گئی۔ ضمیر ان نے قہقہہ لگایا تھا۔

☆.....☆

وہ بہت الجھا ہوا تھا کام زیادہ بڑھ گیا تھا۔ ابھی تک کسی بھی ایسی ایملپلائر کا انتظام نہیں ہو سکا تھا جو خوشنما کی طرح ذمہ داری اٹھا سکے۔ خوشنما ہر کام بہت سمجھداری سے کر رہی تھی اسے زیادہ سمجھنا بھی نہیں پڑتا تھا۔ ساری ڈیلنگ خود کرتی تھی اور ہیشم کو بس بزنس دیکھنا ہوتا تھا۔ کیسا چل رہا ہے۔ خوشنما کی نگاہیں اسے کب سے جانچ رہی تھیں وہ کچھ پریشان بھی ہے۔

”یار! اشعر کسی ایملپلائر کا بندوبست کرو بہت پر اہم ہو رہی ہے۔“ وہ سیل پر اشعر سے بات کرنے لگا۔ خوشنما سمجھ گئی اس کی سیٹ پر ابھی تک کوئی نہیں آیا ہے جس کی وجہ سے ہیشم بہت الجھا ہوا ہے اور وہ اس سے کچھ پوچھے یہ تو وہ چاہتی تھی ہیشم کو ہر طرح سے نارچ کر کے اپنے دل کی تسکین چاہتی تھی۔

”ہاں یار! کوئی نہیں ملی خوشنما کی جگہ پر۔“
 ”نہیں میں اسے لانا نہیں چاہتا۔“ وہ بہت دھیسے لہجے میں بات کر رہا تھا مگر خوشنما کے کان اس کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔

”نہیں یار! مانا جان شاید نہیں مانیں۔“
 ”اچھا اچھا اب تم ان باتوں کو چھوڑو کسی ایملپلائر کا بندوبست کرو سیلری ٹھیک ٹھاک دوں گا۔“ اس نے ساتھ ہی بھی کہا۔
 ”اوکے۔“ یہ کہہ کر سیل آف کر دیا۔

☆.....☆

وہ کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی جو وہ ہر تفسی علی کی لائبریری سے لائی تھی وہ پڑھنے میں مصروف تھی یا ظاہر کر رہی تھی۔

”اگر اعتراض نہ ہو تو ایک دو دن آفس چل سکتی ہو؟“ ہیشم نے بہت سوچ سمجھ کے فیصلہ کیا تھا۔
 ”کیوں؟“ وہ صوفے پر دونوں پاؤں سمیٹے بیٹھی تھی نگاہ بدستور کتاب پر تھی۔

”کچھ اپروول ہیں تم جانتی ہو وہ چیک کر کے آگے کام چلوادو کیونکہ مہر وز انٹرنیشنل کے ٹیک ابھی تک ریڈی نہیں ہوئے ہیں۔“ وہ بہت پریشان بھی تھا۔

”پچاس لاکھ کا آرڈر ہے میں کنسل نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ بہت نقصان ہوگا۔“
 ”اپنے نقصان کی کتنی پرواہ ہے۔“ ساتھ ہی طنز میں بجھا تیر پھینکا۔

ہیشم نے نگاہ اٹھا کے ہنک پڑوں میں اس کے تنے ہوئے چہرے کو دیکھا۔
 ”تم مجھ پر جتنے طنز کرنا چاہتی ہو کر لو میں برا نہیں مانوں گا کیونکہ میں انجانے میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں اس لیے تمہارا ہر خیرہ میں اپنی سر آنکھوں پر رکھوں گا۔“ ہیشم نے ایسے مضبوط اور قریب لہجے میں کہا کہ وہ جھنجپ کر رہ گئی مگر نگاہ ابھی بھی نہیں اٹھائی۔

”مجھے یہ بتاؤ چلو گی یا نہیں؟“
 ”آپ کے آفس والے کیا کہیں گے۔“ اس نے پھر طنز کیا۔

”آفس والے کون ہوتے ہیں اور آفس میرا ہے اور تم میری بیوی ہو میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔“

”یہ تو مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا آپ بھی کسی کی پروا نہیں کرتے۔“

”پلیز خوش آہمی میں بہت تھکا ہوا ہوں تم نہیں جانا چاہتی تھیں زبردستی نہیں کروں گا۔“ اس نے لپٹاپ سینا اور اپنے بیک میں رکھا۔

”مجھے کچھ دنوں کے لیے گھر جانا ہے۔“

”کیوں؟“ وہ جاتے جاتے رکھا اور لچکا ہوا ہاتھ مارا۔

”کیوں کا کیا مطلب ہے میں اپنے ماں باپ سے ملنے جا سکتی ہوں۔“ وہ تیز لہجے میں بولی۔

”ہاں جا سکتی ہو مگر ابھی نہیں میں بہت بڑی ہوں۔“

”آپ کے بڑی ہونے سے میرا کوئی مطلب نہیں میں خود جا سکتی ہوں۔“ وہ اس کے بولنے پر تنک گئی۔

”مگر تم میرے ساتھ جاؤ گی جب تک میرا کام نہیں کرو گی میں جانے بھی نہیں دوں گا۔“ وہ سختی سے غصہ اڑا کر میں گویا ہوا۔

”کیسا کام؟“ وہ انہماک سے بولی۔

”آفس کا کام۔“

”آپ کی خود مرضی ہوئی جو کام کے لیے اپنی بیوی کو استعمال کریں گے۔“ وہ ہنسا گئی۔

”تم بیوی ہو میں اپنے ہر کام کے لیے تمہیں استعمال کروں گا تم خود بھی مجھے نہیں روک سکتی ہو۔“

”آپ نے مجھے خریدا نہیں ہے۔“ وہ چڑھی۔

”خیر یہ لڑائی رات کے لیے رکھو میں ابھی کام سے جا رہا ہوں۔ آج ویسے بھی سونے کے لیے میں آ رہا ہوں ابھی۔“ وہ گہری نگاہوں سے دیکھتا ہوا جانے لگا۔

خوشنما کی پیشانی تو عرق آلود ہو گئی تھی۔ چشم کی شوخیاں تو بڑھتی جا رہی تھیں اسے ڈر بھی لگ رہا تھا اگر کسی دن چشم نے زبردستی کر لی تو وہ تو کچھ بھی نہیں کر سکے گی وہ ویسے بھی بہت فاصلوں پر رہ کر بات کرتی تھی۔

☆.....☆

شہر یار نے اچانک ہی آنے کی کال کر دی تھی۔ حسین بیگم تو جیسے ہول گئیں تھیں۔ وہ تو آرام سے بیٹھی ہوئی تھیں کوئی بھی خاص تیاری نہیں کی تھی۔ شہر یار جبکہ شادی کی تیاری کی وجہ سے خاصی کثیر رقم بھی بھیج رہا تھا اور وہ شہر یار کی عادت تو جانتی ہی تھیں وہ انہیں بولنے سے نہیں چھوڑے گا۔

”نازیہ! ایسا کرو تم اور بیٹا جا کر حسنی کے چند سوٹ لے آؤ۔“

”اماں! اتنی جلدی میں تو پوری تیاری بھی نہیں ہو گی آپ پہلے سے شروع کر دیتیں۔“ نازیہ سبزی کاٹنے میں مصروف تھی اس نے گویا ہوئی۔

”ہاں تم بھی سنا لو ایک تم ہی تو باقی تھیں۔“ وہ گویا فنگی اور ناراضی دکھا کر برامان گئیں۔

”میں تو ایک بات کہہ رہی ہوں۔“ وہ جیسے ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوئی تھی۔

”اگر آپ کہیں تو بیٹا کو بلا لیتے ہیں اور ہاں حسنی کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔“

”ہاں اسے ساتھ لے جاؤ تو اچھا ہے ورنہ وہ شہر یار بعد میں ہمیں سنائے بغیر نہیں چھوڑے گا۔“ حسین بیگم اپنے بیٹے کی عادت سے اچھی طرح واقف تھیں۔

نازیہ نے جلدی جلدی دوپٹہ کا کھانا اور رات کا ساتھ ہی بنا دیا کیونکہ شاپنگ سے واپسی پر ہمت نہیں ہوتی۔ بیٹا کو بھی کال کر کے بلا لیا تھا اور دوپٹہ کو بھی مجبوراً یہاں آنا پڑا تھا۔

بیٹا اور نازیہ، نسرین بیگم کے گھر پہنچی آئیں تھیں۔ حسنی ان کی اچانک آمد سے سخت ناگواریت محسوس کرنے لگی وہ رات کافی ٹیٹ پر بیٹھی رہی تھی اس لیے ابھی تک دن چڑھے تک سو رہی تھی۔ آفس کو نسل بھی شہر یار کے کہنے پر چھوڑا تھا۔

”بھابھی! کیا ہم ایک دو دن بعد نہیں جا سکتے؟“ فان کلر کے پر عجز سوٹ میں اس کی سرخ و سپید رنگت بالکل ہی ہم رنگ ہو رہی تھی۔

”شہر یار اسی مہینے کے آخر میں آ رہا ہے۔ ساری تیاریاں جلدی ہی کرنی ہیں۔“ بیٹا نے اس کی محبت پر کہارات ہی تو شہر یار نے اسے بھی بتایا تھا وہ آ رہا ہے اس کی رات سے گھر میں جان پکان ہو رہی تھی۔

”جلی جاؤ زیادہ کڑے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ نسرین نے ڈپٹ کر کہا۔

وہ کسمسا کے منہ ہانے لگی بیٹا نے اور نازیہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تیار ہونے لگی تھی۔ اسے قصہ تو بہت آ رہا تھا اس نے جھٹ فون اٹھایا اور شہر یار کو جس کال دی وہ جواب میں خود کرتا تھا۔

”آپ کو کیا ضرورت پڑ گئی اتنی جلدی آنے کی اور شاپنگ پر میرا جانا ضروری ہے کیا؟“

”مجھے تو آنا ہی ہے اور شاپنگ تمہاری مرضی سے کر رہی ہیں میری ماں لیکن جبکہ تمہاری پسند ایسی بے کار ہے۔“ وہ سلگانے سے باز نہیں آتا تھا۔

”آخر آپ مجھ پر کیا احسان کر کیوں رہے ہیں شادی کر کے۔“ حسنی کو ایسی کھلی اہانت پر رونا ہی آ جاتا تھا وہ اس کے روز کے ٹھنوں سے تنک آ گئی تھی۔

”میں احسان دوسرے لڑکے پر کر رہا ہوں اگر تم کسی لڑکے کے لیے بندھتی تو وہ ساری زعجی سر پکڑ کر روتا۔“

”آپ انتہائی بے حس انسان ہیں آپ کے علاوہ میری کسی دوسرے لڑکے سے شادی ہو جاتی تو وہ میری قدر کرتا۔“

”ہاں اتنا وزن دیکھ کر قدر ہی تو کرتا۔“ پھر طنز کیا۔

”آخر کیوں میرے وزن کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی۔ شہر یار پہنچ نہیں کب اس کی تذلیل کرنا چھوڑے گا۔

”شہر یار صاحب! ایک بات یاد رکھیے گا۔ کسی کی جب حد سے زیادہ تذلیل کر دی جاتی ہے بعد میں پھر سامنے والے کو کچھ تباہی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔“

”ہا ہا ہا تمہیک کہہ رہا ہوں تم سے شادی کر کے کچھتا بھی سکتا ہوں مگر یہ تمہاری خوش فہمی ہے میں بعد میں بھی کچھتاؤں کا نہیں کیونکہ یہ فیصلہ میرا خود کا ہے۔“ وہ ایک ایک لفظ جتا جتا کے بول رہا تھا۔

”آپ سے بات کرنا ہی فضول ہے۔“ وہ کھسکا کے چڑھ گئی۔

”پھر کیوں کرتی ہو نہیں کیا کرو؟“ وہ پھر بولا۔

”میں جا رہی ہوں۔“

”جاؤ جاؤ اور ہاں ذرا ڈھنگ کے پٹے خریدنا۔“

”اوہ۔“ وہ ہنکار کر کال کاٹ گئی۔

”پتہ نہیں کیا انسان ہے جو مجھے خوش بھی نہیں رکھنا چاہتا اور چوڑا بھی نہیں چاہتا۔“ حنی کا دل شہریار کی طرف سے بدگمان ہوتا جا رہا تھا۔ بے دلی سے تیار ہو کر نیچے آگئی۔ شاپنگ پر جانے کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ نازیبا اور بیاداس کی خاموشی گفتیشی نگاہوں سے ٹوٹ کر رہی تھیں۔

☆.....☆

اس دن وہ دوپہر کی روٹیاں بنا رہی تھی۔ حالانکہ شاید نے کہا بھی رہے دو بازار منگوائی جائیں گی۔ خوشنا نے خود کہا کہ کافی دن اسے یہاں آئے ہوئے ہو گئے تھے ابھی تک اس نے کوئی کام نہیں کیا تھا اور پھر اسے نہ جانے کیوں اس گھر میں اپنا بستر بھی نہیں لگاتی تھی۔ کچھ اس وجہ سے یہ بدمعاش کاغذیال تھا۔

”شاید ماما میں نے روٹی بنا دی ہیں۔“

”بھابھی کل سے میں بنا دوں گی۔“ جوہم نے جھٹ کہا۔

”تمہیں ضرورت نہیں ہے سب اپنی اپنی روٹیاں بنا لیں گے۔“ زہت ماما بولیں۔

”بھابھی! ویسے بھی بڈھم نے اپنا کھانا چٹا الگ کر لیا ہے۔ خوشنا نے الگ کھانا بنایا ہے۔“ شاید نے کويا انہیں جتانے کے ساتھ احساس بھی دلایا۔

زہت تو لا جواب ہی ہو گئیں۔ کیونکہ خوشنا کے سامنے انہیں شرمندگی کی محسوس ہو رہی تھی۔

”شاید ماما! میں رات کا کھانا جلدی بنالوں گی۔ خواہ تو وہ آپ لوگوں کو میری وجہ سے تکلیف ہوگی۔“ ”ارے یہ اس گھر میں ہو کیا رہا ہے۔ سب الگ کھانا کیوں بنا رہے ہیں۔“ جوہم کو یہ بالکل اچھا نہیں لگا۔

”تم بڑوں کے معاملے میں بولنے کی کوشش مت کرو۔“

”کیوں امی! میں کیوں نہ بولوں دادا جان کو یہ بالکل پسند نہیں ہے پھر یہ الگ الگ کیوں بن رہا ہے۔“ وہ تو جیسے پھر ہی گئی۔

”جوہم کھانا اور کوئی الگ نہیں بنا رہا صرف بڈھم کا الگ بنے گا۔“ شاید نے وضاحت دی۔

”مگر چچی! تو غلط بات ہے بڈھم بھائی کی ایسی کیا غلطی ہے جو ایسا ہو رہا ہے۔“ خوشنا کو زہت کے چہرے کا اتار چڑھاؤ سخت گراں گزر رہے تھے۔

”جوہم بیٹا! تم ان معاملوں میں نہیں پڑو جاؤ کا کر اپنا کام کرو۔“ شاید نے اس کا رخارتہ پتہ چتاتے ہوئے بات کو ختم کیا۔

”تم تو بھئی بے وقوف کچھ پتہ ہی نہیں گھر میں کیا ہو گیا ہے۔“ لہجہ ان کا طعنے اور معنی خیز تھا۔

خوشنا ان کا ایسا گہرا طعنے سمجھ گئی تھی۔ وہ زہت ماما کے منہ لگ کے کوئی بد میزبی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر اسے غصہ تو آ رہا تھا۔

”امی! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“

”مجھے کچھ نہیں ہوا میرا تو کسی کو کوئی خیال ہی نہیں۔“ وہ روہنی ہو گئیں۔

”کیا بات ہے کھانا بن گیا یا نہیں؟“ بڈھم نے زہت کی آواز سنی تو یکن میں چلا آیا۔ شاید تو گھبرا گئیں۔

جبکہ خوشنا چونک گئی اور زہت ایک لمحے کو خاموش ہو گئیں۔

”بڈھم بھائی! آپ نے اپنا کھانا چٹا الگ کیوں کر لیا؟“ جوہم ڈائریکٹ اس سے سوال جواب کرنے لگی۔

”اس لیے کہ میں نہیں چاہتا کہ کسی پر ناگوار گزرے میرا اور میری بیوی کا کھانا بنانا بس چند دن کی بات اور ہے میں اپنے فلیٹ میں شفٹ ہونے والا ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”جی یعنی آپ جا رہے ہیں مگر کیوں؟“ زہت کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے۔ کیونکہ بڈھم کے فرزند فلیٹ کو سب نے ہی دیکھا تھا۔ خوشنا سے انہیں حسد اور ملین ہو رہی تھی۔ کاش اس کی جگہ پر جوہم ہوتی۔

”اس لیے کہ میرا چلے جانا ہی بہتر ہے۔“ خوشنا کو یہ بالکل گوارا نہیں تھا کہ وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے یہاں سے فرار حاصل ہو اور وہ الگ گھر میں رہے گی کیسے۔

زہت وہاں سے چلی گئیں۔ وہ اور بہت کچھ خوشنا کو سنانا چاہتی تھیں مگر بڈھم کی وجہ سے چپ ہو گئیں تھیں۔

”بڈھم بھائی! آپ امی سے ناراض ہیں؟“

”میں کسی سے بھی ناراض نہیں ہوں۔ البتہ میری قسمت مجھ سے ناراض ہے۔ پہلے ماں باپ چلے گئے اور اب یہ رشتے دار بھی اپنے نہیں رہے۔“ لہجے میں افسردگی تھی۔

شاید نے بڈھم کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

”بڈھم! ایسی بات نہیں کرو ہم سب تمہارے ہیں۔“

”ماما! مجھے بھی یہ بات کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے مگر کیا کروں۔“ وہ بھی مڑ گیا۔

خوشنا نے گہری نگاہوں سے بڈھم کو جانچا تھا۔

”بڈھم بھائی! تو کاران سے بھی بات نہیں کرتے ہیں۔ دونوں میں کتنی دوستی تھی۔“ جوہم کو اپنی امی پر غصہ تھا کیونکہ ان کی وجہ سے ہی گھر میں تناؤ آ گیا تھا۔

بڈھم بچپن سے ہی حساس تھا۔ ماں باپ کا سایہ جو جلدی سر سے اٹھ گیا تھا۔

☆.....☆

حباب کچھ دنوں کے لیے گھر جانا چاہ رہی تھی مگر راشدہ چھو پھوکی بے وقت آمد کی وجہ سے اسے رکنا پڑا۔

لوشین نے جیسے تہہ کر لیا تھا کہ وہ ان دونوں کی زندگی میں ٹھک بوتی رہے گی۔

”تم ایسا کرو جانا چاہو تو چلی جاؤ۔“ رشوانہ نے اس کی تیاری دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ رات ہی ان سے جانے کا کہہ چکی تھی اور پھر شہریار کی شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے تھے۔

”ابھی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ضمیر ان نے کچھ سوچ کر ہی کہا تھا۔

”ارے جانے دو۔“ رشوانہ اس لیے بھی بھیجنا چاہ رہی تھیں کہ لوشین کی حرکتوں سے حباب کا دل جلتے کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

”امی! جب تک چھو پھو یہاں ہیں میں نہیں چاہتا کہ حباب جائے کیونکہ آپ سب جانتی ہیں۔“ اس نے آہستہ سے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔ اس وقت راشدہ لاؤنج میں کاؤچ پر بیٹھی سو رہی تھیں اور ان کی تینوں بیٹیاں انٹرین ڈراموں میں لگی ہوئی تھیں۔

”ہوں کہ تو ٹھیک رہے ہو۔“

”ارے کھانا نہیں پکا۔“ راشدہ کی شاید بھوک کی وجہ سے آنکھ کھل گئی تھی وہ ان کے کمرے میں چلی آئیں تھیں۔

”کھانا تو تیار ہے وہ حزل آ جائے میں روٹیاں منگواؤں گی۔“

”لو ایسا بھی کیا کہ تم روٹیاں باہر سے منگواؤ ارے میری نوشین سے کہا ہوتا وہ جھٹ پٹ روٹی بنا لیتی۔ وہ زیادہ روٹیاں بنانے سے ذرا نہیں گھبراتی۔“ وہ نوشین کی تعریف کے ساتھ گویا حجاب پر ہنر کر گئیں۔ جیسے وہ پکانے سے بچتی ہو۔

”حجاب تو پکاری تھی میں نے ہی منع کیا تھا تو وہ بنا ہے تمہارے روٹی سے کھانے میں مزہ آئے گا۔“

ضمیر ان نے جواب دیا۔

راشدہ لب بچھنے کے ان دونوں کو دیکھتی رہ گئیں۔ کسے ضمیر ان نے بیوی کا بچاؤ کیا تھا۔

”راشدہ میں ویسے بھی روٹی زیادہ باہر سے ہی منگواتی ہوں۔“

”لو بازار کی روز روز کھانے کے پیٹ خراب نہیں ہوتا۔“ انہوں نے عجب سے کہنے کے بعد گویا عذر اصرار اٹھایا۔ راشدہ کو کچھ جلن بھی ہوئی رضوان اپنی بھوکا کھانا خیال کرتی تھیں۔ کاش اس کی جگہ ان کی نوشین ہوتی۔

”امی! اچھو پھونک کہہ رہی ہیں۔ روز روز کھاتے پیٹ ہی خراب ہو جائے گا۔ ایسا کریں نوشین پکا لیتی ہے روٹیاں۔“ ضمیر ان کے دماغ میں جھٹ آیا کیونکہ راشدہ ہر بات میں نوشین کا ذکر لے آتیں تھیں۔ ذرا انہیں بھی پتہ چلے زیادہ زور اعتمادی بھی گلے پر سکتی ہے۔

”ہاں ہاں میں نوشین کو کبھی ہوں وہ پکا لے گی۔“ راشدہ ذرا ہی حیل کے لیے لکڑی ہوئیں۔ رضوان ابھی کچھ بولنے ہی والی تھیں۔ ضمیر ان نے انہیں اشارے سے چپ کرادیا۔

”میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ بھی ان کے پیچھے چل دیا۔

”امی کیا ہو گیا ہے میں اتنی دیر روٹیاں بناؤں گی بالکل نہیں کل ہی میں نے فیشل وغیرہ کروایا ہے۔“ نوشین تو صبح سے منمنانے لگی۔ ضمیر لاؤنچ کے باہر ہی رُک گیا۔

”ارے تو کیا ہے پھر کروالینا ضمیر ان نے کہا ہے۔“ وہ کسی بھی طرح نوشین کو یہاں فٹ کرنا چاہتی تھیں۔

”امی! اتنا بھی آگے آگے نہیں بولا کریں۔“ وہ تو غصہ کیے جا رہی تھی۔

”ارے اچھا ہے ناں حجاب کی پوزیشن خراب ہو میں چاہتی ہوں ضمیر ان تیرے ہی کام کے ٹن گائے۔“

ضمیر ان کے لب مسکرا رہے تھے۔ کتنا فرق تھا حجاب اور نوشین میں حجاب اپنی پرواہ کب کرتی تھی۔ وہ اپنا کام خود کرتی تھی۔ رضوان کو تو اس نے منع کیا ہوا تھا مگر پھر بھی صبح کے ناشتے کی ذمہ داری اس نے خود لی ہوئی تھی۔

”امی! ضمیر ان تو بہت تیز ہے وہ مجھ پر توجہ نہیں دیتا ہے۔“ اسے حجاب سے رقابت ہوتی تھی۔

”آگے بڑھ بڑھ کے اس کے کام کیا کر تو جہنم دینا ابھی بھی تو دیکھ تیرا ہی نام لیا کہ نوشین روٹیاں پکا لے گی۔“

”امی! ضمیر ان بہت تیز مینا اور گھٹنا ہے وہ اپنی بیوی کو بچا گیا ہے۔“ نوشین کو اپنی ماں کی ناہنجی پر انہوس ہوا۔

”ارے ہاں یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔“ وہ رخسار پر انگلی رکھ کر سوچ میں ڈوب گئیں۔

”کچھ بھی ہے ابھی تو روٹیاں پکا لو ورنہ ضمیر ان تجھے ہی کام پور کھے گا۔“ اس وقت انہیں اپنی ناک کی پڑی تھی۔ نوشین جتنی ہستی روٹی بنانے میں چلی آئی وہاں حجاب پہلے ہی سے موجود تھی۔ کیونکہ حسی کی باتوں پر بھی اسے عمل کرنا تھا۔ نوشین کو کمر میں اپنی آزادی نہ دے کہ وہ کمر کے ہر معاملے میں دخل دے اور ضمیر ان کے آس پاس توا سے بالکل پھٹکے نہیں دے مرد کا کیا بھروسہ کب پھسل جائے۔

”وہ میں روٹیاں بنا دوں؟“ وہ اسے دیکھ کر جھجک بھی گئی تھی۔

”ہاں ہاں بنا دو اور یہ پیاز بھی کاٹ دینا اور ہاں یہ سلا بھی پڑی ہے یہ بھی بنا دینا۔“ حجاب نے تو گویا اسے کام پر ہی لگا دیا۔

”مجھ سے ضمیر ان نے کہا تھا کہ تم روٹی بناؤ گی تو میں تم سے دوسرے کام کروالیتی ہوں۔“ حجاب اسے زچ ہی کرنا چاہ رہی تھی۔

نوشین نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا لیے لیے ناخن پر کیونکہ اس کی ہوتی تھی اسے اپنے ہاتھ بھی تو پیارے تھے۔

”ارے تمہارے تو اتنے لیے لیے ناخن ہیں تم آٹا کیسے کوندھیتی ہو۔“ حجاب نے برا سامنا بتایا اور نوشین کی اس کی اس وقت رونے سے بھی شکل ہو رہی تھی۔

”ہر کام مکروہ ہوتا ہے سواری میں نہیں کروا سکتی۔“ حجاب نے چہرے پر سنجیدگی طاری کی ہوئی تھی۔

”تم میری ایسی بے عزتی نہیں کر سکتی ہو۔“ وہ تنک سی گئی۔

”میں نے تو کوئی بے عزتی نہیں کی ہے۔“ حجاب نے پیاز کے پھلے اتارنے شروع کر دیے۔ وہ تو نوشین کو جان بوجھ کر تنگ کرنے لگی تھی۔

”تم آخر اتنا اترا لیتی کیوں ہوتی؟“

”دیکھو نوشین تمہاری میری ایسی کوئی بے تکلفی نہیں ہے جو میں اتراؤں وہ بھی تمہارے سامنے۔“ ضمیر ان کی کزن ہو اور اس رشتے سے میری ہند میں صرف ضمیر ان کی بہن کی نظر سے نہیں دیکھتی ہوں۔“

”اونہ۔“ وہ تو جواب ہو کے جلتے ہو کر بیٹی کی طرح چلی گئی۔ ضمیر ان فوراً سائیڈ پر ہو گیا اس نے یہاں کی گفتگو بھی سن لی تھی۔

حجاب نے ضمیر ان کو دیکھا تو گڑبڑا گئی۔ شرمندہ الگ ہو گئی کیونکہ نوشین، ضمیر ان کی کزن تھی اسے برا بھی لگ سکتا تھا مگر آگے مہمان کی بے عزتی کی جگہ اس نے بے عزتی نہیں کی تھی صرف نوشین کو اپنے رویے سے احساس دلایا تھا کہ وہ غلط کر رہی ہے۔

”اگر اسی طرح سب کا سامنا کرو اور مقابلہ کر دو تو کوئی کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔“ وہ مسکرایا۔

”میں کوئی مقابلہ نہیں کر رہی تھی جو غلط ہے اسے سمجھا رہی تھی۔“ اسی اثناء میں گھر میں شور مچا ہوا نوشین نے رو رو کر یہ بتایا کہ حجاب نے اس کی بے عزتی کی ہے اور راشدہ بھی شروع ہو گئیں وہ تو وہاں ضمیر ان موجود تھا اس نے ساری گفتگو سن لی تھی نوشین کی مبالغہ آرائی پر اسے غصہ بھی آ رہا تھا۔

”نوشین! حجاب نے صرف تمہارے ہاتھوں کو کھانا اور یہ غلط بھی نہیں کہا ناخن سے سارے کام مکروہ ہوتے ہیں۔“ وہ سمجھانے لگا۔

رضوان کو اسی ہنگامے کا ذکر تھا حجاب نے نوشین کی مکاری پر انہوس کیا۔

”جب تمہیں ان باتوں کا ہی نہیں پتہ کہ لمبے ناخن ہوں گے تو پانی پینا مکروہ ہے اور باتوں کا کیا پتہ ہوگا۔“
انتا گہرا اور صاف معنی خیز نظر کر کے وہ بھی کئی را شدہ اور نوٹین کا منہ کھلا رہ گیا۔

☆.....☆

جاوید احمد کی دو انیاں ختم ہو گئیں تھیں اور اسے لینے بازار جانا تھا۔ خوشنما تھی تو کسی جسم کی پریشانی نہیں تھی مگر اب سارے کام کا دھیان رہنا کوئی رکھنا پڑتا تھا۔ اسن اپنے کالج سے آنے کے بعد سو گئی تھی اور اسے اکیلے جانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

”چلو میں چلتی ہوں۔“ شمینہ نے ہی کہا کیونکہ منہ بھی اکیلی باہر نہیں گئی تھی۔

”ایمن دروازہ بند کر لو۔“ رہانے اسے اٹھایا وہ دونوں نکل گئی تھیں۔ اسٹائل کے میڈیکل سے دوائی ملتی تھی چھوٹے میڈیکل پر تو ملتی ہی نہیں تھی۔ واپسی پر وہ لوگ بازار بھی چلی گئی تھیں۔ کچھ ضرورت کی چیزیں لیتی تھیں۔

”رہنا جلدی نکلوشام ہو رہی ہے تمہارے ابو فکر مند ہو رہے ہوں گے۔“ وہ بس اسناپ پر کھڑی تھیں اور بس کا انتظار کر رہی تھیں بس بھی جلدی ہی آگئی۔ آدھے گھنٹے کے قریب وہ اپنے گھر کے قریب اسناپ پر اتر گئیں۔

سامنے ہی ہشمن اپنی گاڑی میں موجود تھا وہ اسے دیکھ کر چونک گئیں۔

”السلام علیکم۔“ اس نے بڑے مودب انداز میں خوش باش لہجے میں سلام کیا۔

”ارے آپ؟“ رہنا خوش ہو گئی۔ ایک ماہ بعد وہ گھر آئی تھی خوشنما چنگ پٹر کے اسٹیشن سٹوٹ میں لائٹ سے چنگ میک اپ میں بہت پیاری لگ رہی تھی بلکہ اور زیادہ ہی پیاری ہو گئی تھی۔

”کجا آپ؟“ اس نے آج آپ بہت یاد آ رہی تھیں، ابو کی دوائی ختم ہو گئی تھی ای کو لے کر گئی تھی۔ ”وہ بتانے لگی۔“

ہشمن جاوید احمد کے پاس بیٹھا تھا۔
شمینہ رات کے کھانے کے لیے چکن کا گوشت نکال کر پانی میں ڈال آئی تھیں۔ اتنے عرصے بعد اور پنی داماد آئے تھے وہ انہی طرح خاطر داری کرنا چاہتی تھیں۔

”یہ بتائیے ہشمن بھائی! آپ کے ساتھ خوش تو ہیں خیال تو کرتے ہیں آپ کا؟“

”وہ تمہارے سامنے ہیں وہ دیکھ لو کتنا خوش ہیں۔“ خوشنما اپنی طرف سے کوئی بھی بات کہہ کر فکر میں جتا نہیں کرنا چاہتی تھی اور یہ سچ تھا ہشمن اس کے ساتھ بہت خوش تھا اور وہ خود اس کے ساتھ کیا کر رہی تھی وہ جانتی تھی۔

”کھانا کھا کے جانا۔“ شمینہ نے کہا۔

”جی۔“ وہ صرہ بولا کر رہ گئی۔

”میں ابو کے پاس تو بیٹھ جاؤں وہ کیا سوچ رہے ہوں گے سلام کر کے چلی گئی۔“ خوشنما کو وقت گزرنے کا احساس ہوا۔

”آئی! اولو نال! آپ مجھے بتا دیا کریں میں لا دیا کروں گا۔“ ہشمن نے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔

”بیٹا وہ تو خوشنما لاتی تھی تو پتہ ہی نہیں چلتا تھا آج میں اور مرنا نکل گئے تھے۔ دو انیاں اور کچھ اور چیزیں

بھی لاتی تھیں وہ لینے گئے تھے۔“ شمینہ نے بتایا۔

رہنا اس دوران چائے کے ساتھ کچھ لوازمات بھی لے آئی تھی۔ ہشمن کا خوش حراج اعزاز اچھا لگ رہا تھا خوشنما نے ایک نگاہ ہشمن پر ضرور ڈالی کتنا خوش اخلاق بھی ہو گیا تھا۔

”کیا بات ہے نظر لگاؤ گی۔“ اس نے تنہائی ملنے ہی اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”اوہ۔“ وہ ہنکار کے اٹھ گئی۔ جاوید احمد نماز کے لیے اٹھ گئے تھے وہ دونوں کمرے میں اکیلے تھے۔

”پتہ نہیں کیوں آپ کا لہجہ بتا دیا لگ رہا ہے۔“

”یہ تمہاری سوچ ہے جبکہ میں واقعی خوش اخلاق تھا اور ہوں۔ یہ الگ بات ہے کچھ انجانے میں بے وقوفی کی چیز۔“ وہ گویا ہوا۔

”اور بیٹا مرنا تھی صاحب کیسے ہیں۔“ جاوید احمد فارغ ہو کے اندر آ گئے دونوں ہی سنبھل گئے۔

”ماتا جان بالکل ٹھیک ہیں آج کل کتابوں کے مطالعے میں مصروف ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”اور آپ کا بڑا کس کیسا چل رہا ہے؟“

”زبردست اللہ کا شکر ہے بہت اچھا۔“ ہشمن نے مسکرا کر بتایا۔

خوشنما نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا اس کے ابو کے سامنے یہ بالکل نہیں کہتا وہ میرے آفس میں جاب کرتی تھی۔

”ماشاء اللہ، اللہ اور ترقی دے۔“ انہوں نے دل سے دعا دی۔

نوبے تک کھانا تیار ہو چکا تھا جلد ہی لگا بھی دیا۔ ہشمن اسے زبردستی لے کر کھانا کھا کیونکہ وہ اپنے امی ابو اور بہنوں سے نہیں کھاتی تھی اسے اس کا پورا احساس تھا۔

”بیٹا! آتے رہا کرو مجھے بہت خوشی ہوئی آپ خوشنما کو لے کر خود آئے۔“ جاوید احمد نے رخصت کرتے وقت ہشمن سے کہا وہ مسکرا کے سر ہلا کر رہ گیا۔

”انکل! آپ لوگ گھر نہ کریں میں آ جاؤں گا۔“ خوشنما نے بھی دکھاوے کا تہم رکھا ہوا تھا اور نہ تو اسے ہشمن پر بہت فضا آ رہا تھا۔

جاوید احمد اور شمینہ مطمئن ہو گئے تھے ان دونوں کو دیکھ کر۔

☆.....☆

شہر یار کو لگا تھا زیادہ ہی جلدی تھی وہ پاکستان آ گیا تھا حسین بیگم تو بھلا لگئیں تھیں۔ کیونکہ اس نے آتے ہی ان سے حساب کتاب کرنا شروع کر دیا تھا۔

”شہر یار! مائیں تو لے لو آتے ہی شروع ہو گئے۔“ جیسا کہ اس کی جراح بہت ناگوار گزری تھی۔ کیونکہ حسین بیگم خاموش بیٹھی تھیں۔

”ارے میں تو صرف عینوں کا حساب کتاب پوچھ رہا ہوں۔“ شہر یار انہیں وہاں سے پانچ لاکھ روپے بھیج چکا تھا۔ اس کے حساب سے تو تیار ہی ہو جانی چاہیے تھی مگر ابھی بھی باقی تھی۔

”لے لینا بعد میں بھی لے سکتے ہو۔“

”اماں! آپ بتائیں کمرے میں پردے کیوں نہیں لگائے۔“

”کیوں نرسن نہیں بھیجے گی پردے اور قالین سب وہی تو کرے گی۔“ حسین بیگم فوراً بید کی تھیں۔

”آپ نے ان سے کہہ دیا ہے۔“ شہر یار کو ان کی یہ بات اچھی نہیں لگی اس لیے وہ طنز یہ بولا۔
”بولنے کی کیا ضرورت ہے اسے سب خبر ہے اوپر کا پورشن اس کی بیٹی کا ہوگا اس حساب سے سب دینا چاہیے۔“

”اماں! آپ کو پتہ ہے کیا کہہ رہی ہیں۔“
”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اور زیادہ تمہیں غورتوں کے معاملات میں بولنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“
”انہوں نے ذرا تیز لہجہ ڈھکے کے کہا۔“

”میں دہی ہیں آپ جیٹا بائی اماں کیا کہہ رہی ہیں۔“ شہر یار نے خشکی لگا ہوں سے انہیں دیکھا۔
”ارے جیٹا سے کیا بل رہے ہو میں جو کہہ رہی ہوں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“
”کوئی ضرورت نہیں فقیروں والی حرکت کرنے کی میں کیا پردے کا لین بھی نہیں لے سکتا۔“

”جیسے بچاؤ تمہیں وہاں بھی ضرورت ہوگی۔“ وہ جھٹ بولیں۔
”ہاں جب ہی آپ اتنی موٹی سونے کی پٹن بننے لگی ہیں۔“
”بے غیرت ذرا تجھے شرم لگا نہیں ماں کی چیزوں پر نظر رکھ رہا ہے۔“

”میں آپ کی چیزوں پر نظر نہیں رکھ رہا بولنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں نے پانچ لاکھ بیسے تھے آپ لوگوں کے پاس اتنے بھی نہیں تھے کہ پردے اور قالین بھی لے لیں۔“ شہر یار کی کوئی بات ایسی نا جائز نہ تھی کہ جس سے گتے اعتراض نہ اٹھایا جائے۔

”شہر یار ابھی تیری بیوی آئی نہیں ہے اور اس کی فکر پہلے سے ہونے لگی ہے کہ اس کی تیاری ہوئی یا نہیں۔“ حسین بیگم سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ پھٹ پڑیں۔
”میں تو صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ کیسے خرچ کر رہی ہیں۔“ وہ بھی پیچھے نہیں ہٹا۔

”شہر یار اس وقت ان باتوں کو چھوڑا اور کھانا کھا۔“ نازیہ نے ان سب کا ادھیان ہٹانے کے لیے کہا۔
”ہاں ابھی مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ جیٹا حسین بیگم کے بیڑ سے اتریں۔
”یہ ارومہ کہاں ہے؟“ شہر یار نے پوچھا۔

”اندر بچوں کے ساتھ ہے۔“ نازیہ نے بتایا۔
”جیٹا بائی! آج حجاب کے گھر چلے ہیں۔“ شہر یار نے کہا۔
”میں بھی چلوں گی۔“ ارومہ بھی ڈانٹک روم میں آگئیں۔
”آپ حجاب کے پاس جاتیں رہا کریں۔“

”جانی ہوں مگر کچھ“ جیٹا نے کہا۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد شہر یار بچوں کے پاس بیٹھ گیا کیونکہ اسے اپنے بیٹے جیٹا کی کاس بیٹھنے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔
”شہر یار ماموں! حجاب کے گھر میں بھی چلوں۔“ ارومہ نے پوچھا۔
”ہاں چلو۔“

”میں رہنے دو۔“ جیٹا نے جھٹ منہ کیا۔
”امی کو میں جانتی ہوں اپنا سکوپ خراب ہونے کی جو پڑی رہتی ہے۔“ ارومہ تو ایک منہ پھٹ گئی۔
”ساری اس میں باپ والی خصلت ہے وہ بھی مجھ سے ایسے ہی بات کرتا تھا۔“ جیٹا نے بہت قصہ میں کہا۔

”وہ آپ کی حرکتوں کی وجہ سے ہی کہتے ہوں گے۔“ ارومہ نے بھی ترکیز کی جواب دیا۔
”ارومہ بہت بری بات ہے۔“ شہر یار نے خامی سنجیدگی سے اسے سرزنش کی۔
”یہ اوقات ہے اولاد مجھے باتیں مارتی ہے اور میں نے اپنی جوانی ان کو پالنے میں گزار دی اور یہ اپنی ماں کو ایسے بولتے ہیں۔“ جیٹا رو پائی ہوئیں۔

”کم آن جیٹا بائی! یہ نا سمجھ پنکی ہے۔“ شہر یار کو یاد ہوا۔
”ایسی بھی نا سمجھ نہیں ہے ہر وقت اپنی ماں کی بے عزتی کرتی ہے۔“ وہ آج باقاعدہ رونے لگی تھیں ارومہ جیز ہوئی تھی وہ تو اپنے اندر کا قصہ نکالتی تھی وہ جیٹا کی عدم بے توجہی کی وجہ سے آج اور ترش ہو گئی تھی۔
”شہر یار کو آج واقعی جیٹا پر بہت ترس آنے لگا اور وہ روئی بھی تو تھیں۔“

☆.....☆
”امی یہ لوگ تو لگتا ہے یہاں چپکنے کے لیے آئی ہیں۔“ آدم کو بہت قصہ آ رہا تھا۔
”رضوانہ بچن میں تھیں شہر یار اور جیٹا نے آئے تھے۔ ان کے لیے چائے وغیرہ بنانے آئیں تھیں۔ حجاب کو انہوں نے اٹھنے نہیں دیا تھا۔“

”مامی لایے میں کچھ کام کروادوں۔“ نوین نے اپنی خدمات پیش کیں۔
”نہیں تم آرام سے بیٹھا آرام کرنے آئی ہو۔“ آدم نے اسے دیکھتے ہی سلگتے ہوئے طنز کیا۔
”آدم! میں آپ سے بات نہیں کر رہی ہوں۔“ نوین ویسے بھی ان لڑکوں کے منہ نہیں لگتی تھی۔ وہ تو یہاں آنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ تو راشدہ اسے اتنی سناتی تھیں۔ مجبوراً آنا پڑتا تھا۔ جبکہ اس کی پڑھائی بھی اپنی ڈسٹرب ہوئی تھی۔

”امی سے بھی کیوں کہہ رہی ہو جنہیں اور کوئی کام نہیں ہوتا جو یہاں پڑی رہتی ہو۔“
”آدم! کیا بد تمیزی ہے بد مانع تو درست ہے۔“ رضوانہ اٹھنے کی ٹرے تیار کر چکی تھیں۔
”مامی! دیکھیے میں ایسی بالکل نہیں ہوں یہاں تو امی مجھے زبردستی لے کے آئی ہیں۔ جبکہ میری پڑھائی بہت ڈسٹرب ہوتی ہے۔“ اس نے برامانے کے ساتھ تفصیل سے وضاحت بھی دی۔

”آدم اسے طنز یہ اور فہمائی لگا ہوں میں تسخیر لے دیکھنے لگا۔“
”لگتا تو نہیں تمہیں پڑھائی سے لگاؤ ہے۔“
”آدم! تم چپ کر جاؤ اور جاؤ یہاں سے۔“ انہوں نے اسے ڈانٹ دیا۔
”نوین جیز یہی خاموش کھڑی تھیں رضوانہ نے اسے بغور دیکھا۔

”جیٹا تم اس کی باتوں کا برا نہیں ماننا ذرا مزاج کا تیز ہے اس لیے چڑچڑا ہو گیا ہے۔ ہر وقت کام میں مصروف جو رہتا ہے۔“ انہوں نے کہا۔
”اچھا تم ایسا کرو کہ یہ چائے کی کیوں کی ٹرے تم لے کر چلو۔“
”نوین ان کے ساتھ ساتھ ذرا تنگ روم میں آگئی۔ حجاب نے انہیں دیکھا تو لگا ہوں میں ناگواری آگئی۔“

”ارے بیٹھ جاؤ۔“ رضوانہ نے نوین کو ٹرے لے جاتے دیکھا۔
”مامی مجھے امی بلارہی ہیں۔“ وہ بہانہ بنا کر بیٹی کی بائیں اس نے حجاب کی لگا ہوں میں ناگواری دیکھ

☆.....☆

☆.....☆

لی تھی۔

”بیٹا! کتنے دن کی پھٹی پر آئے ہو؟“

”اس دفعہ تو تین ماہ کی پھٹی پر آیا ہوں۔“ شہریار نے رضوانہ کو بتایا۔

”آپ کے گھر کوئی آپا ہوا ہے۔“ رضوانہ نے جیسے نوین کی آمد پر استفسار کیا انہیں اعزاز دے ہو گیا تھا رضوانہ کی ننھا اپنی بیٹیوں کے ساتھ آئی ہیں۔

”رضوانہ! کسی بات میں کرتی ہیں ان کا گھر ہے کوئی بھی آئے۔“ شہریار کو ان کا یوں پوچھنا اچھا نہیں لگا۔

”شہریار! کسی کوئی بات نہیں ہے۔“ ضمیر ان نے جھٹ کہا۔

”وہ ان کی پھو پھو آئی ہیں اپنی بیٹیوں کے ساتھ۔“ رضوانہ نے بتایا۔

حباب ان سب کے سامنے لوازمات رکھنے لگی تھی۔ گفتگو کے ساتھ چائے وغیرہ چل رہی تھی۔

”تم ان بڑکیوں پر نظر رکھا کرو۔“ رضوانہ نے گوشتی میں حباب کو گویا صحت کی۔

حباب سنبھل گئی کیونکہ ضمیر ان کی توجہ اس کی طرف ہی تھی۔

شہریار نے پھر کچھ دیر میں جانے کی اجازت لی تھی۔

”ضمیر ان کچھ دن کے لیے میری بھانجی کو رہنے دیجو۔“ شہریار نے کہا۔

”میری طرف سے پابندی نہیں ہے۔“ اس نے خوشدلی سے کہا۔

”حباب کل آ جاؤ۔“ شہریار نے کہا تھا۔

”شہریار! ماؤں کچھ دن بعد آ جاؤں گی۔“ وہ راشدہ جب تک وہ بھی جانے کا نام نہیں لے رہی تھی اور وہ اپنے شو پر پر کسی اور لڑکی کی نگاہ اور توجہ برداشت نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”اوکے۔“ وہ بولا تھا۔

ان کے جانے کے بعد کچھ سیمینا ٹوشن اور کرن ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ البتہ نوین راشدہ سے ابھی ہوئی تھی۔ حباب کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس بات پر رہم ہو رہی تھی۔

”مجھے آئندہ آپ ساتھ لے کے نہیں آئے گا۔“ نوین کو آج آدم کی باتیں بہت بری لگی تھیں اور حباب کی ناگواریت بھی۔

”زیادہ میرا دام نہیں کھاؤ۔“ آدم نے جاتے جاتے ٹک کے سنا نوین راشدہ کے سامنے کھڑی تھی۔

”میں آئندہ نہیں آؤں گی اور آپ بھی۔“

”اوہو آج مختصر کہہ کر بڑی لگ گئی ہے۔“ آدم کو خوشی ہوئی کسی طرح تو اسے احساس ہوا کہ یہاں آ کے غلطی کرتی ہے۔

☆ ☆

”اور سناؤ تمہارا مسئلہ حل ہوا۔“ اشعر نے پوچھا۔

”مسئلہ تو بچ کا وہ ہیں ہے خوشنما نے صاف انکار کر دیا ہے۔“

”تم اشتہار دے دو تو زہر پیو۔“

”وہ تو میں نے دیا ہوا ہے ہر بندے کو سنے طریقے سے سمجھانا یا بہت مشکل ہوتا ہے۔“ ضمیر واقعی بہت پریشان لگ رہا تھا۔

”لگتا ہے تم بھابھی کو ہی رکھنا چاہتے ہو۔“

”نہیں یا! میں اب خود بھی اسے نہیں چاہتا آفس میں کیونکہ وہ میری بیوی ہے۔“ اسے جیسے کچھ آگیا تھا کہ خوشنما کو آفس میں لانا ٹھیک نہیں ہے آفس کا تمام اسٹاف غلط سوچوں سے ان دونوں کو دیکھیں یہ مناسب نہیں تھا۔

”پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔“ اشعر نے کہا۔

”مگر یا میرا بہت لاس ہو رہا ہے کیا کروں؟“

”بھابھی سے کہو وہ کچھ ہیپ تو کر دیں گی۔“ اس نے ضمیر کو دیکھا جو ٹیبلٹ میں لگا ہوا تھا۔

”یار! اس سے آفس کی بات کرنا نہیں چاہتا۔“ وہ پچھلی بحث و لڑائی کب بھولا تھا۔ خوشنما نے صاف انکار کر دیا تھا۔

”خیر بھابھی تمہارا کچھ تو خیال کریں گی تم دوبارہ بات کرو۔“

”مجھے یہ بتاؤ جب تمہارے آفس میں کام کرتی تھی تب ایسی ہی تھیں تھی۔“

”ہاں وہ اپنے کام سے کام رہتی تھیں۔ زیادہ کسی سے بات چیت نہیں کرتی تھیں بلکہ زیادہ تر اپنا چہرہ سخت بنائے رکھتی تھیں۔“ اشعر نے خوشنما کو بہت دفعہ چپک کیا تھا۔ وہ کسی بھی اسٹاف ممبر کو فری نہیں کرتی تھی اور نہ ہی بلا ضرورت بات کرتی تھی۔

”جب میرے پاس حباب کرتی تھی تو وہ ایسی ہی تھی۔“ ضمیر نے بھی کہا۔

”ہوں۔“ اشعر نے پھر اسے ہر سوچ دیکھا۔

”تمہاری کہیں بات وغیرہ چلی؟“ ضمیر نے بات ہی پلٹ دی۔

”بات وغیرہ یا میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ اشعر اپنے بڑے بھائی کی وجہ سے بہت بددل تھا وہ شادی کے بعد بیوی کے کہنے پر الگ ہو گیا تھا اور ابھی تک کوئی بھی رابطہ نہیں رکھا تھا۔ اشعر کی ماں کو اتنا دلی صدمہ ہوا تھا اس نے اتنی مشکلوں سے انہیں سنبھالا تھا۔

”کیوں اکیلے زندگی گزارنی ہے آئی کا خیال کرو وہ کتنی بیمار رہنے لگی ہیں کوئی تو ان کی دیکھ بھال کے لیے ہو۔“

”ضروری ہے میری شادی ہونے سے ان کی بیماری ختم ہو جائے گی۔“ اشعر نے تسخراڑا کے کہا۔

”تمہاری بیوی آئے گی تو ان کی تنہائی بھی دور ہو جائے گی۔“ ضمیر جواب میں گویا ہوا۔

”اشعر! بھائی کی شادی امی نے کتنے ارمانوں سے کی تھی کیا ہوا بیوی لے آتے ہی تیرا میرا شروع کر دیا اور ڈیڑی کی پراپرٹی میں سے حصہ مانگ لیا ڈیڑی نے پراپرٹی اس لیے بنائی تھی کہ ہم دونوں بھائی الگ ہو جائیں۔“ وہ بولتے بولتے افسردہ ہو گیا۔

”ضروری ہے تمہاری بیوی بھی ایسی ہو۔“

”ضروری نہیں کہ میری بیوی اچھی ہو۔“ وہ ترکی بہ ترکی گویا ہوا۔

”اشعر! آئی کا بھی تو خیال کرو۔“

”میں ان کا ہی تو خیال کر رہا ہوں کیونکہ اگر بیوی آئی اور اس نے بھی وہی کچھ کیا تو میری ماں برداشت نہیں کر سکے گی۔“

”تم خود میں میں اتنی کو اپنی رکھنا کہ بیوی کو اپنے کہنے پر چلا نا۔“
 ”نرس کرو اپنے کہنے پر چلا یا تو سوائے لڑائی بھڑکے کے کچھ نہیں ہوگا اور پھر امی کہیں گی وہ جو کچھ ہے اس کی بات مانو ورنہ میں ایسا کچھ نہیں کر سکتا۔“ اشعر کی نگاہوں میں ہر وقت رمتار ہتی تھی وہ چاہ کے بھی جتنا نہیں کر رہا تھا۔

”اگر میں تمہاری بہت اچھی لڑکی سے شادی کروا دوں۔“ دیشم کے دماغ میں جو ہم تھی۔ کیونکہ اس کو جو ہم اشعر کے لیے مناسب لگ رہی تھی۔

”ایک اچھی لڑکی تو میرے ذہن میں بھی ہے۔“ وہ بھی جھٹ بولا۔
 ”پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔“

”نہیں دیشم میں بہت ڈر گیا ہوں۔“
 ”اشعر یہ تو تم خود پر ظلم کر رہے ہو اگر کوئی لڑکی ہے تو گھر بساؤ۔“

”نہیں یار یہ ممکن نہیں۔“ وہ بچوں میں چاہے لگائے لگا۔
 اشعر شاید اس لیے بھی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا کہ رمتا سے اس کی شادی ممکن نہیں اور وہ رمتا کے علاوہ کسی اور لڑکی کو اپنی زندگی اور دل میں جگہ نہیں دینا چاہتا تھا۔
 دیشم نے پھر اس پر کوئی بھی بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

☆.....☆

وہ آیا بیٹھا تھا اور حشی کی مٹلی ہو رہی تھی ابھی وہ نہادھو کے لیلی تھی۔ خیر بھی بہت آ رہی تھی مگر نرسین کے بلاوے پر اسے اٹھنا پڑا۔

”بھابھی کو بھی یقین نہیں ہے۔“ رنعت کو جتنے دن حشی کی شادی کے قریب آ رہے تھے اشعر کی ہورہی تھی۔

”مما مجھے تو جانا پڑے گا۔“ گیلے بالوں کو جوڑے کی طرح لیٹ کر لائٹ پر چل دھاگوں کی کڑھائی کا تحریریں سوٹ میں اس کا سرخ و سپید چہرہ دمک رہا تھا۔

”پھر بھی تمہیں تھوڑا آرام تو کرنے دیں۔“

”اب کیا آرام زعمی میں بھی مل چل چانے والا آ گیا ہے تو۔“ اس کا اشارہ شہریار کی طرف تھا۔ جلدی جلدی دوپٹے شانوں پر سیٹ کے اوڑھالے سے دوپٹا اوڑھنے سے نا جانے کیوں اتنی الجھن ہوتی تھی۔

”بیوی جلدی آئیں۔“ نرسین کی تنہیدی آواز پر وہ خفیف سی ہوئی۔

”میں نہارہی تھی۔“ اس نے عذر پیش کیا۔

شہریار نے اسے بخور دیکھا دونوں کی نگاہوں کا تصادم ہوا۔

آج تو حسین بیگم بھی آئی ہوئی تھیں حشی نے گڑبڑا کے انہیں جھٹ سلام کیا۔

”علیکم السلام۔“

”خاصی دلی ہوئی ہو کیا کھانے کو نہیں دیا تم نے اسے۔“ سلام کے جواب کے بعد دوسری بات یہ کر دی۔
 ”اماں! اتنی بھی دلی نہیں ہوئی۔“ شہریار تو اس کی بے عزتی کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

دیتا تھا۔

”گلا ہے آپ کی نظر کمزور ہو گئی ہے جو دھندلا نظر آتا ہے۔“
 ”آئے ہائے نرسین کیسے بھاڑ کی طرح بولی ہے یہ لڑکی۔“ حسین بیگم کو اس کی بات ناگوار گزری تو پھر تنہیدی نگاہ بھی ڈالی۔

”حشی کو ذرا شرم لگاؤ نہیں۔“

”پھر پھو اس میں اس کی غلطی نہیں ہے۔“ شہریار نے بھی مداخلت کی۔

”ہاں میری تربیت ہی ایسی ہوئی ہے۔“ وہ دانت پیسنے لگی۔

نرسین کو تو غصہ آنے لگا وہ ان کے سامنے بول رہی تھی۔

”جاؤ اندر کچھ بنائے لے آؤ۔“ وہ نرسین کے حکم پر جلتی جلتی کچن میں چلی گئی تھی۔

شہریار نے اسے کتنے ماہ بعد دیکھا تھا وہ خاصی اسارٹ زیادہ خوبصورت اور دلکش ہو گئی تھی۔

”نہیں کیوں آگئے ہیں میرا سکون غارت کیا ہوا ہے۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے لوازمات کی ٹرے تیار کر رہی تھی۔

”زور سے بولا کرو۔“ وہ یہ نہیں کیسے یہاں آ گیا تھا حشی تو گڑبڑا گئی۔

”آپ؟“ اسے شہریار کو دیکھ کر گھبراہٹ ہوئی۔

”کتنے دن میں خود کو کم کیا ہے۔“

”مجھے خود کو کم کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ نے میرا ہیمنہ دو بھر کیا ہوا ہے ظاہر ہے کم تو ہو جاؤں گی۔“
 وہ خود کو مصروف ظاہر کر رہی تھی۔

بلک پنٹ بلیو شرٹ میں وہ ڈیپٹ لگ رہا تھا۔

”کچھ کھانے بنانے بھی کھائے یا نہیں۔“

”نہیں کھائے۔“ وہ جھٹ تنگ کے بولی۔ شہریار کے لب مسکرانے لگے وہ اس کا فیسے میں مل کھانا سب بکھر رہا تھا کیسے وہ اس سے ہر دفعہ شادی سے انکار کرتی تھی اور اب کیسے وہ اس کی بنادی گئی تھی شہریار کچھ تو حساب بے باق کرنا چاہتا تھا۔

”چلو چند دن بے سیکھ لو۔“

”ایسا کریں کسی کھانا بنانے والے کی بیٹی سے شادی کر لیں میں نے اجازت دی۔“

”واقعی تم تو کیا اس بہت بے وقوف ہوئی ہو جو منہ میں آتا ہے وہ بول دیتی ہو۔“ اس نے چہیں اٹھا کے کھانے شروع کر دیے۔

”مجھ سے اتنی سہمی کیوں نہیں کیا کریں جس کام سے آتیں ہیں وہ کام کریں اور جائیں۔“ وہ ڈرے لے کر بچن سے لٹنے لگی۔

”مجھ سے اس بیٹوں میں بات کرنے کی کبھی غلطی نہیں کرنا تمہارا شوہر ہوں کوئی امیر غیر نہیں ہوں میں نہیں اماں کام سے آئی ہیں میں تو انہیں چھوڑنے آیا تھا۔“ وہ بھی بچن سے لٹلا۔

اماں! میں جا رہا ہوں واپسی میں لیتا چلوں گا۔“ وہ نہ کانٹیں یہ جاوہ جا ہو گیا تھا۔ نرسین اسے روکتی ہی رہ گئیں حشی اس کے فیسے سے اچھی طرح واقف ہو گئی تھی وہ بدلہ ضرور نکالے گا۔

☆.....☆

اس دفعہ نوین کو کچھ زیادہ ہی بری لگی تھی بات وہ ان سب کو جلد ہی ہی زبردستی لے کے آگئی تھی نوین کے تو دل و دماغ میں حسد، بخل اور بدلتے سوار تھا وہ کسی طرح بھی حباب کا گھر خراب کرنا چاہتی تھی۔ ارادے وراشدہ کے بھی نہیں تھے اس لیے وہی نوین کو چڑھاتی رہتی تھی۔

آدم کی بے عزتی وہ بھولی نہیں تھی وہ تو اپنا حق بھی نہیں سمجھتی تھی کہ وہ محبت کر سکے اسے محبت ہوئی بھی تو آدم سے تھی جو اگر اسے پتہ چل جائے تو اس جان سے ہی مار دے ہر دفعہ آدم کے دیدار کی وجہ سے ہی مٹی جالی تھی۔

”ای! آپ ماموں کو پولیس وہ اپنے گھر ملے جائیں۔“ نوین راشدہ کے ساتھ بڑی بخوار ہی تھی اسے ہی بچن کے کاموں سے دلچسپی تھی وہی اکثر کھانا بھی بنا لیتی تھی۔ نوین کو سوائے میک اپ اور فیشن کے کچھ خیال نہیں رہتا تھا۔

”یہ تمہارے دماغ میں بیٹھے بیٹھے کیسے آگیا۔“ انہوں نے حیرانگی سے ہی پوچھا۔

”اس لیے کہہ رہی ہوں ان کا گھر بار موجود ہے انہیں اپنی بیوی اور بیٹیوں کے ساتھ رہنا چاہیے۔“ نوین آج پہلی دفعہ بھجھداری سے بولی تھی۔ مگر راشدہ کو تو جیسے رضوانہ سے بدلے کی ہی پڑی رہتی تھی اس لیے جان کر بھائی کو رکھے ہوئے تھی۔

”زیادہ اماں بننے کی ضرورت نہیں ہے۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کے بدستور پالک کو کاٹنا شروع کر دیا۔

”میں جو ٹھیک ہے وہ کہہ رہی ہوں۔“

”بھابھی نے بھی بھیا کا خیال نہیں رکھا۔“ وہ ایسے افسردگی اور دکھ سے گویا ہوئی جیسے یہ سچ ہی ہو۔

”ای! ماموں نے بھی ماما کا خیال نہیں رکھا اگر وہ خیال رکھتے تو یوں اپنی ذمے داریوں سے بچ کے یہاں نہیں رہتے۔“

”بہت بڑوں والی زبان آگئی ہے بہت خیال آ رہا ہے تجھے اپنی ماما کا۔“ وہ تو حسے سے ٹپک رہی تھیں۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں اور جو سچ ہے وہ آپ بھی جانتی ہیں۔“ اس نے جو بڑی لگی سڑی تھی اسے شہر میں بھرنا شروع کر دیا۔

”جو سچ ہے وہ نہیں بھی نہیں پتہ اور ہاں خبردار بھیا کے سامنے کچھ بکنے کی ضرورت نہیں۔“ شقیق احمد کے سامنے کچھ بکنے کی نوبت ہی نہیں آئی انہوں نے سن لیا اور ان کے قدم اپنے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔

”پتہ نہیں کیسی بیٹی ہے ماں کا ساتھ دینا چاہیے تو ان کا ساتھ دے رہی ہے میری نوین کا حق مار کے بھابھی نے کیسے پرانے خاندان کی بوسہ خیران کے لیے لے آئیں اپنی بہن کا تجھے ذرا خیال نہیں۔“ وہ تیز لہجے میں آگئیں۔

”جو خود ضمیر ان بھائی کے پیچھے لگی ہیں انہوں نے بھی جبکی حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ الا ان کی سسرال میں جو تماشا جو کیا تھا اس کے بعد تو وہ کسی کی بھی پسندیدہ نہیں رہیں ہوں گی۔“

”بک بک بند کرو اور جاؤ یہاں سے۔“ انہوں نے لا جواب ہو کے اسے ڈانٹ ہی دیا۔

”ای! آپ اور جو یہ ٹھیک نہیں کر رہی ہیں۔“ جو تو اٹنے سیدھے اڑن ڈرامے دیکھ دیکھ کے ان جیسی جتنی جاری ہیں ولن جیسی۔“ نوین نے تہیہ کر لیا تھا اپنی ماں اور بہن کو سچ راستے پر لا کر چھوڑے گی اور ماموں کو اپنی غلطی کا احساس کرا کے چھوڑے گی وہ ماما اور ان کے بیٹوں کی نظروں میں اچھی نہیں تو بری

بھی نہیں جڑنا چاہتی تھی۔

”زری اور کرن نوین کدھر گئیں۔“ انہوں نے آوازیں دینی شروع کر دیں۔

”جو سو رہی تھیں اور کرن رسالہ پڑھ رہی تھی۔“ اس نے خود تفصیل دی۔

”لائے میں بڑی چڑھا دوں گی۔“ وہ ساری چیزیں اٹھا کے بچن میں لے جانے لگی۔

راشدہ کا موڈ خراب تو ہو ہی گیا تھا۔ وہ وہیں کارپٹ پر لیٹ کر رکھ کر لیٹ گئیں۔

نوین کو بھی کبھی ان سب کی بڑی فکر ہوتی تھی جو انہیں بند کیے ہوئے تھیں۔

”کاش ای ای اور جو کو قتل آجائے وہ کسی کا گھر خراب کر کے بہت برا کریں گی کچھ تو ایسا کرنا ہو گا کہ اس کی امی اور بہن اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوں۔“

ادھر شقیق احمد ایک لمحے کے لیے گہری سوچ میں غرق ہو گئے تھے وہ تو ابھی تک بھی آنکھیں بند کیے پڑے تھے کتنے عرصے سے وہ اپنی بہن کے گھر پڑے تھے۔

کتنی ہی دفعہ ضمیر ان نے ان سے کہا تھا کہ وہ گھر آ کر رہیں مگر ان کی انا ایسا کرنے سے روکے ہوئے تھی۔ ان کی سوچ یہی تھی کہ رضوانہ ان کا مذاق اڑائے گی کیونکہ ہر سرد گرم میں وہ اپنی ذمے داریوں سے دور رہ کر بیوی اور بچوں سے دور ہی رہے تھے پھر رضوانہ کے میکے والوں میں صرف اس کے بھائی ہی تھے جنہوں نے ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔

☆ ☆

وہ لیٹ ٹاپ بند کر کے کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ اسنے اپنا تیر ذکے انٹرویو کر رہا تھا ابھی تک بھی اسے کوئی ٹھیک نہیں لگی تھی۔

دودھ کا کنگ سا رنگ اس نے دھم کی رائٹ سائیز ٹیبل پر رکھا۔

”کب رکھا ہے پی لے گا۔“ وہ بھی لیٹنے کا قصد کرنے لگی۔ دھم نے اس کو دیکھا جو ابھی تک اس سے لا تعلق تھی۔ مگر کچھ کام اس کے کرنے لگی تھی دھم نے اس کے لیے ماسی بھی رکھ دی تھی تاکہ اس کا ہاتھ بٹا سکے۔

”خوشنا بہت ڈسٹرب ہوں کام آفس کا اتنا ہے اور کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو تمہاری طرح کام سمجھ کے کر سکے۔“ وہ کروٹ لے کے لیٹ گئی۔

”ارے میں بات کر رہا ہوں تم کروٹ لے کر لیٹ گئیں۔“ دھم اس کے قریب آ گیا۔

وہ تو گہرائی دو ماہ کے عرصے میں دھم کی یہ خود ساختہ حرکت تھی۔

”بیچھے ہوئے۔“ دونوں کا چہرہ اتنا قریب تھا کہ خوشنا کو ذرا بھی لگا اگر دھم نے زبردستی کر لی تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ ”اگر نہیں ہوں تو۔“ اس نے خوشنا کی گہری فوس خیر آنکھوں میں دیکھا اور پھر ہاتھ ریختے ریختے خوشنا کی پشت کے نیچے چلے گئے اور وہ اس کے اور قریب آ گئی۔

”پلیز مجھے یہ بے تکلفی پسند نہیں ہے۔“ اس نے منہ ہی پھیر لیا۔

”میاں ویوی میں کتنی ہی لا تعلق ہو یہ بے تکلفی پھر بھی ہو جاتی ہے۔“ وہ مسکرایا۔

خوشنا کو اس کی آنکھوں میں جذبات کا سمندر تھا مگر اس نے مارنا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”آپ نے ایسا کچھ نہیں رکھا کہ ہماری بے تکلفی ہو۔“ وہ خود کو چڑھانے لگی۔

القریش پبلی کیشنز کے نئے ناول شائع ہو گئے ہیں

اب کر میری رفوگری

مصنفہ سائرہ رضا

قیمت

600/- روپے

رگ جاں جو قریب تھے

مصنفہ صالحہ محمود

قیمت

600/- روپے

دل کی دہلیز پر

مصنفہ اشتیاق فاطمہ

قیمت

600/- روپے

میرے ہمنوا کو خبر کرو

مصنفہ فاخرہ گل

قیمت

600/- روپے

زندگی کی حسین راہ گزر

مصنفہ سمیرا شریف طور

قیمت

400/- روپے

وہ اک لمحہ محبت

مصنفہ سمیرا شریف طور

قیمت

400/- روپے

درِ دل

مصنفہ نبیلہ عزیز

قیمت

900/- روپے

زرد پتوں کا شجر

مصنفہ نایاب جیلانی

قیمت

400/- روپے

سرکلر روڈ، چوک اردو بازار لاہور

37652546 - 042-37668958 فون

القریش پبلی کیشنز

”خوشنما! تم مجھے اتنا بے عزت کرتی ہو میں برداشت نہیں کرتا ہوں۔“

”آپ کے گھر والے بھی تو میری بے عزتی کر کے حساب برابر کر دیتے ہیں۔“ اسے نزہت مای کا رویہ کب برداشت ہوتا تھا وہ ہمیشہ حقارت لیے ہوئے نظر آتی تھیں۔

”تم سے کوئی کچھ کہتا ہے مجھے پتہ ہے نزہت مای ہی تم سے ہیر رکھتی ہیں۔“ دشمن سمجھتا تھا۔

”تم فکر نہیں کرو ہم اپنے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جائیں گے۔“ دشمن تو بلند تھا یہاں سے جانے کے لیے۔ مگر نفسی علی اسے جانے نہیں دے رہے تھے۔

”کسی کے ایسے رویے سے کیا ہم یہاں رہنا چھوڑ دیں گے۔“ خوشنما نے کہا۔

”تم خود ہی تو کہہ رہی ہو۔“ دشمن سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔

”میں یہاں سے جانے کو نہیں کہہ رہی۔“ وہ دشمن کو باتوں میں لگانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

”تم خود ہی تو کہہ رہی ہو کہ میرے گھر والے تمہاری بے عزتی کرتے ہیں۔“

”میں تو آپ کو بتا رہی تھی۔“ وہ بھی بیٹھ گئی۔

”دیکھو خوشنما! بڑی مای حزان کی ایسی ہی ہیں درندہ مشہ سے بہت پیار کرتی تھیں۔“ اسے مای کی محبتوں بھرا انداز نہیں بھولا تھا۔ مگر وہ بھی سمجھتا تھا کہ وہ اس سچا پیار کر رہی ہیں مگر وہ تو اپنی بیٹی کے لیے دیکھتی تھیں۔

”بیار تو اس وقت ختم ہو گیا جب آپ نے ان کے ارماتوں کا خون کر دیا۔“ خوشنما تو صاف گوتھی اسے بناوٹ اور بناوٹی لوگ بہت بڑے لگتے تھے۔

”میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا۔“ وہ خود بہت الجھا ہوا اور بکھرا ہوا ہو گیا تھا۔

”خوشنما! پلیز مجھے کچھ دیر کے لیے اپنی قربت دے دو میں بہت ڈسٹرب ہوں۔“

”جی۔“ وہ تو اچھل گئی۔

”میرا مطلب ہے مجھ سے میری دلجوئی کرو۔“

”مسٹر دشمن میں ایسا بالکل نہیں کروں گی آپ نے میرے ساتھ اور میرے ماں باپ کے ساتھ بہت برا کر کے میں ایسا کچھ نہیں کروں گی۔“ وہ ایک دم سخت دل ہو گئی۔ دشمن نے دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ دیکھا۔

”تم میری محبت کو ابھی بھی نہیں سمجھ سکی ہو۔“

”آپ کبھی محبت کر ہی نہیں سکتے۔“ وہ جھٹکے سے بیڑ سے اٹھی۔

”خوشنما! اتنی بھی بے حس نہیں ہو۔“ وہ اندر دگی سے گویا ہوا۔

”میں بے حس ہی تھی۔“ وہ منہ پھیر کے کھڑی ہو گئی۔

”ٹھیک ہے تم جتنی نفرت کر سکتی ہو کر دگر میں تم سے کبھی نفرت نہیں کروں گا۔“

”ایک دن آکا جائیں گے آپ اور چھوڑ دیں گے مجھے۔“ وہ یہ کہہ کر کمرے سے ہی نکل گئی۔

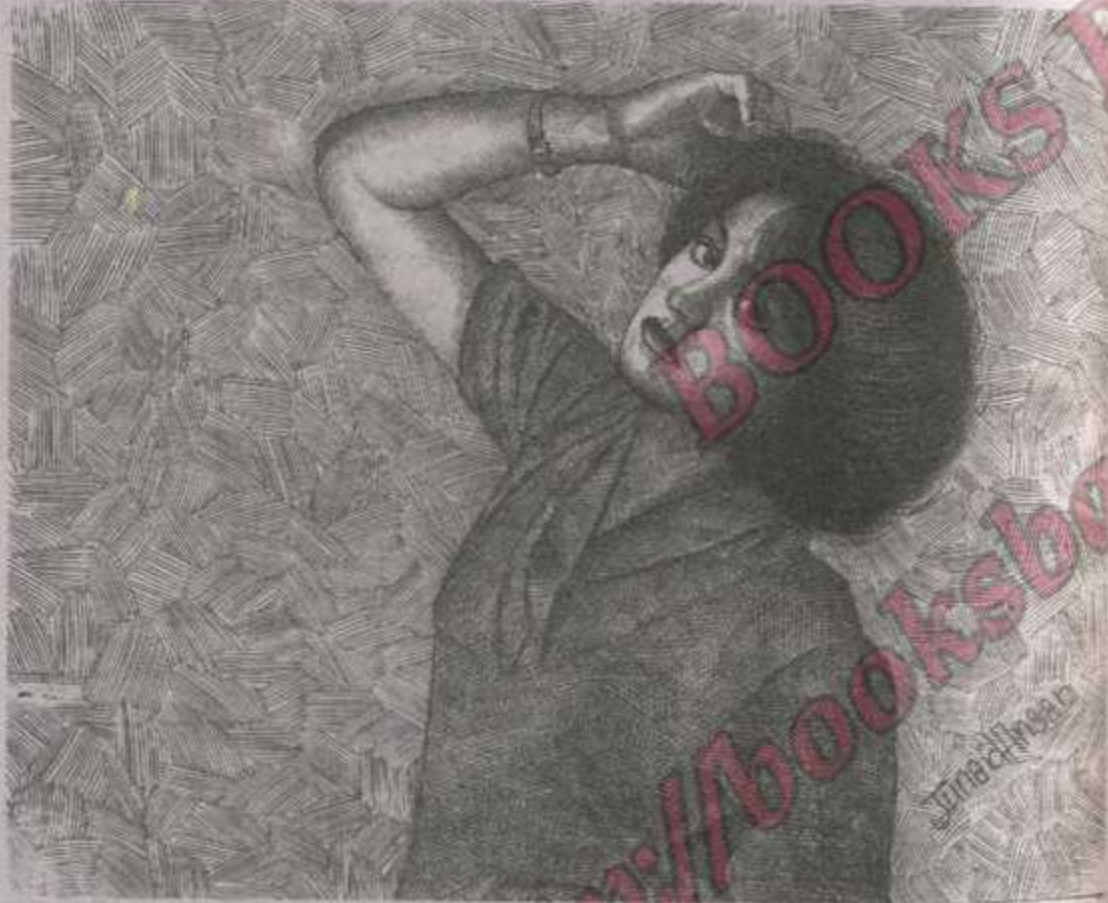
دشمن تو دونوں طرف سے مار کھا تا رہا تھا کس سے اپنے دل کا حال کہے مگر بھی تو اب اپنی لگنے لگا تھا۔

(جاری ہے)

سبز رقص کا سر



کل زہرہ خاتون کا سوئم بھی ہو چکا تھا۔ سب لوگ رخصت ہو گئے تھے صرف وہی تھا جواب تک اپنی امی کے ساتھ وہاں رکا ہوا تھا۔ مہناز کل سے نور کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے راضی کر رہی تھیں مگر ان کی ہر بات کے جواب میں اس نے صرف خاموشی اختیار کی ہوئی تھی۔ جلد خاموشی..... مہناز اب بھی اس کے کمرے میں اسے سمجھانے گئی تھیں اور وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھان کا انتظار کر رہا تھا۔ یکا یک اس کے کمرے سے چلانے کی آوازیں آئی شروع ہو گئی تھیں۔ گہری سانس لیتے ہوئے اس نے سردنوں ہاتھوں میں گرا لیا۔ تین دن کا سکتہ اب ٹوٹا تھا مگر لاوا تو اس کے اندر کئی برسوں سے ابل رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دانستہ یا دانستہ ان لوگوں کی ذات اسے ہرٹ کرنے کا باعث بنی تھی۔ اس کی باتیں بری لگنے کے باوجود وہ پر امنانے کا حق نہیں رکھتا تھا کیوں کہ جانتا تھا کہ وہ بالکل حق بجانب ہے۔



نے سب سے پہلی خبر زہرہ کو دی تھی اور وہ صرف دو دن بعد ہی فیصل آباد پہنچ گئی تھی اپنے والد کے ساتھ مہناز کے بیٹے کو دیکھنے۔ وجدان کو اس کی گود میں دیتے ہوئے مہناز نے کہا تھا۔ تیرا دادا تو آگیا میں اپنی بہو کی خنجر ہوں۔ جب تک اس کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ احمد سے شادی کے دو سال بعد نور پیدا ہوئی تو وہ منظر کے ساتھ اسے دیکھنے آئیں۔ نور و وجدان سے چھ سال چھوٹی تھی۔ عثمان سے تین سال اور ارشد تو مہناز کی گود میں ہی تھی اس کا نام بھی مہناز نے رکھا تھا اور بڑے حوصلے سے اسے احمد سے مانگ لیا تھا۔ اس وقت تو وہ مسکرا دیے تھے مگر اس کے بعد وہ جب بھی بچوں کی چشموں میں کراچی آتیں دو تین دن زہرہ اور احمد کے گھر ضرور رکتی اور انہیں باور کرانا نہ دیتی تھیں کہ نور اس کی بہو بنے گی۔

زندگی کی ہر سکون پہل میں حضور منظر حسین کی موت نے پیدا کیا تھا۔ زمین کے ایک جھڑے نے ان کی جان لے لی تھی۔ تم اگرچہ بہت بڑا تھا مگر انہیں بچوں کی خاطر ٹھکانا پڑا۔ سر کے مشورے سے وہ ساری زمینیں بیچ باقی کے اسلام آباد شفٹ ہو گئیں کہ بہر حال بچوں کو وہ خطرے میں نہیں ڈال سکتی تھیں۔ وہ بے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ سر پر سر کا سایہ تھا۔ سودہ بچوں کی تعلیم اور تربیت میں مگن ہو گئی۔ قافرخہ اور کریم کی پوری کوشش تھی کہ وہ اسلام آباد کے بجائے کراچی شفٹ ہو جائیں مگر وہ اپنے بچوں کو وہاں کی زندگی گزارتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے جیسی قافرخہ کے زیر دست خود ان کی گزری تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح ہر سال کراچی نہیں آتی تھیں۔ بہت کم کسی خاص موقع پر دو چار دن کے لیے آ جاتی وہ بھی ایسی کہ اب باپ کا کردار بھی انہیں ہی ادا کرنا تھا۔ بچوں کو لانے سے بڑھ چالی ستارہ ہوتی اور وہ کہیں بھی کوئی کمر نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔ نور زہرہ کی اکلوتی اولاد تھی۔ بے حد ذہین تھی۔ تعلیمی مدارج بہت کامیابی سے طے کر رہی جاری تھی۔ ہر سال اس کی کامیابی پر مہناز تھکے بیٹھتی تھیں۔ احمد اکثر مسکراتے ہوئے زہرہ کو چھیڑتے تھے جیسی میں تو مذاق سمجھا تھا مگر تمہاری سبکی تو گلے پڑ گئی ہے۔ ہماری بیٹی لے کر ہی جان چھوڑے گی۔ بیٹے بیٹے مگر اپنے کو جانے کس کی فکر لگی تھی احمد کو آفس میں ہلکا سا ٹھیک ہوا تھا اور ہاتھ لے جانے کی بھی نوبت نہیں آتی تھی۔ ان دنوں نور محض انگریزی اسٹوڈنٹ تھی۔ اسے تو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اس کے بابا اسے چھوڑ گئے ہیں۔ اکثر راتوں کو سوچتے ہوئے اٹھ بیٹھتی۔ زہرہ کو ہانک لیں ہی جب لگتی تھی۔ ایسے میں مہناز نے ہی ان کا ساتھ دیا تھا۔ وہ اور وجدان ایک میز پر رہتے تھے اور جاتے ہوئے بھی وہ زہرہ کو نور کی طرف سے بے فکر رہنے کا کہہ دیتی تھیں۔ احمد ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم تھے۔ فرم کی طرف سے انہیں کچھ فنڈز ملے تھے اور احمد کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے نور کو بھی ایک معمولی جاب کی آفر ہوئی تھی۔ جسے اس نے حالات کو دیکھتے ہوئے فوراً قبول کر لیا تھا کہ چند ہزار روپے کب تک ساتھ دے سکتے تھے۔

☆.....☆

”میں گھر جا رہا ہوں حلیہ چھٹا نہیں کر سکا۔“ اس نے میز سے کی رنگ اٹھائی۔
 ”ٹھیک ہے میں تو یہیں روکوں گی۔ ظاہر ہی بات ہے اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ تم صبح ڈرائیور کے ہاتھ میرا ضروری سامان بیچ دینا میں شام کو نوں کروں گی۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے باہر نکل گیا اور وہ غصے سے لپک لگائے نور کے بارے میں سوچنے لگیں۔ انہوں نے زہرہ کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ اپنی اس سبکی کے ساتھ جوان کی غم کسارتھی لیکن غم نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اسے دیکھ دینے کا باعث بنی تھیں۔
 ارتج کی چٹکی انہوں نے منظر حسین کے دوست کے بیٹے کے ساتھ کافی کم عمری میں ہی کر دی تھی۔ عثمان کو

ڈاؤ میڈیکل میں داخلہ لیا گیا تھا۔ وجدان کی تعلیم مکمل ہو گئی تھی وہ بھی کراچی میں پرنس کرنا چاہتا تھا سودہ ایک بار پھر اپنا گھر سیٹ کر کراچی شفٹ ہو گئیں۔ وقت بدل گیا تھا۔ بچے سب کے بڑے ہو گئے تھے۔ قافرخہ بیگم اور ان کے بچوں کا رویہ اب ان کے ساتھ لمانت آ کر نہیں تھا۔ وہ سب انہیں بہت عزت دیتے تھے۔ وجدان پرنس سیٹ کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ خور و سادہ وجدان سب کی نگاہوں میں سا گیا تھا۔ وہ سب مہناز کی تعریف کرتے نہ جھکتے تھے کہ اس نے اکیلا اپنے بچوں کی اچھی پرورش کی ہے۔

باصرف نے رانیہ کی ضد سے تنگ آ کر قافرخہ کو مہناز سے بات کرنے کے لیے کہا تھا۔ ”ہاں ہاں کیوں نہیں رانیہ میں کس چیز کی کمی ہے جو مہناز انکار کرے گی۔“ انہوں نے فراخ دلی سے جواب دیا تھا۔
 قافرخہ کی بات پر مہناز چند لمبے کچھ بول ہی نہیں سکی تھیں۔ ”میں وجدان کی بات طے کر چکی ہوں، زہرہ کی بیٹی نور سے۔“ کافی دیر بعد انہوں نے سر اٹھایا تھا۔
 ”کب..... بتایا کیوں نہیں؟“ کئی آوازیں ابھری تھیں۔

”بہت پہلے ان کے بچپن۔“

”اوہ تو بچپن کی بات تھی ناں۔ ان کے بڑے ہونے کے ساتھ ہی ختم ہو گئی زہرہ کو تو اب یاد بھی نہ ہو گی۔“ قافرخہ نے بات کسی میں اڑائی تھی۔

”نہیں اماں! میں زہرہ کو کئی بار یاد دہانی کرا چکی ہوں۔“ انہوں نے تیزی سے جواب دیا تھا۔
 ”افوہ! آپا چھوڑیں بھی آپ بھی کیا بچپن کی بات کو لے کر بیٹھ گئیں۔ بھلا نور اور رانیہ کا کیا مقابلہ ایک غریب، جیم اور دوسری کروڑ پتی باپ کی اکلوتی بیٹی، کروڑوں کے پرنس کی اکیلی وارث۔“ محض بھائی اتنے بڑے بلڈر ہیں رانیہ کے نام سے ہی کتنے پروجیکٹ زیر تعمیر ہیں۔ وجدان کے پرنس کو بھی سہارا مل جائے گا۔ یہ ان کی بہن فرحت تھی جو بچپن میں پہلے تنگ تو اپنے بیٹے کے لیے رانیہ اور اس کے گھر والوں کے آگے پیچھے بھڑی تھی مگر اب اس کے رنگ و منہ دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگا چکی تھی۔
 ہر جگہ سے آوازیں پڑ رہی تھیں کوئی انہیں رانیہ کی تعریفیں گنوارا ہاتھ تو کوئی رانیہ کو بھینا لینے کے بعد کے فوائد گنوارا ہاتھ۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہو گئیں۔

مج تک فیصلہ بھی ہو چکا تھا۔ رانیہ جیت تھی اس لیے نہیں کہ وہ دولت مند تھی بلکہ اس لیے کہ اس کے حق میں ان کا پورا گھر اٹھتا تھا۔ وہ لوگ جنہوں نے سبھی ان کی عزت و توقیر نہیں کی تھی۔ اب وہ انہیں سر آنکھوں پر بٹھا رہے تھے اور وہ خوف زدہ ہو گئی تھیں کہ کہیں ان کے انکار سے ان کا پرانا رویہ عود نہ آئے۔
 بچپن کا احساس کتری اب بھی ان کے اندر نہ بے گاڑے بیٹھا تھا۔ اسے نہ منظر حسین کی محبت ختم کر پائی تھی نہ کامیاب بچوں کی مال ہونے کا فخر رانیہ کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے انہیں یہ بھی بھول گیا تھا کہ ان لوگوں کی باتیں سننے کے بعد رونے کے لیے انہیں جھکا نہ حایمیر آتا تھا وہ زہرہ کا ہوتا تھا وہ زہرہ جو ان سے کئی برس چھوٹی ہونے کے بعد بھی انہیں کسی بڑی بہن کی طرح سنبھالتی تھی۔ انہوں نے وجدان سے پوچھا تھا اور اس نے ان کی خوشی کی خاطر فوراً حامی بھری تھی حالانکہ ہاں کرتے وقت دل میں کھٹک اٹھتی تھی۔ کچھ سال پہلے دیکھا آنسوؤں سے بیجا چہرہ اور کسی کی بے حد مہربانی کے بعد مہربان آنکھوں کے سامنے آتی تھیں مگر اس نے نگاہیں چرا لیں۔ وہ اس کی مال تھیں وہ ان سے محبت پیارا اور احترام کرتا تھا انہوں نے ان لوگوں کی خاطر اپنی جوالی تیاگ دی۔

اور یوں وہ زہرہ کے گھر و جدان کی منگنی کا کارڈ دینے چلی آئیں۔ زہرہ نے منہ سے کچھ نہیں کہا تھا مگر جن نظروں سے دیکھا تھا وہ شرمندگی سے زمین میں گڑ گئی تھیں۔

☆—☆

آفس سے وہ سیدھا نور کے گھر ہی چلا آیا تھا۔ ہاتھ میں بکڑے شاپرڈ اس نے بچن میں رکھے تھے۔ مہناز کھانا تیار کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر کہنے لگیں۔

”پڑوسی کب تک مہمان نوازی کرتے رہیں گے میں نے سوچا آج خود کھانا تیار کر لوں۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتا پانی کی بوتل اٹھا کر باہر نکل گیا۔

لاؤنج میں بی بی اسے وہ نظر آئی تھی۔ گزشتہ دنوں کی نسبت وہ اسے بہتر لگ رہی تھی۔ ہلکے آسمانی رنگ کے لباس میں بی بی وہ شاپرڈ پہائی تھی۔ پشت پر بال بھرے ہوئے تھے۔ اسے سلام کرتا وہ اس کے سامنے سونے پر بیٹھا تھا۔ اس نے توجہ نہیں دی تھی۔ وہ یونہی نظریں جھکائے اپنی اٹھیلیوں کو گھور رہی تھی۔ وہ کمبوت کمبوت پانی پیتا گھری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

”اب کیسی ہیں آپ؟“ اس نے گلاس بھلی پر رکھا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکے لہو لہوے لیٹا حزان اور مٹی اسے صاف نظر آئی تھی۔ اس کا مٹی چاہا اسے شانوں سے قہقہہ کر گئے۔ ”بی بی لڑکی اپنے سارے غم مجھے دے دو۔ تمہاری آنکھوں میں مٹی اور ہونٹوں پر چپ کی مہر ڈرا اچھی نہیں لگتی تمہارے ہونٹوں پر تو مٹی ہی جتی ہے۔“ اسے اس کی نفرتی مٹی یاد آئی تھی۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب چل دی تھی۔

☆—☆

اپنے رویے جانے پر اس نے ایک آدھ گھنٹے ہی افسوس کیا تھا۔ زیادہ افسوس کرتا وہ انور کی نہیں کر سکتی تھی کہ ایم کام کے امتحان نزدیک تھے اور اسے تعلیم کے ساتھ اپنی جاب کو بھی سچ کرنا تھا۔ کتنا ہی اپنے گھر بکھرائے وہ پڑھنے میں مشغول ہو گئی تھی۔

”اتنی خاموش کیوں ہیں آپ؟ آج تو وجدان بھائی کی منگنی ہے ہمیں چلنا چاہیے۔“ اسے اچانک یاد آیا تھا۔ زہرہ نے کچھ مٹی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”بھئی آخر وہ آپ کی اتنی قریبی بھئی ہیں شریک تو ہونا چاہیے۔“ اس نے بے نیازی سے کندھے اچکا کرے تھے۔

”تمہیں ذرا پروا نہیں میری کیوں مجھے تیز کر رہی ہو۔“ وہ بھٹ پڑیں تھیں۔

”میں کیوں آپ کو تیز کروں گی مجھے آپ کی پروا نہیں ہوگی تو کس کی ہوگی۔ ہم دونوں کا ایک دوسرے کے علاوہ بے کون میں تو یہ چاہتی ہوں آپ بھی پروا نہ کریں کوئی انہونی نہیں ہو گئی ہے ہمارے ساتھ۔ وہ جب بے بات کرتی تھیں جب حالات کچھ اور تھے۔ ٹھیک ہے ہم ان کے ہم پل نہ بنیں مگر ایسے بھی نہیں تھے آپ خود وہ جس میں سیم اور وہ ایک کروڑ پتی باپ کی بیٹی۔ ہر انسان کو اپنے لیے بیڑ بننے کا حق ہے۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ آپ بھی اپنی دوست کی خوشی میں شریک ہوں۔ ایسے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو لوگوں پر اپنا دکھ ظاہر نہ کریں۔“ وہ ضرورت سے زیادہ ہی حقیقت پسند مگر زہرہ کو وہ جانے کے لیے راضی نہ کر سکی تھی۔

مہناز کا زہرہ سے تعلق تقریباً ختم ہی ہو گیا تھا۔ رانیہ کے گھر والے شادی جلد کرنا چاہتے تھے مگر وجدان

پہلے اپنا پانس سین کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے دو سال کا عزم مانگ لیا۔ مہناز زہرہ کے لیے افسردہ تھیں۔ وجدان کے لیے انہوں نے گھر والوں کی بات مان لی تھی مگر عثمان کے لیے انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ نور کو ہی بوجھنا سہی گئی۔

نور کے لیے وہ از حد پریشان تھیں۔ اپنے ملنے ملنے والوں کو انہوں نے نور کے رشتے کے لیے کہہ دیا تھا۔ وہ انہیں کئی بار کہہ چکی تھی کہ وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی کیریز بنانا چاہتی ہے مگر وہ بھی ماں جس جلد از جلد اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھیں۔

ارنج کی شادی کی تاریخ طے کرتے ہی مہناز زہرہ کے پاس آئیں تھیں اور زہرہ ان سے حریف ناراض نہیں رہ سکی تھیں۔ ارنج کی شادی کی تیاریوں میں مہناز کا پورا ساتھ دیا تھا انہوں نے۔

ارنج رخصت ہو گئی تھی مہناز نے زہرہ اور نور کو اصرار کر کے روک لیا تھا۔ نور کو رات میں چائے پینے کی عادت تھی اور کچھ تھکاوٹ بھی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے لیے چائے بنانے بچن میں چلی آئی تھی۔

”ایک کپ میرے لیے بھی بنا دو گی پلیز۔“ آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وجدان کھڑا تھا۔ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے حریف پانی ڈالا تھا۔ وہ بچن میں ہی چلا آیا تھا۔

”سو کیا مصروفیت ہے آج کل؟“ وہ بچن چیمبر پر بیٹھ گیا تھا اور پوری طرح متوجہ تھا۔

”میں ایچ کیو کپلیٹ ہو گئی ہے اور پوری توجہ جاب پر ہے۔“ بھلی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے جواب دیا تھا۔

”اگر تمہیں بھی کوئی پرابلم ہو تو بلا جھجک میرے پاس آ سکتی ہو۔ میرے آفس میں جاب کر سکتی ہو۔“ اس نے آنفری۔

”اوہ..... تو کیا جاب وہیں کے آپ مجھے اپنے آفس میں۔“ چائے کپ میں اٹھیلے ہوئے اس نے پوچھا۔

”کوئی بھی تمہاری قابلیت کے لحاظ سے۔“

”مثلاً۔“ اس نے ابرو اچکا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”رہنمائی، کمپیوٹر آپریٹر وغیرہ۔“ اس کے خیال میں وہ شخص انٹر پرائی اے پاس ہو سکتی تھی۔

وہ بے اختیار ہلکے سلا کر فیس پڑی تھی۔ بیٹے ہوئے اس نے کپ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ اسے کچھ نہیں آیا تھا کہ وہ کیوں تھی اس نے ایسا کیا کہا تھا۔

”نی الحال تو میں اپنی جاب سے بہت خوش ہوں اگر کبھی اتنے برے حالات ہوئے تو ضرور آپ سے رابطہ کروں گی۔“ وہ اچانک اٹھا کر باہر نکل گئی تھی۔

زہرہ کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی اور وہ ان کے لیے از حد پریشان تھی۔ کئی فزیشن بدل چکی تھی۔ زہرہ اس کے رشتے کے لیے پریشان تھیں۔ وہ بے حد قابل پڑھی لکھی تھی۔ اچھی جاب پر بھی اچھی فصل و صورت کی مالک تھی۔ اب اپنی اتنی خوبیاں کی مالک بنی کو وہ کی ایسے ویسے کے بے توجہ بنیں باعہد سکتی تھیں۔ انہیں خود پر بھی فحشہ آتا تھا۔ وہ کیوں مہناز کے آگے پر نہیں تھیں اب تک تو اس کے فرض سے سبکدوش بھی ہو چکی تھیں۔

روز آفس جاتے ہوئے وہ پڑوس کی خاتون کو زہرہ کا خیال رکھنے کا کہہ کر جاتی تھی۔ جاب بھی نہیں چھوڑ

سکتی تھی کہ یہاں تک پہنچنے کے لیے کڑی محنت کی تھی۔ چھوڑ دیتی تو چند منٹوں میں فاقوں پر فوت ہوتی جاتی۔ ڈاکٹر ڈی فیس، میڈیسن، ٹیسٹ وغیرہ کے خرچے وہ کہاں سے پورے کرتی۔ وہ پوری بنیادی سے کمال نام میڈ کو رکھنے کے بارے میں غور کر رہی تھی۔ جو اس کی غیر موجودگی میں اس کی ماں اور گھر کی دیکھ بھال کر سکے مگر آج کل کے حالات کو دیکھتے ہوئے ہنچکا بھی رہی تھی۔

اس دن وہ کافی دیر تک آفس میں بڑی رہی تھی۔ بھئی کی اینول بجٹ رپورٹ بنا کر بھیجی تھی۔ وہ اسی کام میں مصروف تھی۔ بار بار امی کا خیال بھی اسے پریشان کر رہا تھا۔ فون پر تو وہ انہیں اپنے لیٹ آنے کا تانا بھنی تھی۔ آفس کی گاڑی اسے ڈراپ کرتی تھی۔ کئی بار تیل دینے کے بعد اس نے پریشانی کے عالم میں جانی سے گیٹ کھولا تھا۔ بیڈ پر انہیں بے سرح پڑے دیکھ کر وہ چیخ مار کر ان کی طرف بھاگی آئی تھی۔ پانی کے حوض مارنے پر وہ ہوش میں آگئیں تو انہیں چھوڑ کر باہر بھاگی۔ برابر والا گھر اندر سے میں ڈوبا تھا۔ شاید وہ گھر میں نہیں تھے۔ مین روڈ تک جا کر کھتے جتن سے اس نے ٹیکسی ڈھونڈی تھی یہ وہ ہی جاتی تھی۔ اپنے اکیلے ہونے کا احساس اسے شدت سے ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر نے میگزین کا ایک بتایا تھا۔ رات بھر اسپتال میں رہنے کے بعد وہ صبح انہیں لے کر گھر آگئی تھی۔ چند دن میں وہ فیصلہ کر چکی تھی لیکن اس نے گاڑی کی کمی زہرہ کی بے حد مخالفت کے جواب میں اس نے کہا تھا۔

”میں منتقلی انشورنس کر سکتی ہوں۔“

”اور ڈاؤن ٹاؤن؟“ انہوں نے گھور کر دیکھا۔

”اکاؤنٹ میں رقم موجود ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”وہ پیسے تمہاری شادی کے لیے جمع کر رہی ہوں میں۔“ اب وہ انہیں کیا سمجھاتی کہ اس رات بڑک پر تنہا ٹیکسی کے لیے بھاگتی وہ کیسا محسوس کر رہی تھی۔ خوف نے کسی عفریت کی طرح اس کے وجود میں نیچے گاڑ دیے تھے۔ کیسے انہیں کھودینے کے احساس نے اس کے وجود میں کپکپاہٹ بھری تھی۔

☆.....☆

اگلے دن صبح وہ تک سبک سے تیار اپنے کمرے سے برآمد ہوئی تھی۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ مہناز نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ ناشہ کرتے وجدان نے بھی چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”آفس۔“ وہ مختصر جواب دیتے لیکن میں گھس گئی۔

”تھوڑی طبیعت سبیل جائے تو جوان کر لیتا۔“ وہ اس کے پیچھے ہی لیکن میں گئی تھیں۔ وہ جلدی جلدی سلاٹس پر جیم لگا رہی تھی۔ سلاٹس لے کر وہ ان کی کسی بات کا جواب دیئے بغیر کمرے میں گھس گئی۔ پانچ منٹ بعد ہی وہ بیک اور لیپ ٹاپ لیے کمرے سے برآمد ہوئی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے وجدان تمہیں ڈراپ کر دے گا۔“ اسے دیکھتے ہی وہ پھر بولیں۔ ناشہ کرتا وجدان خاموشی سے اپنی ماں کو اس کے آگے پیچھے پھرتے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کا بہت شکریہ میں کسی کی جتن نہیں ہوں۔“ وہ سر دھچکے میں بولتی چلی گئی تھی۔

”یہ لڑکی مجھے پاگل کر دے گی۔“ وہ کمری پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

ہولا۔

”اسے آپ لگ بھی سمجھ سکتے ہیں۔“ وہ سلاٹس میں مایوسہ نگر کر رہی تھی۔

تھا۔

☆.....☆

وجدان کی شادی میں بھی وہ پیش پیش رہی تھیں مگر اداسی کی دھند میں اپنی چار بیوی تھیں۔ وجدان کو دلہا بنے دیکھ کر ان کے دل میں ہوا گئی تھی۔ جانے نور کے نصیب کا تارہ کب جگمگائے گا۔ انہوں نے مایوسی سے سوچا تھا۔

رانیہ کے والد نے انہیں مارشس کے کلکٹ گفٹ کیے تھے اور وہ ایک ماہ کے کافی مومن ہیکٹج پر روانہ ہو گئے تھے۔

زہرہ کی طبیعت پھر خراب ہونے لگی تھی اور وہ انہیں سمجھا سمجھا کے تھک گئی تھی کہ شادی کوئی زندگی کا حاصل نہیں ہے یا اس کی کوئی عمر نہیں نکلی جا رہی ہے۔

”مگر میرے ہاتھ سے تو زندگی ریت کی مانند پھسل رہی ہے۔“ انہوں نے آرزو کی سے کہا۔

”خدا نہ کرے امی۔“ وہ دل کران کے قریب آئی تھی۔

وہ آفس میں تھی جب ان کا فون آیا۔ ”مہناز کی کال آئی تھی وہ آج آ رہی ہے وجدان اور رانیہ کے ساتھ تم زرا آفس سے جلدی اٹھ جانا۔“ ان کی آواز خوشی سے ٹھنک رہی تھی۔

”ٹھیک ہے میں جلدی آ جاؤں گی مگر آپ نکالنے کے پکڑ میں خود کو پٹکان مت کیجیے گا۔ میں بازار سے لٹی آؤں گی۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

گھر جاتے ہی وہ لیجن میں گھس گئی تھی۔ ٹرائیکل پر پائین اٹیل سپاری تھی جب وہ لوگ آگئے تھے۔ ہاتھ خشک کر لی وہ لیجن سے نکل آئی۔ مہناز خاتون نے محبت سے گلے لگالیا تھا۔ رانیہ کا رویا سے سرد مہسوس ہوا تھا۔ وہ اگتور کر کے وجدان سے سلام دعا کرنے لگی۔ رانیہ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

مہرون کاٹن کے کشمیری کڑھائی والے سوٹ میں وہ خاصی پروکار لگ رہی تھی۔ اسٹیب کٹنگ بالوں کی چند لٹیں پونی ٹیل سے نکل کر چہرے کے گرد بھری تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ ایلیکٹریک ڈر کے اٹھ گئی۔ وہ لیجن میں آ کر سلاٹس دیکھنے لگی تھی۔ اسے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی تھی۔

”کیا چاہیے آپ کو وجدان بھائی؟“ وہ ہٹاؤں سے بولی تھی۔

”تمہیں کیسے پتا چلا میں ہوں۔“ اس کی حیران آواز سنائی دی۔ پلٹ کر اس نے اس کے جوتوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”تم واقعی اٹلی جٹ ہو۔“ خیر میں پانی پینے آیا تھا۔

اس نے فریج سے پانی کی بوتل اور گلاس نکال کر اس کے سامنے رکھا۔

”اب میں اتنی بھی ذہین نہیں ہوں۔ تو کوئی بھی بتا سکتا تھا۔“

”ذہین تو تم ہو آئی سے سن کر آ رہا ہوں تمہاری متوقع پروموشن کے بارے میں۔“ وہ پانی پیچے ہوئے

”قابل لوگوں کا ہی لک ورک کرتا ہے۔ ویل مجھے تو شرمندگی لگی ہو رہی ہے۔“

”کیوں؟“ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

”تمہاری لمبی کی وجہ سمجھ آگئی ایک کہنی کی اسٹنٹ اکاؤنٹ منیجر کو میں کمپیوٹر آپریٹر کی جاب آفر کر رہا تھا۔“ اس کا لہجہ کھسایا ہوا تھا۔ وہ کھٹکھٹا کر بول پڑی۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ رانیہ کچن میں داخل ہوئی۔

”میں بانی بننے آیا تھا۔“ وہ گلاس کاؤنٹر پر رکھ کر پلٹ گیا۔

”بڑی لمبی آ رہی تھی کون سا جوک سنایا تھا وجدان نے۔“ اس کے مٹھر پر نور نے پلٹ کر دیکھا۔ برا تو بہت

لگا تھا اسے مگر مہمان ہونے کا لحاظ کر گئی تھی۔

”کھانا لگا کر وہ سب کو بلائے چل دی گئی۔“

”زہرہ بتا رہی تھی کہ تمہاری پردوشوں ہونے والی ہے۔“ کھانے کے دوران مہناز نے بات پھینکی۔

”میرا بچہ نے بیڈ آفٹس پانچ نام بیٹھے تھے اور اس میں میرا نام سلیکٹ ہوا۔ چاروں مجھ سے زیادہ اچھے لکھتے

اور ایکسپرنسڈ ہیں مجھے تو یقین ہی نہیں آیا تھا کہ میں سوچ رہی ہوں سچ کر دوں۔“

”کیوں؟“ وجدان نے اچھے سے اسے دیکھا۔

”لاہور جانا پڑے گا چند روز میں دن کا شے ہوگا۔ کچھ سینکڑوں اور سینکڑوں رائیڈ کرنے ہوں گے اور میں امی کو

ایکلائیں چھوڑ سکتی۔“ اس نے وجہ بتائی۔

”چند روز میں دن کی تو بات ہی ہے تم زہرہ کی فکرت کرو یہاں میں آ جاؤں گی۔“ مہناز بولیں۔

”ایسے موقع ہمارا نہیں ملے گا۔ ہمیں یہ موقع کتنا نہیں چاہیے۔“ وجدان نے کہا۔

”میں تو میں اسے سمجھا رہی ہوں۔“ زہرہ بولیں۔ رانیہ اس دوران خاموش رہی تھی۔

”چشمیں میں سوچوں گی اس بارے میں۔“ وہ ہولے سے مسکادی گئی۔

کھانے کے بعد زہرہ اور مہناز کی گفتگو ہونے لگی۔ وجدان اور رانیہ ایک دوسرے میں مگن تھے اسے اپنا

آپ سچ میں بے کار محسوس ہوا تو خاموشی طرح سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

تھوڑی دیر بعد رانیہ بھی دستک دیتی اندر داخل ہوئی تھی۔

”ارے آپ..... میں بس آ رہی رہی تھی۔“ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”میں تم سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔“ وہ بیٹھنے ہوئے گویا ہوئی اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”تمہاری اور وجدان کی بات طے کی کچھ نہیں؟“ وہ اپنے ناخنوں پر نظریں جمائے کچھ توقف سے بولی

تھی۔ سوال غیر متوقع تھا اس نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔

”اس بات کا اب کیا ذکر؟“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ وہ ناخنوں سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ اسے ہی

دیکھ رہی تھی اور کچھ نہیں پارتی تھی کہ وہ کیا جانتا چاہ رہی ہے۔

”مجھے نہیں پتا کہ میرے ماں باپ کا اس بارے میں کیا ذہن تھا مگر میں یہ جانتی ہوں کہ یہ مہناز آگئی کی

خواہش تھی۔“ کچھ جھوٹ کی آمیزش کے ساتھ اس نے جواب دیا تھا۔

”صرف مہناز آگئی کی یا..... تمہاری بھی۔“ معنی خیز توقف کے بعد اس نے جملہ مکمل کیا تھا اور نور کا چہرہ

جواب دے گیا تھا۔

”کیا بکواس کر رہی ہو تم میں کب سے جہیں مہمان سمجھ کر برداشت کر رہی ہوں۔“ وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

”اتنا کیوں بھڑک رہی ہو میں تو صرف ایک بات پوچھ رہی ہوں۔“ اس کے اطمینان میں چند اصرار فرق

نہیں پڑا تھا۔

”تمہاری بنیاد ذہنیت کا اعزاز مجھے اچھی طرح ہو چکا ہے۔ میں حریف جہیں برداشت نہیں کر سکتی۔ ناؤ

میت آؤت فرام ہیئر۔“ بمشکل خود پر قابو پاتے اس نے دروازہ کھول کر اسے نکل جانے کا اشارہ کیا تھا۔

ورنڈل تو جا رہا تھا کہ اس کے خوب صورت چہرے پر مٹھروں کی بارش کر دے۔

”وجدان گھر چلو۔“ لاؤنچ میں داخل ہوتے ہی حکم بھرے لہجے میں بولی۔

”کیا ہوا بیٹا؟“ کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوتے ہی زہرہ کھڑی ہو گئی تھیں۔

”وجدان تم چل رہے ہو یا میں چلی جاؤں۔“ انہیں نظر انداز کرتی وہ دوبارہ اس سے مخاطب ہوئی۔ وہ

بوکھلا کر کھڑا ہو گیا اور وہ اس سے پہلے ہی چل پڑی۔

”جیسا آگئی اجازت دیں۔“ وہ زہرہ کے آگے جھکا تھا۔

”جہیں اچانک کیا ہوا؟“ گاڑی میں بیٹھے ہی وہ خامسے غصیلے لہجے میں دریافت کر رہا تھا۔ پیچھے پیچھے

مہناز چلی آئیں۔ وہ خاموش رہی تھی۔

”آگئی کو جانا تھا خود جانتی تھیں کیوں لے کر گئیں میری اسٹنٹ کروانے کے لیے۔ میں صرف ان کے

اصرار پر وہاں گئی تھی۔ ورنہ مجھے کوئی شوق نہیں ہے سچ لوگوں کے گھر جانے کا۔“ کمرے میں داخل ہوتے

ہی زور زور سے بولتے اس نے برس بیڈ پر اچھا لایا تھا۔

”اس نے مجھے کمرے سے نکل جانے کو کہا، وہ دو ٹوکی کی لڑکی چالیس پچاس ہزار کی نوکری کر کے خود کو

بہت اونچی شے سمجھ رہی ہے۔ چالیس پچاس ہزار روپے میں یوں..... یوں ایک جھکے میں خرچ کرتی

ہوں۔“ اس نے وجدان کے آگے جھکی بھائی گئی۔ اعزاز حذارت بھرا تھا۔

”شٹ اپ رانیہ! تمیز سے بات کروان کے بارے میں۔“ وئی آواز میں اس نے تیسہ کی تھی۔

”اس کی حجرات گیسے ہوئی مجھ سے اس طرح بات کرنے کی۔“ وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔

”ریلیکس۔ یہاں سکون سے بیٹھو اور بتاؤ کیا ہوا تم نے اسے ایسا کیا کہا جو اس نے نہیں کمرے سے

پلے جانے کو کہا وہ تو بہت نرم مزاج اور ڈیمینٹ لڑکی ہے۔“ اس نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی مگر وہ

حریف بھڑک اٹھی۔

”ماں وہ ڈیمینٹ لڑکی ہے اس کی فطرتی جہیں کہاں نظر آئے گی۔ بچپن کی محبوبہ جو غمخبری۔“ اس نے اس کا

کار پکڑ کر جھکا دیا تھا۔

”جسٹ شٹ اپ، یہی سب بکواس تم نے اس سے بھی کی ہوگی۔ تمہاری ذہنیت کتنی گھٹیا اور پست

ہے۔“ اس نے جھکے سے کار چھڑایا تھا تاہم اس پر اٹھتے اٹھتے رہ گیا تھا۔ دروازے کو پھٹا وہ باہر نکل گیا۔

غصے میں وہ کمرے کے باہر کھڑی لڑکی ماں کو بھی نہیں دیکھ پایا تھا۔ وہ کتنی بڑی فطرتی کرہنگی جس شادی کے محض

ایک ماہ چارون بعد انہیں اعزاز ہو گیا تھا۔

وجدان کی بات نور سے ملے ہے۔ یہ بات اسے پہلے سے پتا تھی۔ کوئی چیز اسے پسند آئے اور وہ اسے

حاصل نہ کر پائے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا اور یہاں تو بات ہمسفر پہننے کی تھی۔ اسے قوی یقین تھا کہ اس کے پوزل کے مقابلے نور کوورجیکٹ کر دیا جائے گا اور ہوا بھی یہی۔ اس کا غرور سے تاسر حریقن گیا تھا۔ مہناز نے اس سے زہرہ کے گھر پہننے کی بابت پوچھا تو وہ راضی ہو گئی۔ وہ اپنے احساس برتری اور تفاخر کو مزید ہوا دینا چاہتی تھی۔ وہ سکیکین چاہتی تھی نور کا شکست خوردہ اور جھکا ہوا سر دیکھنا چاہتی تھی مگر وہاں اسے ایسا کچھ دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔ وہ بہت خوش دلی سے اس سے ملتی تھی۔ ہاتھ ملایا بلکہ وہ تو اس سے گلے ملنا چاہتی تھی وہ خود پیچھے ہٹ گئی۔ پھر اس نے نور کی ہنسی مٹی تھی۔

”اوہ تو یہاں ہنسی مخصوص ہو رہے ہیں۔“ وہ جمل کر کہاب ہو گئی۔ وہ اس پر طنز کا تیر پھیک کر پلٹ گئی۔ اس کے چہرے پر ناگواری اسے صاف نظر آتی تھی۔ اسے خوشی محسوس ہوئی۔ کھانے کے دوران مہناز اور وجدان کا اس کے لیے غرور منہ ہونا اسے ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ بھاڑ میں جانے اس کی پریشانی اسے کیا تکلیف ہے وہ وجدان کو گھورتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ پھر وہ اس کے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس کے دل کا حال جاننے اس نے سوچا دل کی بات ہونٹوں پر آئے یا نہ آئے، اس کے انداز و اطوار تو کچھ بتائیں گے۔ دوسرا وہ ایسے جتنا چاہتی تھی کہ وہ اس سے ہر لحاظ سے برتر اور بہتر ہے اس لیے اس پر اسے فوقیت دی گئی مگر اس نے تو اسے برتر اور بہتر ہونے کو سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی البتہ اسے کمرے سے دفع ہو جانے کا کہا تھا اور اب وجدان بھی اس کی حمایت میں بول گیا تھا حالانکہ بیوی تو وہ تھی اس کی وہ گاڑی کی پانی اٹھا کر نکل گئی۔ ”وجدان! میں کچھ نہیں جانتی وہ بیوی ہے تمہاری اسے منکر واپس لکر لانا فرض ہے تمہارا۔“ نور لاہور چلی گئی تھی اور وہ زہرہ کے پاس رہنے آئیں تھیں روزی فون پر رانیہ کو گھر لے آئے پر اسرار کرتی تھیں۔ ”سارے فرض میرے ہیں۔ کیا اس کا کوئی فرض نہیں ہے۔ آپ نہیں جانتیں کس نے۔“

”میں کچھ جانتا بھی نہیں چاہتی میں بس اتنا جانتی ہوں کہ میری بہوشادی کے محض ایک مہینے بعد روضہ کر مینے جائیگی ہے اور یہ میرے لیے شرم کی بات ہے۔ تم اسے گھر لے کر آؤ باقی باتیں ہند میں کریں گے۔“ سب کچھ جانتے ہوئے وہ اس سے دوبارہ سب کچھ نہیں سننا چاہتی تھیں۔ وہ بے حد کٹھنی محسوس کر رہی تھیں۔ اپنے ہیرے جیسے بٹے کے لیے وہ ایک چتر اٹھالائی تھیں اور اب ساری زندگی اسے اس چتر سے سر پھوڑتا تھا۔ جن رشتے داروں کی ناراضی کے ڈر سے انہوں نے یہ سب کیا تھا وہ تو اب بھی ان کی کوئی غلطی نہ ہونے کے باوجود ملن کر رہے تھے۔

☆.....☆

وہ پچھلے دو گھنٹے سے اپنے کام میں مصروف تھی۔ اب بہت بری طرح تھک چکی تھی کچھ دیر ریٹ کرنے کو کر کے کی بیک سے اپنی گردن ٹکا کر اس نے آنکھیں موندھ لیں۔ اسے اپنی پیشانی پر ہاتھوں کا نرم لمس محسوس ہوا تھا۔ کس اب اس کی کششیاں سہارا ہوا تھا۔ اسے بے حد سکون محسوس ہو رہا تھا۔ ”آپ اب تک سوئی نہیں امی! کافی رات ہو چکی ہے۔“ جملہ مکمل ہوتے ہی اسے احساس ہوا تھا اور اس نے سیدھے ہوتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ ان کے چہرے پر جیسی ہی مسکراہٹ تھی۔

”تھک گئی ہو بیٹا؟“ ان کا لہجہ شفقت آمیز تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

”میں کئی بار تمہیں دیکھنے آئی تھی مگر اپنے آرام کا بھی تو خیال رکھنا چاہیے۔“ پیار بھرے لہجے میں سر زلزل کرتے ہوئے انہوں نے بیڈ اس کے بالوں سے الگ کیا اور نرمی سے

نیم گرم تیل کا مساج کرنے لگیں۔ اسے اس وقت اپنی ماں بے طرح یاد آئی تھی۔ وہ بھی تو اس کی تھکان محسوس کر کے ایسے ہی نیم گرم تیل کی مالش کرتی تھیں اور منٹوں میں اس کی تھکان دور ہو جاتی۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آتی تھی۔ وہ بونہی سر جھکا کر بیٹھی تھی اس نے انہیں روکنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔

”خود کو کیلا مت سمجھو میری بچی میں ہوں تمہارے پاس تمہارے ساتھ۔“ کچھ جھک کر انہوں نے تیل کی پیالی میں اٹھکلیاں ڈبوئی تھیں۔ اس کے کالوں پر چمکتے آنسو انہیں صاف نظر آئے مگر انہوں نے اسے ٹوکا نہیں وہ چاہتی تھیں کہ اس کے دل سے غبار دھل جائے۔ دل کے آئینے پر جی گرد صاف ہوئی تو وہ ان کے غلوں کا عکس دیکھ پاتی۔

”میں تمہاری ماں تو نہیں پر ماں جیسی ہی ہوں اور مجھے بھی تم اپنی اولاد کی طرح ہی عزیز ہو۔“ ان کا لہجہ مہربان تھا۔ اس وقت اسے اپنی ماں کی کی اور اپنے اکیلے پن کا احساس شدت سے ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ان کی گود میں منہ چھپالے۔

”ناشتہ تیار ہے بیٹا آ جاؤ۔“ اسے کمرے سے برآمد ہوتے دیکھ کر انہوں نے اپنا مخصوص جملہ ادا کیا۔ روز اس کا ناشتہ ایک سلاخ پر مشتمل ہوتا۔ وہ بھی وہ ملتے پھرتے اپنی چیزیں اریج کرتے ہوئے کھاتی۔ ان کی بات کا جواب دینا وہ گوارا نہیں کرتی تھی اور جی بھی تو لٹھ مار۔ مگر آج اس کے رویے میں انہیں ٹیک نظر آتی تھی۔ وہ ناشتہ کرنے بیٹھ گئی تھی۔ اس کی نگاہوں میں بھی ان کے لیے پہلے کی طرح سردہری نہیں تھی۔ ان کے لیے یہ بھی بہت تھا۔ چاہے بہت چھوٹا ہی کئی پر اس نے ان کی طرف قدم بڑھایا تو تھا۔

عین کو آج ان کا چیک اپ کرنا تھا اس لیے وہ ہاسپٹل سے واپس چلا آیا تھا۔ کچھ دیر بعد وجدان بھی آ گیا مہناز نے دو ٹوں کو ہی روک لیا۔

”نور! اب تک نہیں آئی روز کیا دیر سے ہی آتی ہے؟“ وجدان گھڑی دیکھتے ہوئے مخاطب ہوا۔

”نہیں کبھی جلدی بھی آ جاتی ہے اب ابھی بڑی پوسٹ پر ہے ذمہ داری ہوگی اس پر۔“ انہوں نے جواب دیا۔

اپنی دیر میں وہ چلی آئی تھی۔ اس نے سلام کیا۔ سلام تو وہ روز کرتی تھی مگر اس سلام میں اور اس سلام میں بڑا فرق تھا۔ وجدان نے نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔ وہ مطمئن سی مسکرا دیں وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

چائے بنانے کے لیے وہ کچن میں چلی آئی۔

”بیٹا! چائے بنا رہی ہو؟“ پیچھے ہی مہناز بھی چلی آئیں۔

”جی۔“ اس نے بناؤں سے جواب دیا۔

”تو پھر سب کے لیے نالو وجدان اور عثمان بھی ابھی آئے ہیں۔“ وہ کہہ کر کچن سے نکل گئیں۔ دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر پھر بھی اس نے حریف پانی ڈال دیا۔ چائے تو اس نے بنا دی تھی مگر سرو کرنے کی زحمت نہ کی۔ اپنا کپ اٹھا کر چلی گئی۔

”نور! آ جاؤ کھانا لگ گیا ہے۔“ وجدان دروازے میں ہی کھڑا ہوا تھا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس کا انداز خاصا مصروف تھا۔ حالانکہ وہ اپنی مصروف بھی نہیں تھی بس ان لوگوں کے ساتھ کھانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ دروازہ چھوڑ کر اندر چلا آیا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے کمپیوٹر آف کیا تھا۔

”باقی کام بعد میں۔“ وہ بیڈنگی سے بولتا مڑ گیا۔ وہ سنا پا سگ تھی تھی مگر کچھ دیر بعد آ گئی۔

وہ اسے گھر لے آیا تھا اور یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ اسے اب کس قسم کی زندگی گزارنی پڑے گی۔ یہ مشکل تھا مگر وہ ماں کے لیے یہ بھی کرنے کو تیار تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اب انہیں ان لوگوں کی وجہ سے کوئی تکلیف ہو۔ کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے سانس سر کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اسے رانیہ کی پسند ناپسند اور معیار بتایا گیا تھا۔ کن باتوں سے اسے اعتبار پر تھوڑا سا بھی واضح کر دیا گیا تھا۔

”ہم نے بھی اپنی بیٹی سے اونچی آواز میں بھی بات نہیں اور تم نے اس پر ہاتھ اٹھایا۔“ سانس کے خاموش ہوتے ہی اس کا سر بولا تھا۔

”میں نے اسے مارا تو نہیں تھا۔“ اس نے سناٹا کر اپنی صفائی پیش کی۔

”مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو تھا اسے اپنی کتنی اسلٹ ٹل ہوئی ہوگی۔“ سانس جھٹ بولی تھی۔ اور وہ اپنے ماں باپ کے سچ سے سر کے ساتھ ٹانگ پر ٹانگ جمائے ایسے بیٹھی تھی جیسے یہ باتیں اس کے متعلق نہیں کسی اور کے متعلق ہوں۔

”میں معافی چاہتا ہوں آپ سے بھی اور اس سے بھی۔“ اس نے رانیہ کو دیکھا جو موہاں سے کھینچے میں مصروف تھی۔ یہ کہتے ہوئے اسے اپنی پوزیشن کتنی ڈاکٹن مل ہوئی تھی اور کس طرح اس نے یہ الفاظ ادا کیے تھے یہ وہ ہی جانتا تھا۔

”دیکھو وجدان الٹائی جھگڑا تم جیسے ڈینٹ فکس کو سوٹ نہیں کرتا اور پھر لڑائی بھی وہ جو دوسروں کے متعلق ہو۔“ اس کے سر نے سگار کی راکھ اٹھ کر ٹرے میں جھاڑتے ہوئے فرمایا تھا۔ اس کے سوری کی اہمیت یہاں سگار کے راکھ جتنی ہی تھی جیسا اسے کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔

”میں آپ کی بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں مگر یہ بات آپ اسے سمجھائیں کیوں کہ لڑائی اس نے کی تھی میں نے نہیں۔“ اسے اب غصہ آنے لگا تھا۔

”خیر اس میں اب میری بیٹی کی بھی کوئی غلطی نہیں ہے۔ اس لڑکی نے اس کی بے عزتی ہی اتنی کی تھی۔ غصہ تو اسے آتا ہی تھا۔“ ماں نے لاٹ سے بیٹی کو گلے لگایا تھا۔

اس کا جی چاہا کہ وہ اسے عزت صرف آپ کی بیٹی ہی کی ہے کوئی دوسرا عزت نہیں رکھتا مگر کہنے کا مطلب تھا بات کو مزید بڑھانا۔ اس نے چپ رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔

”اب جو بھی ہے رانیہ اور تمہارا معاملہ ہے رانیہ نے ہی فیصلہ کرنا ہے کہ تمہارے ساتھ جانا ہے یا نہیں۔“ اس کے سر نے کہا تھا اور اسے آگ لگ گئی۔ میرا اور اس کا معاملہ تھا تو خود کیوں بول رہے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس سے پہلے کہ بولنے کے لیے منہ کھولتا رانیہ بول پڑی۔

”ڈیڈی! میں چلی جاتی ہوں انہوں نے سوری کیا ہے۔“ قدرے سکون کا سانس لیتے ہوئے وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

”ٹھیک ہے آئندہ کے لیے خیال رکھنا۔“ وہ جانتا تھا یہ سچیہ صرف اور صرف اس کے لیے ہے۔

”میں گاڑی میں تمہارا ویٹ کر رہا ہوں۔“ اس سے خطاب ہوتا وہ فوراً اٹھ گیا۔

گاڑی میں بیٹھے ہی وہ سوچنے پر مجبور ہوا تھا کہ اس سے زندگی میں ایسی کون سی غلطی سرزد ہوئی کہ اسے ایسی لڑکی ملی تھی۔

نورا اور سے واپس آگئی تھی سو مہناز بھی اگلے دن آئیں رانیہ کو انہوں نے گلے لگایا تھا شکوہ بھی کیا کہ وہ بغیر بتائے چلی گئی مگر وہ بچی انکڑی بیٹھی رہی۔

زہرہ سے مہناز جو وعدہ کر آئی تھی اس میں اب دیر نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے رات کے کھانے کے بعد وجدان کو اپنے کمرے میں آنے کا کہہ کر اٹھ گئیں۔

کچھ دیر بعد ہی وہ ان کے کمرے میں داخل ہوا اور بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

”نور میری بہو بنے یہ میری ہمیشہ سے خواہش تھی۔“ انہوں نے بات کا آغاز کیا۔

”میں ہمیشہ تمہارے لیے نور کو مانگتی رہی مگر میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی تم تو جانتے ہو کہ تمہاری نانا اور ماموں کے اصرار پر میں نے رانیہ کو بہو بنایا۔ مگر ان تھوڑے دنوں میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ میرا فیصلہ کس قدر غلط تھا۔“

”وہ میرے نصیب میں لکھی تھی اس میں آپ کا کیا قصور، پلیز خود کو قصور وار مت سمجھیں۔“ وہ جو غور سے ان کی بات سن رہا تھا بول پڑا اس کی بات پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر در آئی۔

”حالانکہ میرا زہرہ سے بات کرنے کا اب کوئی من نہیں رہ گیا تھا۔ پھر بھی میں نے عثمان کے لیے نور کا ہاتھ مانگا ہے۔“ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا چند لمحوں کے خاموش رہا پھر بولا۔

”آپ نے عثمان سے پوچھا کیا؟“

”نہیں۔“ انہوں نے ٹٹنی میں سر ہلایا۔

”تو پھر اس سے پوچھ لیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”جیہیں اس لیے بلایا تھا کہ تم اس سے پوچھو مگر میں تو صاحبزادے تکلیف نہیں۔“ وہ بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے بولیں۔

”ہاؤس جاب ہے اس کو سونے کا کام بھی بمشکل ملتا ہے۔“ وہ لائٹ آف کر کے چلا گیا۔

رانیہ نے سنا تو وجدان کے سامنے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ”اس لڑکی نے میری بے عزتی کی تھی اور آئی اسے بہو بنانے کا سوچ رہی ہیں۔“ وہ غصے سے ہانگ ہو رہی تھی۔

”اس نے جو بھی کیا وہ تمہاری بات کا رد عمل تھا اور تمہارے اس مسئلے سے ماما اور عثمان کا کیا تعلق۔“ اس نے جمل سے جواب دیا تھا۔

”وہ اگر اس گھر میں آئی تو میں یہاں نہیں رہوں گی۔“ وہ وجدان کے سامنے تن کر کھڑی ہوئی تھی۔

”تو شوق سے جاؤ نہ کوئی تمہیں روکے گا اور نہ لینے آئے گا۔“ وہ کمرے سے نکل گیا۔

اس نے ماں کو فون کیا انہوں نے سمجھایا کہ اس کے لیے گھر چھوڑ دینا مکمل مسئلہ کی بات نہیں۔ اسے وہیں رہ کر اس مسئلے کو حل کرنا چاہیے۔ کافی دیر وہ دونوں ڈسکس کرتی رہیں تھیں۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ عثمان نے نور کے متعلق کیا جواب دیا ہے۔ وہ اس سے بات کرنے کے لیے موقع کی تاک میں تھی۔ اس کی ٹائٹ ڈیوٹی تھی کچھ دیر پہلے ہی وہ جاگا تھا اور ناشتا اپنے کمرے میں ہی منگوا لیا تھا۔

وہ دستک دیتی اندر داخل ہوئی۔

”آئیے بھابھی۔“ وہ احقر مانا کھڑا ہوا۔

”میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ بیٹھنے ہوئے بولی۔

”نور کے لیے تمہارا کیا جواب ہے؟“ اس نے اپنا لہجہ سرسری رکھا تھا۔

”میں اپنا جواب وجدان بھائی کو بتا چکا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کے جواب پر وہ سوچ میں پڑ گئی کہ اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے۔ ہاں ہی کی ہوگی جسکی تو بڑی بی اتنی پر جوش ہیں۔

”کیا تمہیں لگتا ہے کہ نور تمہارے لیے ایذا آلائف پارٹنر سمجھ رہے کی۔“ قدرے توقف سے اس نے دوبارہ سوال کیا تھا۔ اس کے سوال پر وہ قدرے حیران ہوا تھا۔

”ہے بی۔ مگر۔۔۔“ اس نے کاندھے اچکائے وہ آگے بھی کہنا چاہتا تھا مگر وہ بات کاٹ گئی۔

”وہ ایک خود مر لڑکی ہے شاید اسے اپنی جاب کا غور ہے۔“ اس کا لہجہ کڑوا تھا۔

”یہ تو آپ اس لیے کہہ رہی ہیں کچھ دنوں پہلے آپ کی اس کے ساتھ بدھ کی ہوئی ہے۔ ورنہ وہ بالکل ایسی نہیں ہے۔ میری زیادہ دو تین دو تین بار سرسری سی ملاقات ہوئی ہے ایڈ آئی تنگ شہ از نا کس کرل۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا وہ بری طرح بدھ رہی ہوئی۔

”یہ دونوں بھائی اس سخت لڑکی پر لٹو ہیں۔“ دل میں سوچا۔

”مگر تم یہ بھی تو سوچو کہ وہ پہلے وجدان سے منسوب تھی۔“ اس نے پینتیر دلا۔

”یہ اطلاع آپ کے پاس بالکل غلط ہے وہ وجدان بھائی سے منسوب نہیں تھی۔“ وہ جیکٹ اٹھاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

”وہ اچھی اور سلیمانی ہوئی لڑکی ہے اس میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو ایک لائف پارٹنر میں ہونی چاہئیں۔ وہ لڑکی جس کی بھی ہمسفر بنے گی وہ انسان خوش قسمت ہوگا اور کے بھائی میں لیٹ ہو رہا ہوں۔“ وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔

”وہ خوش قسمت انسان تم خود کو سمجھتے ہو مگر میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔“ وہ دانت چبے ہوئے بڑبڑائی۔

☆.....☆

”کیا ان کی ہمت کیسے ہوئی یہ بات کہنے کی۔ اب کس منہ سے وہ یہ باتیں کر رہی ہیں۔ ایک بار وہ آپ کو خواب دکھا کر خود اپنے قدم چبھے ہٹا چکی ہیں۔“ بات سنتے ہی وہ ہتھ سے اکھڑ گئی تھی۔

”تم میری پریشانی سمجھو نور۔“ ان کا لہجہ کڑوا تھا۔

”ای پلیز ایس ایچ ٹی گزری نہیں ہوں۔ ایک بھائی کے لیے نہ کسی تو دوسرے۔“ اس کی آواز رندہ گئی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے تم رو کر مجھے پریشان تو مت کرو۔ میں تو بس یہ چاہتی تھی کہ تم اس پر غور کر لو۔ میں کوئی زبردستی تو نہیں کر رہی ہوں۔“ انہوں نے اس کا سر کاٹھ سے لگا کر نرمی سے سہلایا۔

رات کو جب وہ سٹی تو سوچ کے کئی درواہ ہوئے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کے لیے کتنی پریشان ہیں۔ وہ بچپن برس کی ہوئی تھی۔ اول تو نور کوئی ڈھنگ کا رشتہ ملا تھا۔ بالآخر ٹیل بھی جاتا تو وہاں صحبت کے جھنجھٹ میں کون پڑتا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ دونوں اس بھری پر دنیا میں اکیلی تھیں۔ اس کی پوجہ بھیاں تھیں جو باپ کے مرنے کے بعد سے بھی بھولی بھگی بھی نہیں آئیں تھیں۔ ایک خالہ تھی جو سعودی عرب میں مقیم تھیں۔ کبھی عید تہوار پر وہ دو تین منٹ کی کال کر لیتی تھیں۔ دو ماموں تھے جو اپنی اپنی دنیا میں خوش تھے۔ زہرہ کے لیے یہ بھی بہت تھا کہ وہ کبھی فون پر خیر خیریت لے لیتے یا کبھی چند منٹ کے لیے کھڑے کھڑے آجاتے۔ ایسے میں کون اس کے لیے اپنے کام دھندے چھوڑ کر دوسرے مولا لیتا۔ حمان کے لیے زہرہ خاتون

کو کوئی تردد نہ تھا۔ نور کو آج بھی ممانی کے الفاظ یاد تھے۔ بابا کے سوئم کے بعد بڑے ماموں کو لکھ رہی تھی کہ وہ دونوں اکیلے کیسے رہیں گی اور ممانی نے کہا تھا کہ ”زہرہ کا کھر تو اپنا ہے کون سا کرائے کا ہے جو کھر پوری کا ڈر ہو۔ اپنی جگہ پر پڑا پھر بھاری ہوتا ہے۔ لہذا انہیں نہیں رہنا چاہیے۔“ یہ جملے اتفاقاً کانٹوں میں پڑ گئے تھے۔ اس لیے نور نے بابا کے آفس سے ملنے والی جاب کو نور آئی قبول کر لیا تھا۔ ورنہ چند مہینوں میں نوبت قانون پر پہنچ جاتی اور انہیں کوئی پرچھنے والا نہ ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ اب ان کے رویوں میں تبدیلی آجاتی اگر انہیں اس کی جاب کی بابت معلوم ہو جاتا مگر اس نے اپنی اسی کوئی سے سمجھ کر دی گئی اور خود ان لوگوں کے پاس نہ اتنا وقت تھا اور نہ ان سے اتنی انسیت کہ اس کے بارے میں کھوج لگاتے پھرتے۔ اسے اب ایسے خود غرض رشتوں کی ضرورت نہ تھی۔ جب ضرورت بھی تب سب نے پیٹھ دکھا دی تھی۔ زہرہ اپنی نیاری سے گھبرا گئی تھیں وہ جلد از جلد اس کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔ نور کا خیال تھا کہ وہ ٹینشن زیادہ لگتی ہیں اس لیے بیمار رہیں ہیں مگر دراصل انہیں اکیلے پن کے احساس نے کھوکھلا کر دیا تھا۔ انہوں نے نیوی کی چادر کیا اور کبھی بھی ہر شے ختم ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہے صرف آپ کے لیے۔“ اس نے پلٹ کر اپنی ماں کے سوئے ہوئے چہرے کو دیکھا اور پھر دوبارہ تاروں بھرے آسمان پر نگاہیں جمادیں۔

کچھ فیصلے ہم اپنے دل کی خوشی کے لیے نہیں اپنے سے بڑے لوگوں کی خوشی کے لیے کرتے ہیں اور اس نے بھی اپنی ماں کی خوشی کے لیے فیصلہ کر لیا تھا۔

”یہ دنیا ہے، یہاں کیا نہیں ہوتا اور پھر میرا کون سا وجدان سے کوئی جذباتی تعلق تھا جو رکاوٹ بنے۔“ اس نے دل کو ٹھیک کیا اور رستہ پر آ گئی۔

صبح اس نے انہیں اپنی ماں کا عندیہ دے دیا تھا۔ وہ خوشی سے نہال ہو گئیں۔ انہوں نے خوشی سے اسے بچھ لیا تھا۔

”اب آپ بیمار ہو ہو کے مجھے تنگ کرنا چھوڑ دیں گی وعدہ کریں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”بیاری تو اب مجھ سے یوں دور بھاگ جائے گی تم دیکھنا۔“ انہوں نے چٹکی بجاتی تھی۔

☆.....☆

نور کو کڑھت کرتے ہوئے انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کسی ضدی اور اڑیل بننے کو اپنی طرف مائل اور قائل کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ جو بھی تھا وہ اپنی کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہو چکی تھیں۔ وہ اس کا من پسند کھانا تیار کیا۔ بیلے میں اپنا کام پیار بھری دھونس سے کر لیں۔ وہ لاکھ انہیں دشمن مانتی مگر دل میں ان کا احسان بھی مانتی تھی۔ جانتی تھی کہ وہ کتنی بھی بیمار رہنے کی کوشش کرتی اکیلے رہتا اس کے بس کا کام نہیں تھا۔

”بچے۔“ انہوں نے ننگر اٹھا کر دیکھا وہ ہزار ہزار کے کئی ٹوٹ لیے کھڑی تھی۔

”یہ کس لیے؟“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”مگر کے خرچ کے لیے۔ جیسے میں ای کو دیتی تھی جب تک وہ مگر چلانے کے قابل رہی تھیں۔“ ماں کے ذکر پر اس کا لہجہ افسردہ ہوا تھا۔

”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے بیٹا اگر ہوئی تو میں اکاؤنٹ سے نکال لوں گی۔“ انہوں نے نرمی سے انکار کیا تھا۔

”ہاں مجھے معلوم ہے کہ آپ خاصی امیر خاتون ہیں۔ پر یہ گھر میرا ہے اور اسے چلانے کی ذمہ داری بھی میری ہے۔“ اس کا لہجہ تیز ہوا تھا۔

”دو بی صورتیں ہیں یا تو آپ یہ پیسے لیں یا پھر یہاں سے چلی جائیں۔“ وہ مزید بولی۔

”ایک تیسری صورت بھی ہے۔ ہم اپنے گھر کیوں نہیں چلتیں۔“

”یہ بحث لاعا حاصل ہے۔“ وہ اکتاہٹ سے بولی۔ ”پیسے ان کی گود میں ڈال کر چلی گئی۔“

”اس کے لیے ہی کچھ شاپنگ کرلوں گی۔“ انہوں نے سوچتے ہوئے پیسے اٹھائے۔ پردہ اب اس کے رویے سے خاصی مطمئن ہو کر سوچنے لگی تھی کہ بس اب چند دن اور وہ اسے پیار سے اپنے ساتھ چلنے پر قائل کر لی لیں گی۔ کچھ اور سوچنے پر مجبور ہو گئیں تھیں۔

☆ ☆

”میزم! آپ سے کوئی حثان صاحب ملنے آئے ہیں۔“ بیچون نے آکر اطلاع دی تھی اور وہ سوچ میں پڑ گئی تھی کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔

”ٹھیک ہے بیچو دیں انہیں۔“ اپنی ناگواری چھپاتے ہوئے وہ عام سے لہجے میں بولی۔

وہ دستک دینا اندر داخل ہوا تھا۔ بے حد مصروف انداز میں اس نے بیٹھے کا اشارہ کیا۔

کچھ دیر اپنے کام میں مصروف وہ اس کے بولنے کی منتظر رہی۔ پھر چین فائل میں رکھ کر پوری طرح متوجہ ہو گئی۔ جیسے جڑی بیک سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ گلاس ٹیبل پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

دو تین دن کی بیڑی ہوئی شیدا آنکھوں پر نظر کا فریم لیس چشمہ وہ کی سوچ میں آگیا تھا۔ اس نے ٹھکانے کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ چونک کر سیدھا ہوا۔ وہ چوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہم کہیں چل کر بات نہیں کر سکتے۔“ وہ جھکتے ہوئے گویا ہوا۔

”سواری۔۔۔ یہ دور ٹنگ آرزو ہیں۔ دوسرے میرے کونکیز آپ کو جانتے نہیں ہیں۔ آپ کی یہاں آمد بھی ان کے لیے جیسے کاباٹ ہوگی۔ ایسے میں اگر میں آپ کے ساتھ جاؤں گی تو وہ آپس میں چہ میگوئیاں تو کریں گے۔“ اس نے پراعت سمجھاتے ہوئے معذرت کی تھی۔

”مجھے سمجھ نہیں آ رہا میں کس طرح آپ سے بات کروں۔“ وہ کچھ دیر بعد بولا تو لہجہ بے بس سا تھا۔

”پلیز مسٹر حثان! آپ مجھے الجھن میں مبتلا کر رہے ہیں۔“ اس نے ٹوکا۔

”میں تو خود الجھا ہوا ہوں۔“ وہ بڑبڑایا۔

”میں۔۔۔ میں آپ سے شادی نہیں کر سکتا۔“ اس نے بڑی دقت سے جملہ ادا کیا تھا۔

وہ اس سے ہر بات سننے کی توقع کر رہی تھی مگر یہ نہیں اسے لگا جیسے اس کا وجود بے پروا ہو کر ٹکڑا گیا ہو۔

”ایک بار پھر۔۔۔“ اس نے سوچا احساس تو ہیں اس کا جسم کچپکانے لگا تھا۔

”ای کی کو پتا چلے گا تو۔۔۔ تو۔۔۔“ اس سے آگے وہ سوچنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے اسے دیکھا وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ تو اپنی کہے جا رہا تھا۔ ٹیکل کی سچ پرستی سے انگلیاں جمائے ہوئے اس نے اسے سننے کی کوشش کی۔

”ممانے میرے علم میں لائے بغیر زہرہ آگنی سے بات کی تھی۔ آپ بہت اچھی ہیں نور میں آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا اگر میں نے کسی سے کٹھنٹ نہ کی ہوتی۔“

”آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“ وہ بے زاری سے بولی اس کا تکی چاہ رہا تھا اس شخص کو برا بھلا کہتے ہوئے نکال باہر کرے مگر پرچی لکھی تھی۔ یہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

”میں چاہتا ہوں آپ انکار کر دیں۔“ کچھ جھکتے ہوئے اس نے مدعا ظاہر کیا۔

”نیک کام تو آپ بھی کر سکتے ہیں پھر میرے کاغذ سے پر ہندوق رکھ کر کیوں چلانا چاہتے ہیں۔“ وہ خود پر قابو پا چکی تھی طنز بولی۔

”آپ کو کیا لگتا ہے میں نے انکار نہیں کیا ہوگا مگر مادہ بارہ زہرہ آگنی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتیں وہ مجھے مجبور کر رہی ہیں۔“ وہ بے بسی سے بولا۔

”میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی جیسے آپ اپنی ماں کے آگے مجبور ہیں میں بھی مجبور ہوں۔“ اس نے شانے اچکائے۔

”نور پلیز! میں آپ کو کوئی خوشی نہیں دے سکوں گا۔“ اس نے قائل کرنے کی کوشش کی۔

”میرے نزدیک میری ماں کی خوشی زیادہ معنی رکھتی ہے۔“ اس نے گویا بات ختم کر دی تھی۔

”آپ۔۔۔“ اس نے ایک آخری کوشش اور کرنی چاہی۔

”اب آپ جاسکتے ہیں۔“ اس نے ہاتھ کھرا کر کے اسے مزید بولنے سے روکا تھا۔ اس کے جاتے ہی اس کا سنبھل ٹوٹ گیا تھا۔

”مہناز! تمہارا ناپ لینے آئی ہے۔“ جیسے ہی وہ داخل ہوئی تھی زہرہ نے خوشی سے کھٹکتے لہجے میں اسے اطلاع دی تھی۔

”اب کون سا ناپ لینے آئیں ہیں یہ۔“ اس کا لہجہ مدد پر چڑھا تھا۔

”تمہیں کیا ہوا؟“ مہناز کے ساتھ ساتھ انہوں نے بھی چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”آج ان کے صاحب زادے آئے تھے آفس۔“ وہ مہناز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ان کے چہرے کا رنگ حقیر ہو گیا تھا۔

”کیوں؟“ زہرہ نے الجھن کے عالم میں اسے دیکھا۔

”یہ بتانے کے وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتے لہذا میں خود انکار کر دوں۔“ وہ پھٹ پڑی تھی۔ زہرہ کا رنگ پیپہ پڑ گیا۔ مہناز کا سر جھک گیا تھا۔ اسے لگا کہ وہ مزید کچھ دیر بیٹھی تو انہیں بہت کچھ کہہ بیٹھے گی۔ اس لیے وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

”تم۔۔۔ تم فکر مت کرو زہرہ! میں نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ میں حثان کو راضی کروں گی۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب بیٹھیں تھیں۔

”نور نے کہا تھا مجھ سے کہ انہوں نے ایک بار آپ کے اعتبار کو نہیں پہنچائی کیا دوبارہ ان پر یقین کرنا ٹھیک ہوگا مگر میں نے پھر بھی تم پر اعتبار کیا اور تم نے دوبارہ میرے اعتماد کو کڑی کر پٹی کر دیا ہے۔“ وہ سکتے کی کسی کیفیت میں بول رہی تھیں۔

زہرہ میں۔۔۔! انہوں نے کچھ بولنا چاہا تھا۔

”میں مہناز! جہاں تمہارا بیٹا چاہتا ہے تم وہیں اس کی شادی کر دے میں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ تم یہاں سے چلی جاؤ مہناز دوبارہ مجھے اپنی صورت مت دکھانا۔“ وہ جھکتے سر کے ساتھ وہاں سے چل دیں تھیں۔

ان کے جاتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

ان کے جاتے ہی وہ ان کے پاس آئی تھی۔ انہیں روتے دیکھ کر وہ تیزی سے ان کے قریب آئی۔
”امی پلیز! خود کو بلکان تو مت کریں۔“ وہ خود رو ہاسی ہو گئی۔ انہوں نے اسے خود میں سمجھ لیا۔ اس کا خود بھی دل بھر آیا تھا۔

”جانتی ہوں وہ آپ کو بہت عزیز تھیں۔ بچپن کا تعلق تھا آپ کو بہت دکھ ہو رہا ہوگا۔“ ان سے الگ ہوتے ہوئے اس نے ان کے آنسو پونچھے۔

”تمہیں مجھے اب سب کی کتنی میل کا احساس رہا رہا ہے۔“ انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھاما۔
”چھوڑیں ایسے لوگوں کے لیے میں آنسو بہانا بھی اپنی تو جین بھتی ہوں آپ بھی خود کو بلکان کرنا چھوڑ دیں ہم دونوں ہیں ناں ایک دوسرے کے پاس ہمیں اور کسی کی ضرورت نہیں۔“ اس نے ان کے ہاتھ چومے۔

☆ ☆

”وجدان اور رانیہ لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ جب ان کی گاڑی پورچ میں رکی۔ وجدان نے انہیں لڑکھڑاتے قدموں سے اندر جاتے دیکھا تو خود بھی ان کے پیچھے لپکا۔

”کیا ہوا؟“ وہ بولا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہر پکڑے بیٹھی تھیں۔
”طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی۔“ ان کے برابر بیٹھے ہوئے اس نے ان کا ہاتھ تھاما تھا۔ تبھی عثمان بھی اندر داخل ہوا تھا۔

”اس سے کہو یہاں سے چلا جائے۔“ اسے دیکھ کر وہ بھڑک اٹھیں۔ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔
”آخر ہو کیا ہے؟ آپ تو نور کے پڑوں اور انگوٹھی وغیرہ کا ناپ لینے گئی تھیں ناں؟“ وہ پریشانی سے بولا۔

”وجدان! اس سے کہو یہاں سے دفع ہو جائے۔“ وہ دوبارہ چلائی تھیں اس نے پلٹ کر عثمان کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ کمرے سے نکل گیا تھا مگر باہر ہی رک گیا۔ رانیہ بھی وہاں آکھڑی ہوئی اس سے اشارے میں پوچھا۔ کیا ہوا جو اب وہ خاموشی رہا تھا۔

”یہ آج نور کے آفس گیا تھا۔ وہاں جا کر اس سے انکار کر دیا۔ اس نے مجھے زہرہ سے نظر ملانے کے قائل نہیں چھوڑا۔ اسے ماں سے زیادہ وہ لڑکی عزیز تھی۔“ ان کی آواز بھر گئی۔

”وہ بچپن سے میرا ساتھ دیتی آرہی تھی۔ کسی موڑ پر ہمارا ساتھ نہیں چھوٹا اب اس نے مجھے کہا وہ بارہ مجھے اپنی صورت مت دکھانا مجھے اس بات کی پروا نہیں ہے کہ اس نے مجھے کیا کہا وہ مجھے اس سے زیادہ برا بھلا کہنے کا حق رکھتی تھی۔ اس کی تو طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی جانے اس پر کیا گزر رہی ہوگی۔ میں وہاں رکنا چاہتی تھی مگر.....“ وہ اٹھ کر بے قراری سے ٹپٹپٹ لگیں۔

”مما پلیز! آپ ریلیکس ہو جائیں۔“ وجدان نے انہیں شانوں سے تھاما۔

”پتا نہیں زہرہ کس حال میں ہوگی اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ وہ پریشانی سے بولتے ہوئے بستر پر ڈھ گئیں۔ وہ اس سے زیادہ نہیں سن سکتا تھا۔ تیزی سے سیر حیاں چڑھتے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رانیہ نے پلٹ کر اسے جاتے دیکھا اور مسکراتے ہوئے وہ بھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ خوش تھی کہ جڑے کوئی پلان نہیں بنانا پڑا تھا۔

کمرے میں آتے ہی اس نے اپنی ماں کا نمبر ملایا۔ خوش خبری جو سنائی تھی۔

”مام یہ عثمان پورا گھنا ہے جب تو میں نے اس سے انگوٹھ کی اتنی کوشش کی تھی مگر اس نے اس چڑیل کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیے تھے اور آج خود اس کے آفس جا کر شادی سے انکار کر کے آیا ہے۔“ وہ چار کی شکل دیکھنے والی ہو گئی اس گھر سے وہ دوبارہ جنگلیک ہوئی ہے۔ اپنی اوقات پتا چل گئی ہو گی۔“ وہ ہنسنے لے کر اپنی ماں کو بتا رہی تھی۔ وجدان اٹنے قدموں دروازے سے ہی پلٹ گیا۔

وہ انہیں خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی۔ جتنی جلدی ممکن ہوتا وہ آفس سے اٹھ جاتی۔ انہیں لاٹک ڈرائیو پر لے جاتی۔ اکثر ڈرائیو بھی باہر ہی کرتے تھے اپنی بڑوں طیبہ کی مدد سے اس نے ملازمہ بھی تلاش کر لی تھی جن رشتے داروں سے اسے چڑی ہو گئی تھی ان کی خوشی کی خاطر وہ اکثر انہیں ملانے لے جاتی تھی۔

پھر کئی رشتے دار کی زبانی انہیں عثمان کی شادی کا پتا چلا یہ بھی کہ ماں بیٹے میں کوئی کھٹ پٹ ہے مہناز بہو بیٹے بھی نہیں گئیں اور عثمان نے الگ گھر لیا ہے۔

شادی کے بعد وہ تھانہ کو لے کر مہناز سے معافی مانگنے آیا تھا۔

”یہاں سے چلے جاؤ عثمان! جس دن زہرہ نے مجھے معاف کر دیا میں تمہیں معاف کر دوں گی۔“ انہوں نے کہا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ کئی بار آیا ان کا ایک ہی جواب تھا۔

☆ ☆

رانیہ نے جم جو ان کر لیا تھا پھر کلب جوائن کر لیا۔ راتوں کو اکثر وہ دیر سے گھر آتی تھی اور صبح دوپہر کے ایک بجے ہوتی۔ وجدان کئی بار اسے نوک چکا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی اپنی ایکٹو نیٹیز ہیں۔ گھر میں رہ کر وہ رڈل اور یونٹس ہوتا جاتی۔

مہناز کی بار بار لٹکوں میں وجدان سے اسے سمجھانے کا کہہ چکی تھیں۔ وہ ٹال جاتا اب انہیں کیا بتانا کہ بیوی کے آگے اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔

اس دن وہ اسے سمجھانے کی ٹھان کر اس کے کمرے میں چلی آئیں۔ ان کے گھر میں دل لگانے کی تلقین پر وہ تھکے سے اکھڑ گئی تھی۔

”کیا چاہتی ہیں آپ میں آپ کی طرح ملازموں کے ساتھ مارغ کھپاؤں، چولہا چوکھا کروں، میاں کے آنے سے پہلے سولہ سنگھار کر کے انتظار میں بیٹھ جاؤں۔ میری اپنی کوئی لائف نہیں۔“ ہاتھ چلا چلا کر بائیں گورتوں کی طرح وہ ان سے مخاطب تھی۔

”تمہیں جتنا میرا یہ مطلب نہیں تھا میں تو کہہ رہی تھی کہ تم تھوڑی تو جبر اپنے گھر اور شوہر کو بھی دیا کرو۔“ اس کے رویے پر یوں کھلا کر انہوں نے وضاحت دی۔

”میں خوب سمجھتی ہوں آپ کے مطلب نہیں راستے سے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے سارا موڈ غارت کر دیا۔“ ایک جھٹکے سے انہیں آگے سے ہٹا کر وہ تیزی سے پوٹتی چلی گئی۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ وہ اب تک نہیں آئی تھی۔ وجدان کا فیسے اور پریشانی کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ مہناز بھی جاگ رہی تھیں وہ فیسے میں کئی گلیں دل میں عجیب عجیب خیال آرہے تھے۔ وہ اس کی سلامتی کی دعائیں پڑھ پڑھ کر آسمان پر پھونک رہی تھیں۔ اس کے گھر وجدان نے گیارہ بجے فون کر کے پوچھ لیا تھا۔ ملازم نے بتایا تھا کہ صاحب اور بی بی جی دونوں آہستہ آہستہ آہٹاؤ گئے ہوئے ہیں۔ اس کا فون مسلسل بند

آ رہا تھا۔ اس کی دوستوں وغیرہ کا وجدان کو کچھ پتا نہیں تھا۔

”کتنے بچے تھی وہ؟“ پریشانی کے مارے وہ ان سے اس تک کئی بار پوچھ چکا تھا۔

”دو بچے کے قریب۔“ لڑکے جانے کی بات وہ حذف کر نہیں نہیں چاہتی تھیں کہ اس کے غصے میں مزید اضافہ ہو۔

”اب اور انتظار نہیں کر سکتا میں پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔ اس دوران اگر وہ آجائے تو فوراً مجھے کال کر لیجئے گا۔“ وہ گیت کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

”تقریباً تین بجے وہ گھر میں داخل ہوئی تھی۔ گاڑی کی چابی جھلائی وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ وہ راستے میں آ گئیں۔

”ناٹم دیکھا ہے تم نے؟ کوئی وقت ہے تمہارے گھر آنے کا، شریف گھرانوں کی بہو بنیں کیا راتوں کو اتنی دیر گھر سے غائب رہتی ہیں؟“ کچھ دیر پہلے کی پریشانی کی اذیت اب گفتگوں میں نظر آتی تھی۔

”دوہڑ میں میرا سوڈ خراب کر کے سکون نہیں ملا جواب دو بارہ کھڑی ہو گئی ہو، ہاں ٹھیک ہے تو زبردستی دیر ہو گئی ہے تو پارٹی میں تھی وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا۔“ اپنے گھر میں بھی میں لیٹ آئی تھی تو کیا میری بیٹی شریف نہیں ہے دوہڑ میں لحاظ کر لیا تھا میں نے اب نہیں کروں گی مہورا سے مجھے خیر آ رہی ہے۔“ ایک جھلکے سے اس کا رخ اپنی طرف متوجہ کر وجدان نے اسے زمانے دار پھر سید کیا تھا۔ وہ جو اس کی بدتمیزی پر سن

کھڑی تھیں اب ٹھگ ہو گئیں تھیں۔

”ہاں نہیں ہیں تمہارے ماں باپ شریف، شریف ہوتے تو اپنی بیٹی کی ایسی تربیت نہ کرتے۔“ اس نے اس کے صلیب کی طرف اشارہ کیا۔

”شریف ہوتے تو اپنی بیٹی کو پہلی بار ہی دیر سے گھر آنے پر ایسے ہی تھپڑ رسید کرتے۔“ اس نے من و عن اس کی ساری بکواس کی تھی۔

”تم۔ تمہاری اتنی ہمت۔۔۔۔۔“ وہ اس پر جھپٹی تھی مگر اس کے ایک اور تھپڑ نے اسے صوفے پر گرادیا تھا۔

مہناز تیزی سے بچ میں آ گئیں مگر وہ غصے سے بھرا ہوا تھا۔ غصے اور پریشانی میں اس کی جو حالت ہو رہی تھی سو ہو رہی تھی اس کی کسر پولیس والوں کے بے ہودہ سوالات اور یہاں آکر اس کی بدتمیزی نے پوری کر دی تھی۔

”میں شریف آدمی ہوں تم آدمی آدمی رات تک گھر سے باہر رہ کر میری عزت نیلام کرو میں چپ چاپ تماشا نہیں دیکھوں گا۔“ غلو میرے گھر سے۔“ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تھا۔

”وجدان چھوڑو اس کا ہاتھ۔“ مہناز نے اس کا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

”نہیں ماما میں اب اور برداشت نہیں کر سکتا اس کو میں رانیہ بیگم نہیں مطلق دیتا ہوں۔“

”وجدان۔“ جیسے ہوئے انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر جمایا تھا مگر منہ سے ان کا ہاتھ زبردستی ہٹا رہے ہوئے اس نے مزید دو بارہ جملہ دہرایا تھا۔ وہ سر دوٹوں ہاتھوں میں تمام کر بے دم کی ہو کر صوفے پر گر گئیں۔

اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا ہوا وہ اسے باہر لایا تھا۔ اسے گاڑی میں دھکا دے کر اس نے غصے میں ڈرائیور کو آواز دیں لگائیں۔ گھر کے سارے ملازم باہر کھڑے آوازیں سن رہے تھے۔ ڈرائیور قریب آیا تو وہ بولا۔

”میں رانیہ کو ان کے گھر پہنچا کر آؤ۔“ زہر خنہ لہجے میں بولا وہ اندر مڑ گیا تھا۔

زہرہ کی طبیعت کے پیش نظر اس نے آفس سے ایک بیٹے کی لیوے لی تھی وہ ان کے لیے از حد پریشان تھی۔ آج بڑے ماموں اور ماما نے آئے تھے انہیں دیکھ کر اس کی کچھ ڈھارس بندھ گئی تھی۔ انہی کی زبانی معلوم ہوا کہ چھوٹے ماموں اور ان کی بیٹی مری اسلام آباد کو منے پھرنے گئے ہیں۔ وہ بھی آئے اور دو کھڑی بیٹے کر چلے گئے۔ ان کے چاہے ہی وہ زہرہ کا ہاتھ پکڑ کر سسک پڑی۔ باپ کی وفات کے بعد سے وہ حالات کا ڈٹ کا مقابلہ کرتی آئی تھی۔ سر سے باپ کا سایہ جدا ہوا تھا مگر ماں کا سہارا تو تھا۔ اب اس سہارے کو کھو

پہر خود سے دور جانا دیکھ کر وہ گھر رہی تھی۔

”بہناز کونوں کر کے بلا لو۔“ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ غماہت سے بولیں۔

”امی۔“ اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا لیکن اس کا جواب تھا۔

”جب میرا اپنا خون سفید ہو گیا ہے تو اس سے کیا شکوہ مجھے اس پر اتنا بھروسہ تو ہے کہ وہ فون سننے ہی آجائے گی۔“ ان کی بات پر اس نے چند تابیے سوچا اور فون اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔

”ہیلو آئی! ائی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ آپ سے ملنا چاہ رہی ہیں کیا آپ آ سکتی ہیں؟“ سلسلہ ملنے ہی وہ بولی۔ دوسری طرف کی بات سن کر اس نے کال منقطع کر دی۔

”زہرہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ ریسپورڈر کھتے ہوئے وہ پریشان لہجے میں وجدان سے مخاطب ہوئیں۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی آفس سے لوٹا تھا۔

”میں جا رہی ہوں۔ تم چل رہے ہو؟“ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔

”نہیں۔ آپ ڈرائیور کو ساتھ لے جائیں۔ میری ضرورت ہو تو مجھے کال کر لیجئے گا۔“ وہ مضمل لہجے میں بولنا کوٹ اٹھاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ آج رانیہ کو طلاق دے دی گئی تھی۔ اپنے وکیل کے ذریعے وہ ڈرائیورس

بچے زاور حق مہر کی رقم پہنچا چکا تھا۔ اس کا سامان بھی اس گھر سے چا چکا تھا۔ اس کے والدین اگلے ہی دن آئے تھے اور خوب شور مچا کر اسے سکین مناج کی دھمکیاں دیتے ہوئے گئے تھے۔ محض اٹھ ماہ میں اس کا گھر اجڑ گیا تھا۔ جس پر اسے کوئی چھٹاوا نہیں تھا۔ اب نہ کسی تو چند ماہ بعد یا سال ڈیڑھ سال بعد اسے یہی فیصلہ کرنا تھا کہ

سمجھانے اور گھر بسائے رکھنے کی ساری کوششیں رانیہ کی تھیں اور رانیہ جیسی لڑکی کو وہ اپنی نسل کا امین بھی نہیں بنا سکتا تھا۔ اس سب کے باوجود وہ افسردہ تھا۔ اس کی ماں دگی تھی اور اس کے نضال والوں نے ان کا

بایکاٹ کر دیا تھا۔ زہرہ کو دیکھ کر تو وہ دنگ رہ گئیں تھیں۔ صرف چار ماہ میں وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی۔

”یہ تم نے کیا حال بنالیا۔“ وہ تڑپ کر قریب آ گئیں۔

”انہی بیار ہوا رہے فون تک نہیں کیا۔“

”تم نے کون سا پلٹ کر خبر لی۔“ ایک جھپکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر در آئی۔

”میں ہمت ہی نہیں کر پائی۔“ انہوں نے شرمندگی سے وضاحت دی۔

”ڈاکٹر زکیا کہتے ہیں؟“ انہوں نے پٹ کر نور کو دیکھا۔

”کچھ بتاتے ہی تو نہیں ڈھنگ سے۔“ وہ رو دکھائی ہو گئی۔ انہوں نے اسے کانٹے سے لگایا۔ ایک

کانٹہ حالماتوڑ کے آنسو بھی بہہ نکلے۔

”تھوڑا ہمت سے کام لو بیٹا! تم ساری راتیں سو رہی ہو مگر وجدان کو فون کرتی ہوں پھر پلٹے ہیں

جا کر بیٹھ گئی۔ وہ اس کا خوف محسوس کر سکتا تھا۔

”تم یہاں آ کر سو جاؤ کچھ دیر۔“ صوفے سے اٹھ کر اس نے اشارہ کیا۔

”جینس میں نہیں ٹھیک ہوں۔“ جینز زہرہ کے بیڈ کے قریب کھسکا کر اس نے سر بیڈ کے کنارے پر لٹکایا اور آٹکس میں موند لیں۔

”تیز تیز سانس لینے کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔

زہرہ وہاں بائیں سرخٹے سانس کھینچنے کے لیے پورا زور صرف کر رہی تھیں۔

”ای۔۔۔۔۔“ ایک جھج جھج کے طعن سے بلند ہوئی تھی۔ اس کی آواز پر سانس صوفے پر نیم دروازہ وجدان بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ ان کی حالت دیکھ کر وہ تیزی سے باہر دوڑا تھا۔

اس کے اپنے ہاتھ پاؤں کام کرنا چھوڑ گئے تھے۔ لرزتے وجود کے ساتھ وہ انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چند سیکنڈ میں ڈاکٹر زور زور سے وجدان کے ساتھ بھاگے آئے تھے۔

”انہیں باہر لے جائیں۔“ ڈاکٹر بول رہا تھا۔ وجدان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا تھا۔

اس سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے اس نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا تھا مگر وہ اسے بازو کے پھٹے میں لیے باہر کھینچا چلا آیا تھا۔ نرس نے دروازہ بند کر دیا۔ اس کی سسکیاں تیز ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ موبائل پر عثمان کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ وہ دروازے سے چپکے کھٹکے کے پار سے اندر کا جھنڈ بکیر رہی تھی۔

”وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔“ عثمان سے بات کر کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ اپنے الفاظ اسے خود ہی کھوکھلے محسوس ہوئے تھے۔

ڈاکٹر نرس اور وارڈ بوائے کو ہدایات دیتا ہوا آیا تھا۔ اس نے امید بھری نظروں سے ڈاکٹر کی جانب دیکھا۔

”انہیں آئی سی یو میں شفٹ کر رہے ہیں۔“ بولتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔

انہیں قریب آتا دیکھ کر وہ آگے بڑھی تھی ان کی آنکھوں میں زندگی کی جوت مدھم ہوتے دیکھ کر وہ وجدان کے بازو میں منہ چپا کر سسک پڑی۔

وہ سب تھوڑی ہی دیر میں پہنچ گئے تھے۔ عثمان اندر آئی سی یو میں چلا گیا تھا۔ وہ پریشانی سے دروازے کے باہر ٹپ رہا تھا۔ اس نے سرائی کھٹکے کے پار انفسوس میں سر ہلاتے ڈاکٹر کو پیچھے بٹھتے اور عثمان کو آگے بڑھ کر

زہرہ کے وجود پر پڑی چادر سے ان کا چہرہ ڈھکنے دیکھا تھا۔ دکھاؤ پر تم کی لہر اس کے اندر پھیلی تھی اس نے دکھاؤ پر ترم بھری نظروں سے اپنی ماں کے کندھے پر سر رکھے بے حال ہوئی اس بڑی کود دیکھا تھا۔

ڈاکٹر الفاظ کے سنگ پر سا کر چلا گیا۔ ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے اپنی چیخوں کا گھٹا کھونٹنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر نے اسے سکون آور بانگشیں دیا تھا اور وہ اس کے پاس اسپتال میں رک گیا تھا۔ عثمان اور مہنا زہرہ کی پاؤں کو ان کے گھر لے گئے تھے۔ وہ صبح ہوش میں آئی تھی۔ احساس زیاں ہوتے ہی اس کی چیخوں کا قتل ٹوٹ گیا تھا۔ وجدان نے تم آنکھوں کے ساتھ اسے خود میں سمیٹا تھا۔

”ممبر سے کام لو نور۔“ ضبط کے باوجود اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

”ممبر۔ کہاں سے لاؤں اتنا ممبر میں کیسے دہوں گی ان کے پیچھے؟“ سرائی کھٹکے نے سوال کیا تھا۔

وہ اسے گھر لے آیا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر گھن کے وسط میں رکھے ان کے جنازے پر پڑی

تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے منظر وحشت لگا گیا۔ کبھی اس جگہ کین کی کرسیاں رکھی ہوتی تھیں اور وہ امی اور بابا کے ساتھ شام کی چائے یہاں بیٹھتی تھی۔ وہ اس کی بے نظری اور مسکراہٹوں بھرے دن تھے مگر اب سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ پہلے بابا اور پھر امی۔ اس کی آنکھوں میں کرچیاں سی چھبکی تھیں۔ ہونٹوں سے ایک تیز سیکاری برآمد ہوئی تھی۔ کئی گردنوں نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا ان کی نگاہوں میں اس کے لیے بھر دئی اور ترم تھا۔ ماسوں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور چارپائی کے قریب بٹھا کر ایک ہاتھ سے چہرے سے چادر سر کاٹی تھی۔ اس نے وحشت بھری نظروں سے اپنی ماں کا آخری دیدار کیا تھا۔ آنسو اس کے گالوں پر پھلتے اس کی گردن کو بھگو رہے تھے مگر اب وہ بے آواز زور رہی تھی۔ جینس سسکیاں لیں اندر ہی گھٹ گئی تھیں۔

☆ ☆

وہ اب مہنا زہرہ کی ساری باتیں مانتی تھی۔ بس گھر چلنے کی بات پر اس کے کان بھرے ہو جاتے تھے۔ وہ آخر ان کی بے بات کیسے مان سکتی تھی۔ جس رشتے سے وہ اسے لے جانا چاہتی تھیں جب وہ اسے ہی قبول نہیں کر پاتی تھی ابھی اسے لگتا کہ وجدان پر اسے زبردستی مسلط کر دیا گیا ہے کبھی لگتا کہ تقدیر نے وجدان کو اس پر مسلط کر دیا ہے وہ اپنی تقدیر سے شاکم تھی جس نے اسے اسی گھرانے سے جوڑ دیا تھا جو پہلے وہ بارے سے ریجنکٹ کر چکا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اسے وجدان کی آواز سنائی دی تھی تو موصوف والہیں آگئے۔ اس نے سوچا لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اس نے سلام کیا تھا۔ خاصے پر جوش اعزاز میں جواب دیا گیا تھا۔ چہرے پر طمانیت اور خوشی بتا رہی تھی کہ جس کام کے لیے وہ کیا تھا وہ خیر و خوبی انجام پا گیا ہے۔ بیڈ پر نیم دروازہ ہو کر کتاب میں گم تھی۔ جب وہ بنانا تک کیے اندر داخل ہوا تھا۔ دروازے کی آواز پر اس نے نظریں کھائیں تھیں اور اسے دیکھ کر بیڈ پر کچھ دوڑ پڑا۔ وہ پشیمعت سے اٹھایا تھا۔ کچھ دیر پہلے لاؤنج میں سناٹا چھا گیا تھا اسے لگا وہ چلا گیا ہے۔ اس کے چہرے پر چھائی ناگواری اسے صاف نظر آئی تھی۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر اس کے بیڈ پر برائے جان ہوا تھا۔ وہ تیزی سے کھڑی ہو گئی۔

”آپ یہاں۔۔۔۔۔!“ وہ ابھن آئینہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم جہاں میں وہاں۔“ وہ دھیس سے نکلتا ہوا تھا۔

”اس کا کیا مطلب ہے؟“ اسے آگ لگ گئی تھی۔

”میں تو آپ کو خالصتاً سمجھ دار سمجھتا تھا۔ بہت انفسوس ہوا آپ کی نا کجی پر۔ پھر بھی سمجھا دیتا ہوں آپ تو ہمارے گھر کو شرف بخش نہیں رہیں۔ تو میں نے سوچا میں یہ شرف اس گھر کو بخش دیتا ہوں۔“ انفسوس سے گردن ہلاتے ہوئے گویا اس نے سمجھایا تھا۔

”میرے کمرے میں کیا کر رہے ہیں۔“ اس نے میرے پر زور دیا تھا۔

”اؤں نہیں، اب سے ہمارا کمرہ۔“ اس نے ٹوٹکا تھا۔

”یہاں سے چلے جائیں۔“ نصیحت سے بولتے اس نے دروازے کی سمت اشارہ کیا۔

”ٹھیک ہے میں ہی چلی جاتی ہوں۔“ اسے یونہی جتے دیکھ کر وہ دروازے کی طرف بڑھی مگر وہ تیزی سے راہ میں حائل ہوا تھا۔

”میں شوہر ہوں تمہارا۔“ اس نے جتنا یاد اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”بولو، کیا تم اسے جھٹا سکتی ہو؟“ اور وہ جانتی تھی تو اس حقیقت کو نہیں جھٹا سکتی تھی سوا ب کچل کر رہ گئی۔
 ”مجھ سے لگاؤ نہیں کرنا چاہتی تھیں تو انکار کر سکتی تھیں۔ کسی نے تمہارا ہاتھ پکڑ کر تو دھتکا نہیں کرائے تھے۔“
 وہ اس کی مانگ پر نظر میں جمائے چنچا کر بولا تھا۔
 ”بعض اوقات مجبوری بہت کچھ کر لیتی ہے۔“ اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔
 ”میں ایسی کئی مجبوری کو نہیں مانتا۔ شادی زندگی کا اہم فیصلہ ہوتا ہے اس وقت اہم مسئلہ تمہارے تحفظ کا تھا۔ تم انکار کا حق رکھتی تھیں کہ دیتیں تو شاید آج سزا و جہان کے بجائے سسر جڑو سلیمان ہوئیں۔“
 ”اگر مجھے علم ہوتا کہ میرے پاس دوسرا آتش ہے تو یقیناً کر دیتی۔“ بنا سوچے کچھ غصے میں بولتے وہ رکی نہیں تھی۔ اس کی بات پر وہ سر تاپا سا لگ گیا تھا۔
 ”ہونہ اس سے پہلے کبھی بائیس کو اپنی قیمتی بھائی کا خیال نہیں آیا تھا۔“ غصے سے پروں اڑتے اس نے سر جھٹکا تھا۔
 ”لاؤنگ میں آکر اس نے مہنا کر کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا وہ شاید سو گئی تھیں۔“
 ”میری نیند حرام کر کے خود مجھ سے سو گئیں۔“ اس نے غصے سے سوچا اور صوفے پر دراز ہو گئی۔ اس کے خیال میں وجدان کو انہوں نے ہی بلایا تھا جو کہ لگتا ہی نہیں تھا۔
 ساری رات سوئی جا کی کیفیت میں بے آرامی میں لڑی تھی۔ جگر کی اذائیں ہوئیں تو وہ اٹھ بیٹھی۔ وضو کر کے اس نے نماز پڑھی اور پھر اپنے کمرے کا لاک آکھٹی سے کھمایا تھا۔ سامنے ہی وہ اس کے آرام دہ بستر پر خواب خرگوش کے حرے لے رہا تھا۔ اس کا دل جل کر رہ گیا۔ صوفے پر سترے سترے سوئے جسم اکڑا ہوا تھا۔ کمرے میں زبرد کے بلب کی دھندلکی ہوئی تھی۔ اس نے اسی دھندلکی میں اپنی چیزیں ارنج کی تھیں۔ روزانہ وہ جگر پڑھ کر کچھ دیر لکھتی ہی پھر اس کا کام ہوتا تو وہ دیکھ لیتی مگر آج۔ اس نے حسرت سے اپنے بستر کو دیکھا تھا۔ غصے کی ایک نئی لہر اٹھی جو اس نے ہاتھ روم کا دروازہ زور سے چکا تھا۔
 ہاتھ لینے کے بعد اس نے ٹیلے بال تو لیے میں لیٹے دوپٹے کو اپنے چاروں طرف پھیلاتی وہ جھٹلا گئی تھی۔ اس نے اپنے ہی کمرے میں اسے ابھی کر دیا تھا۔ وہ کمرے سے باہر آئی تو وہ موجود نہیں تھا۔ شکر ادا کرتے وہ کیلے بالوں کو تو لیے سے رگڑنے لگی۔ اپنے کپڑے لٹالنے کے لیے اس نے وارڈروب کھولی اس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ وارڈروب میں ایک سائیز اس کے کپڑے لگے تھے۔ کل سے اب تک وارڈروب کھولنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس لیے اسے علم نہ ہو سکا تھا۔ اس نے وارڈروب کا دروازہ زور سے بند کر دیا تھا۔
 ”تو کیا اب یہ میری زندگی میں زبردتی داخل ہو گا۔“ اس نے سوچا چنچ کر کے باہر نکلی تو وہ کمرے میں موجود تھا۔
 ”گڈ مارننگ ایڈ جیسٹکس۔“ اس کے وارڈروب سے اپنے کپڑے لٹکا کر اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔
 ”جیسٹکس۔“ وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔ ”کیا یہ میری وارڈروب زبردتی اٹھیا کر مجھے جیسٹکس کہہ رہا ہے۔“ اس نے سوچا۔
 ”تمہارے دروازہ پھٹنے پر میری آنکھ کھل گئی ورنہ نماز قضا ہو جاتی۔“ اس نے پلٹ کر ہاتھ روم کے دروازے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ انکو رکتی جلدی جلدی بالوں میں برش چلائے گی۔
 ”میرے کپڑے پر نہیں کر دیتا۔“ حکم صادر کرتا وہ ہاتھ روم کی جانب بڑھا تھا۔
 ”اپنے ہاتھ خود ہلا میں۔“ اب انکو نہ ہوا تو وہ کچل کر بولی۔

”کیوں نہ تو یہ یوں کافر نہیں ہوتا ہے۔“ وہ جاتے جاتے واپس پلٹ آیا۔
 ”میں ایسے کسی فرض کو نہیں مانتی۔“ اس نے آئینے میں اس کا کس دیکھا۔
 ”کیوں تم یہی نہیں ہو؟“ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور جو تھا وہ دینا نہیں چاہتی تھی۔
 ایک بار پھر اس کا سر جھٹک گیا۔
 ”کپڑے پر نہیں کر دیتا۔“ وہ دوبارہ دہراتا چلا گیا۔ کچھ دیر وہ آئینہ دیکھ کر کپڑوں کو تذبذب سے دیکھتی رہی۔ صبح صبح کبھی کبھی قسم کی بدحرکی سے بچنے کے لیے اس نے استری کا لگ لگایا تھا۔
 پر نہیں کیے ہوئے کپڑے آئینہ دیکھ کر موجود تھے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ در آئی۔ بند پر پڑا تو لیلہ اٹھا کر وہ اپنے بال رگڑنے لگا۔ تو لیلہ گیا تھا غصے میں وہ اسے اسٹینڈ پر لٹکانا بھول گئی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے تو لیلہ کو گھسا اس میں اس کے بالوں کی خوشبو سی ہوئی تھی۔ ایک بار پھر ایک بھر پور مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر در آئی تھی۔
 ”آپ نے بلایا ہے انٹیں۔“ شدید غصیلے لہجے میں وہ ٹیبل لگاتی مہناز سے مخاطب تھی۔
 ”ہم۔“ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔
 ”کیوں؟“ اس کی بیٹھانی پر بے شمار ٹیل پڑ گئے۔
 ”تم ہی نے مجبور کر دیا تھا مجھے۔“
 ”آپ کو کیا لگتا ہے کہ آپ انٹیں زبردستی میرے سر پر سوار کریں گی تو کیا میں یہ رشتہ قبول کر لوں گی؟“
 ”یہ باتیں بعد میں کریں گے پہلے ناشتہ کر لو۔“ انہوں نے ناشتے کی طرف اشارہ کیا۔
 ”مجھے بھوک نہیں ہے خدا حافظ۔“ جلتے ہوئے لہجے میں بولتے اس نے اپنا بیگ اٹھایا تھا۔
 ”بچے کر سکون سے ناشتہ کر لو۔“ انہیں ڈراپ کر دوں گا۔“ بولتا ہوا وہ اس کے کمرے سے برآمد ہوا تھا۔
 ”تو جیسٹکس مجھے صبر ہو رہی ہے۔“ اس نے دانت پیچے مہناز نے بخور اس کے پھولے ہوئے چہرے کو دیکھا۔
 ”تم نے اسے کچھ کہا۔“ اس کے جانے کے بعد وہ وجدان سے مخاطب ہوئیں۔
 ”نہیں تو۔“ اس نے ٹیبل میں گردن ہلاتی پھر جیسے کچھ کر سکرایا۔
 ”اپنے کپڑے پر نہیں کرائے تھے؟“
 ”زبردستی۔“ انہوں نے اسے گھورا۔
 ”آپ نہیں جانتیں کہ آپ کی بہن میری کھیر ہے پر غرمت کریں بہت جلد سیدھی ہو جائے گی۔“ اس نے جیسٹکس کی طرف دیکھا۔
 ”وہ میری بہن سیدھی غرمت تو نہیں ہے نہیں ہو۔ میں نے جنہیں اس لیے تو نہیں بلایا کہ تم اس کے ساتھ زور زبردستی کرو۔ آرام سے کبھی تو سمجھایا جا سکتا ہے۔“ انہوں نے سر زدن کی۔
 ”آپ کر رہی ہیں ٹال ڈھانی مادے آرام سے بات کچھ خاص افاقہ تو نہیں ہوا۔“
 ”دیکھ لو زبردستی سے کہیں تم اس کو خود سے ختم نہ کر دو۔“ انہوں نے غر مندگی سے اسے دیکھا۔
 ”ایسا نہیں ہو گا انشا اللہ۔“ وہ جیسے کھسکا کر کھسکا کر کھسکا کر گیا۔
 ”.....“
 وہ آفس سے واپس آئی تو مہناز گھر پر نہیں تھیں۔ اپنے پاس سوچا وہ چالی سے لاک کھول کر وہ اندر آئی تھی۔

باعث اسے خند آگئی تھی۔

”نورا اٹھ جاؤ۔“ اس نے ہولے سے اس کا شانہ ہلایا۔

”میں نہیں جا رہی آپ چلے جائیں۔“ اس نے مندی مندی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور کروت ہل لی۔

”یہ کون سا نام ہے سونے کا اٹھو جلدی۔“ اب کی بار اس نے زور سے ہلایا تھا۔

”میں نے کہا ناں مجھے نہیں جانا۔“ وہ صف میں اٹھ بیٹھی۔

”اور میں نے بھی کہا ہے ناں کہ چلتا ہے۔“ بیڈ پر خیم دروازہ ہو کر ہاتھ پکڑ کر اس نے جھکے سے قریب کیا تھا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹتی ساری حیات بیدار ہو گئی تھیں۔ بندہ ہوتی آنکھیں پوری کھل گئی تھیں۔ مندی مندی وہ پکر بد بدائی اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ لاؤنج میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ کمرے سے برآمد ہوئی تو اسے دیکھ کر باہر جانے کے خیال سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ اس نے جدید تراش فرش کا نیلے رنگ کا جارچٹ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ چہرہ دھوا دھلا کسی بھی قسم کی آرائش سے پاک تھا۔ بال بیڈ میں جکڑے ہوئے تھے۔ جیواری کے نام پر تو کوئی چیز نہ تھی۔ کپڑے بھی شاید فیکٹوں کے باعث بدلے گئے تھے۔ وہ اسے پہلی بار باہر لے جا رہا تھا اور یہ اس کا اہتمام تھا۔ اس سے لاکھ درجا چھا تو وہ آفس جاتے ہوئے تیار ہوئی تھی۔

”چھوڑو میرا سوڈ نہیں ہے۔“

”تو پھر میری خینو کیوں حرام کی۔“ وہ چیخ پڑی۔ اس نے تعجب سے اسے دیکھا۔ اب تک وہ اسے ترکی پر ترکی جواب دیتی آئی تھی۔ اپنی ناگواری کا اظہار کرتی تھی مگر چلائی نہیں تھی۔

”والیم کم کرو۔“ اس نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”نہیں۔“ نہیں کم کروں گی تو کر سمجھ رکھا ہے آپ نے مجھے جب آپ کہیں گے تو انھوں نے۔ جب کہیں گے بیٹھوں گی۔“ وہ پہلے سے زیادہ اونچی آواز میں چلائی آنکھوں میں آنسو در آئے تھے۔

”نورا کیا ہو گیا ہے میں نے ایسا کیا کہا۔“ اس کے رونے پر وہ پریشان ہو کر قریب آیا۔ اس نے بے دردی سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

”اف اتنی خوب صورت آنکھوں پر اتنا ظلم۔“ آگے بڑھ کر اس نے بے اعتیاری اس کی آنکھیں چومیں وہ تیزی سے پیچھے ہٹی۔

”آؤ چلیں۔“ اس نے اس کا ہاتھ تھاما۔

”نہیں جانا اب مجھے۔“ اس نے ہاتھ چمڑا جاپا مگر وہ ہاتھ تھامے آگے بڑھ گیا اور وہ میکاٹکی انداز میں اس کے ساتھ ہنسنے چلی گئی۔

☆.....☆

”آج میں تمہیں ڈراپ کروں گا۔“ وہ ناشتہ کرتے ہوئے بولا۔

”نہیں میں۔“ اس نے بولنا چاہا مگر وہ اس کی بات کاٹ گیا۔

”پلیز نورا ہر بات پر آرگے ضروری ہے کیا۔“ وہ جھنجھلاہو خاموش ہو گئی۔

وہ ستر روی سے ناشتہ کر رہا تھا اسے لگ رہا تھا وہ بار بار کھڑی دیکھ رہی تھی۔

”آج میری اسپورٹس میٹنگ ہے۔“ اس نے جتایا۔

”آج میری بھی ایک میٹنگ ہے۔“ وہ بولا۔

”آپ کی میٹنگ سے میرا کیا تعلق؟“ اس نے بیزاری سے سوچا۔

”پلو۔“ اٹھ کر اس نے کرسی کی بیک سے اپنا کوٹ اٹھا کر پہنا۔

”اسے ڈراپ کر کے جانے کے بجائے وہ اس کے ساتھ اتر آیا تھا۔ مگر قدرے حیرت سے اس نے اسے اپنے پیچھے آتے دیکھا۔

”آپ۔“ وہ میٹنگ روم تک اس کے ساتھ آیا تھا اس نے پوچھنا چاہا مگر تب تک وہ دروازہ کھول چکا تھا۔

”سوری سرا۔“ نشست پر بیٹھے اس نے اپنے ہاس کو دیکھا۔ وہ پانچ منٹ لیٹ تھی۔

”اس آل رائٹ مس نور۔“ انہوں نے کہا۔

”ایم ساری الیوری دن آپ لوگوں کو انتظار کرنا پڑا۔“ نور کے مقابل جیسے پر بیٹھے اس نے طائرانہ نظر سب پر ڈالی وہ انجمن مجری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اس او کے مسٹر وجدان! اتنا تو چلتا ہے۔“ اس کے ایم ڈی مسٹر کمال نے کہا۔

”پہلے میں انٹر ویشن کرادوں۔ یہ ہیں حسین انٹر پرائز کے ایم ڈی مسٹر وجدان حسین ہماری کمپنی نے حال ہی میں ان کے ساتھ پارٹنرشپ کی ہے۔“ اس کے بعد وہ فردا فردا سب سے اس کا تعارف کرانے لگے۔ نور کو اپنے لالچ میں بہنے پر حیرت ہوئی حسین انٹر پرائز کی قائل کئی بار اس کی ٹیبل پر آئی پر اس کے اوپر کے نام پر اس نے دھیان نہیں دیا تھا۔

”یہ کس نور احمد ہیں ہماری برانچ کی اکاؤنٹس منیجر۔“ انٹر وڈیوس کراتے وہ اس تک پہنچے۔

”بات کانٹنے کے لیے معذرت۔“ یہ یہ کس نور احمد نہیں مسٹر وجدان حسین ہیں۔“ ان کی بات کاٹ کر وہ سکرارتے ہوئے بولا۔

”رنگی۔“ انہیں خوشگوار حیرت ہوئی اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”آپ نے بتایا نہیں نور کہ حسین انٹر پرائز کے اوپر آپ کے سپنڈ ہیں۔“ انہوں نے پوچھا۔

”مجھے خیال میں یہ اہم نہیں تھا۔ سر میں اس کمپنی میں گزشتہ کئی سالوں سے کام کر رہی ہوں اور میرے نزدیک اپنی جتنی کا فائدہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ چاہے وہ میں حسین انٹر پرائز کے ساتھ کام کرنے سے ہو یا دوسری کسی کمپنی کے ساتھ بزنس کو پرستو سے الگ رکھنے کی قائل ہوں۔“ ہلکی سی سکرابٹ کے ساتھ اس نے جواب دیا۔

میٹنگ کے بعد وہ اپنے روم میں پہلی آئی۔ وہ اس سے پہلے بھی آفس آتا رہا ہوگا۔ بس وہ لالچ میں کام کرتے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی تھی مجھے کیوں بتائیں چلا اسے اپنے لالچ ہونے پر خفا رہا تھا اور انہوں نے بھی نہیں بتایا۔ وہ کام کرتے ہوئے بھی سوچ رہی تھی۔

وہ دروازہ ناک کرتا اندر داخل ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور وہ بارہ کام میں مشغول ہو گئی۔ وہ کچھ دیر بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ”اتنی لمبی ایجنج ہمارے نے کی کیا ضرورت تھی۔“ سید حاسد حایو تیس ناں کہہ کر مجھے تو ظلم ہی نہیں تھا۔“ اس نے طنز کیا وہ خاموش رہی تھی۔

”بیچ نام ہے چلو گئیں باہر چلتے ہیں۔“ اسے یونی کام میں لگن دیکھ کر وہ پھر بولا۔

”نہیں مجھے بہت کام ہے۔“ اس نے صاف انکار کیا۔

”ٹھیک ہے پھر کچھ آؤ رگرو مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ گہری سانس بھر کر کی بورڈ سے انگلیاں ہٹا کر اس نے ریسورٹ اٹھایا تھا۔

”میں اپنے آفس جا رہا ہوں۔ گاڑی ڈرائیور کے ہاتھ بجا دوں گا۔ تم گھر چلی جانا مجھے شاید آج کچھ دیر جائے۔“ بیچ کے فوراً بند وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

وہ جلدی فاریں ہو گئی تھی اس لیے آفس سے جلدی اٹھ گئی اسے آنا دیکھ کر ڈرائیور گاڑی قریب لے آیا تھا۔

”بی بی جی! کہاں چلتا ہے آپ کے گھر یا صاحب کے گھر؟“ گاڑی میں روڈ پر لا کر وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ وہ چونک گئی۔ اسے سننے میں ہی عجیب سی ہل ہوا تھا۔

”صاحب کے گھر۔“ بے اختیار اس کے منہ سے پھلا۔

”ٹھیک ہے اب جلدی فاریں ہوئی ہوں تو چلی جاتی ہوں ثناء کی طبیعت بھی پوچھ لوں گی۔“ اس نے سوچا۔

مہنازا سے دیکھتے ہی نہال ہو گئی تھیں۔

”میں وجدان کو فون کر دوں کہ وہ بھی ادھر ہی آ جائے۔“ ہاتھوں کے دوران وہ بولیں۔

”میں بس ثناء کی طبیعت پوچھنے آئی تھی، زیادہ دیر نہیں رکوں گی۔“ اس نے وضاحت دی۔

”میں کون سا چھوٹا زبردستی روک رہی ہوں چلی جانا مگر ایک چلی ڈنر کے بعد۔“ وہ مسکرائیں تھیں۔ ابھی فون کر کے بتی تھیں کہ کوئی خاتون چلی آئیں۔ انہوں نے فوراً کا تعارف کر لیا تو بولیں۔

”اے ہے شادی کو چار ماہ ہو گئے تم ویلر کب کرو گی مہنازا اور یہ بھوکو گھر لانا کہ کے بجائے تم نے وجدان کو رخصت کر دیا ہے کیا۔“

”ارے نہیں فریہ! آپ! میں وجدان سے کہہ تو رہی ہوں مگر وہ بہت معروف تھا کچھ دنوں سے۔“ وہ گڑبڑا کر وضاحت دیے لگیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ خاتون کون ہیں کوئی پڑوسی یا شاید کوئی ملنے والی مگر جو بھی تھیں خاص

منہ پھٹ تھیں۔ اس نے ایک نظر مہنازا کے شرمندہ چہرے کو دیکھا اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔ رگڑ کر ملازمہ سے اس نے ثناء کے متعلق پوچھا۔

”اپنے کمرے میں ہیں شاید سو رہی ہیں۔“ وہ بولتی ہوئی آگے بڑھ گئی اس کے کمرے میں جانے کا ارادہ ملتوی کرتے وہ لان میں چلی آئی لکڑی کی بیچ پر بیٹھ کر وہ دلچسپی سے موروں کے منجرے کو دیکھنے لگی۔

”مجھے تو کچھ نہیں آتی۔ ان کی جو بھی بات تھی۔ اب ختم کریں۔“ ثناء کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا کچھ فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی جس کا آدھا سلائیڈنگ دور ہٹا ہوا تھا۔ یہ تو جاگ رہی ہے۔“ وہ کھڑکی ہوئی مگر پھر صدمہ کر واپس بیٹھ گئی۔

”پہلے مایہ جاری وہاں رہ کر ان کی خیریں کر رہی تھیں۔ اب وجدان بھائی۔“ موضوع گفتگو بدلتا ہی جاتی۔

”وجدان بھائی کیسے بڑس کر انسرز سے گزر رہے ہیں ایسے میں انسان کو گھر کا سکون بھی حاصل نہ ہو۔“ انہیں کچھ تو سوچنا چاہیے مجھے تو ان پر ترس آتا ہے کیا قسمت پائی ہے انہوں نے پہلے رائے جیسی بیوی ملی اب نور۔“

”نور بھائی اور رائے میں فرق ہے۔ انہیں لپیٹ کر دے۔“ ثناء کی آواز آئی۔

”کوئی فرق نہیں ہے اس سے شادی کر کے بھی انہیں کوئی خوشی نہیں ملی تھی۔ ان سے شادی کر کے بھی کوئی

نہیں تھی۔“

”انہیں قصہ ہے بس وہ اس گھر سے دوبارہ جھجکت ہوئیں اور پھر اسی گھر کی بیوی بن گئیں۔ وہ بس اس بات کو قبول نہیں کر پار ہی ہوں گی۔“ عثمان نے کتنا بیچ کیا تھا۔

”شکر ہے تم نے مسئلے سے کام لیا اور مجھے رنجش نہیں کیا۔ میں تو تمہارے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ تم نہیں جانتے ان دنوں میری کیا حالت تھی۔“

”نور سے شادی سے انکار کی صرف یہ وجہ نہیں تھی۔ ایک وجہ اور بھی تھی اگر بات صرف میری محبت کی ہوتی تو میں من سے تمہارا نام بھی نہ نکالتا۔“

”تو پھر۔“ ثناء کی آواز حیرت میں ڈوبی تھی۔

”وہ وجدان بھائی کی اولین پسند تھی اور میں اس سے شادی کر کے انہیں استحقاق میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ میں ان سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ نور سے پیار کرتے ہیں رائے سے شادی مت کریں مگر انہوں نے باپ بن کر اپنے

اور میرے بیچ جو فاصلہ پیدا کر دیا تھا میں نہیں کہہ پا رہا تھا۔ انکشاف نے ثناء کے ساتھ ساتھ اسے بھی حیرت زدہ کر دیا تھا۔

”پھر بھی انہوں نے رائے سے شادی کی؟“ کافی دیر بعد اس نے ثناء کی آواز سنی تھی۔

”ہاں کیوں کہ وہ مام کی خواہش تھی اور تم تو جانتی ہو تم تینوں بہن بھائیوں میں وہ سب سے زیادہ ان کے قریب ہیں۔ جب وہ مام سے بدتمیزی کرنے پر رائے کو ملاقات دے سکتے ہیں تو شادی بھی کر لیتی تھی۔“

”وہ تو کو پسند کرتے ہیں یہ بات انہوں نے تمہیں بتائی تھی۔“ ثناء نے پوچھا تھا۔

”نہیں میں نے خود محسوس کی تھی وہ شروع سے ہی خاصے ریزرو طبیعت کے تھے۔ پر جب وہ اچھا نکل کی وفات کے بعد واپس اسلام آباد آئے تھے میں نے ان میں بہت بیچ بیل لگایا تھا۔ پایا کی ڈیجھ نے انہیں وقت سے پہلے بڑا اور سنجیدہ کر دیا تھا۔ وہ بہت کم مسکراتے تھے مگر پھر وہ مسکرانے لگے تھے یونی اپنے آپ بیٹھے بیٹھے

نور کے ذکر پر ان کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں پھر جب ثناء کے دباؤ پر مام نے رائے سے ان کی شادی کا فیصلہ کیا میں نے ان سے بات کر لی چاہی تھی انہیں بتانا چاہتا تھا کہ اسے اقرار تھا کہ اسے وجدان میں کوئی دلچسپی نہیں تھی

ہوتی تو شاید اس سے اتنی لاطمہ نہ رہتی اس نے اس کی کتنی کے ساتھ پارٹنرشپ کی تھی اور وہ لاطمہ اس کی ذات میں بھی دلچسپی نہیں تھی۔ بھی اس کی آنکھوں میں جھانکا ہوتا تو اس کے جذبات سے ناواقف تو نہ ہوتی۔

اسے آج اس کا تعارف کرنا یاد آیا تھا۔ اسے اس کا بے اختیار آنکھیں چومنا یاد آیا تھا۔ اس سے زبردستی اپنے کام لینا یاد آیا تھا۔ وہ اسے اپنی ذات میں انوار کو کرنا چاہتا تھا اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہو چکا تھا۔

وہ اٹھ کر اندر چلی آئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ دونوں بھی ملے آئے تھے۔

”وکیل بھائی۔“ عثمان نے خوش دلی سے کہا وہ سگڑا دی۔ ثناء اس سے مکمل کر حال احوال لینے لگی۔ لگ

تی نہیں رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ اسی کے متعلق سچے سچے میں گفتگو کر رہی تھی مگر کچھ ایسا غلط بھی تو نہیں کر رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں وجدان بھی آ گیا تھا۔

”ثناء تو لیو پر ہے تم گھر میں کیا کر رہے ہو؟“ وہ مسکراتے ہوئے عثمان سے مخاطب تھا۔

”ثناء کو میری خدمت کی ضرورت ہے۔“ اس نے پیار سے بیوی کو دیکھا۔

”زن حریہ کی کے سارے بیکار تو ڈیڑے تھے۔“ اس نے ہنسنے ہوئے لطیف سا نظریا۔



”مما یونودیت آج کلاس میں سب نے میرے لیے کلیپ کیا۔“
 ”رنگا کس بات پر؟“ ماں نے بیٹے کا چمکتا چہرہ دیکھ کر اشتیاق سے پوچھا تھا۔

”نچر زوے پر میں نے ڈیویٹ کی ان مائی لون دروازات واز ڈیویٹ بٹ آئی ڈیویٹ اینڈ سب نے کلیپ کیا، نچر نے کہا آپ بہت خوبصورت ہیں۔ آئی ملی پراؤڈ اس جسٹ بی کوز آف یو لو یو ہما۔“ عزہ اس نے کاچی آواز میں کہا تھا۔ بیٹے کے خراج تحسین پر اس کے پاس چند لفظ بے شکل تھے کہ بیٹے کی چمکتی آنکھیں اور لہجہ کے اندر بول کی شخص کا تس تھا اس کے سامنے ہمیشہ کی طرح وہ خاموش تھی۔
 ☆.....☆

”نگارش۔۔۔ نگارش دروازہ کھولو۔“ دستک سے وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔ دوسری طرف دیکھا کوئی نہیں تھا۔ رات کے بارہ بجے اچانک کیا ہوا جلدی سے دروازہ کھولا کہ ایک ایک اس پر پھولوں کی برسات ہوئی تھی۔
 ”پپی اینیورسری بھابی! پلس کزن، پلس دوست۔“ رباب نے گلے لگا کر دوش کیا تھا۔
 ”اودہ یہ آپ سب کی پلاننگ تھی۔ ڈرا دیا مجھے۔“ اس نے سب سے دشنز لی تھیں۔ چھ ماہ کے عزہ کو لیے



کمرے میں آئی تھی۔ اسے معلوم تھا اس کا شریک سفر ہمیشہ کی طرح اس کے ہم قدم ہے۔ بچے کو لانا کر بھلی تو وہ گھنٹوں کے بل اس کے سامنے تھا۔ نگارش نے مسکرا کر اسے ہاتھ تھام دیا تھا جس میں خوب صورت رنگ پھنکی تھی۔

”پہلی اینڈرسن کی مفتی عالم ہو صرف تین سال ہوئے ہیں اور تم بھول گئیں۔“

”سوری مجھے یاد تھا مگر فرینڈ آئی۔“ تھینکس آپ کو یاد تھا۔ ”شادی سے پہلے اس کے نام کے ساتھ بھائی کا لقب لگائی تھی مگر شریک سفر بن کر بھی اس کا نام نہیں لیا تھا۔“

”سفر نقوش اعظم میں خود پر گزرنے والا یہ حادثہ کبھی نہیں بھول سکتا۔“ اس نے عجیبی سے کہا تھا۔ ”کیا یہ حادثہ تھا آپ کے لیے۔“ وہ جھپکی تھی۔

”ہم بہت خوب صورت حادثہ۔“ ”اچھا سو جائیں مجھے نیند آ رہی ہے۔“ اس کی شوقی پر جو نیند سوار ہوئی تھی وہ ابھی طرح جانتا تھا۔

☆ ☆ ☆
”مما اور سیمر آئی کل آپ نہیں آئیں گی۔“ بچے نے ماں کو خوش کار حیرت سے دیکھا تھا۔

”حسن میری جان ہاؤ کوؤ آئی فور گیٹ اٹس ہیڈش ڈے۔“

”بٹ ممما! آپ اکیلی آئی ہیں اور یہ ہیڈش ڈے ہے۔“ حسن نے مصحوبیت سے کہا تھا۔

”بیٹا آپ نے پراس کیا تھا۔ آپ یہ سوال نہیں کرو گے۔“ ماں نے بے بسی سے بچے کو دیکھا تھا۔

”آئی تو ممما پلیس وی آر کیٹنگ لیٹ۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامے اسکول میں داخل ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

”آپ سے کس نے کہا ہے اتنا کام کرنے کو حد ہوتی ہے کھانے پینے کا ہوش نہیں رہتا آپ کو۔“ اس کے صے کے جواب میں وہ مسکرا دیا تھا۔ وہ تھلا کر

جاری تھی جہاں بابا تھا اس کی گرفت میں تھا۔ ”چھوڑیں ممد کچھ لیں گی۔“ وہ جھجھلائی تھی۔

”بالکل بیوی میٹرل ہو، کوئی کہہ سکتا ہے ماسٹر ان فزکس ہو، ایک پیر مائل کی وائف ہو میری جان ہو۔“ آخر تک وہ شوخ ہوا تھا کہ رہا باب ڈانگ ہال میں آئی تھی۔ دونوں سیدھے ہوئے تھے۔

”خیریت بھائی صبح صبح اتنا روئیں طبیعت ٹھیک ہے۔“ ”کہاں یا رہا جب اتنی معصوم بیوی ہو تو طبیعت اکثر رو میٹنگ رہتی ہے بدل کرتا ہے کہ۔“

”اب آپ دونوں ہی کریں ناشتہ۔“ دونوں کی شرارت پر نگارش واک آؤٹ کر گئی تھی۔ وہ دونوں ہی اس کی بولکلا بٹ انجوائے کر رہے تھے۔

☆ ☆ ☆
”سفر خیز آپ کا بیٹا بہت جھینس ہے۔ جس کا کریڈٹ آپ کو جاتا ہے مگر ایک استاد ہونے کے باطن ہم بچوں کی نفسیات سمجھتے ہیں۔ مجھے آپ کے فیملی برائیم سے کوئی کسٹرن نہیں ہے مگر صحن اپنے والد کی کمی محسوس کرتے ہیں۔“ بچے کی کلاس ٹیچر نے جس کی کا احساس دلایا تھا وہ بخوبی واقف تھی۔

”جی آئی کین اظہر اسٹینڈ میں پوری کوشش کروں گی۔“ آج پھر وہ بے بسی کی انتہا پر تھی۔ جب بچے کی کالی پر ٹیچر نے اس کا ہملہ دکھایا تھا لفظ ”دعہ غلطی“ پر کہ ”پاپا کے بارے میں پوچھ کر میں ممما سے دعہ غلطی نہیں کرتا۔“ یہ چند الفاظ سالوں بعد اسے اپنے فیصلے پر پچھتاوے کا احساس دل رہے تھے۔ وہ سوچنے پر مجبور تھی کہ کیا اپنے ساتھ بچے کو بھی تہائی کا عذاب دینا چاہیے تھا۔ شاید یہ سزا اسے اکیلے کائنات چاہیے تھی۔ بہر حال اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

”ایک تو آپ کے ساتھ کہیں باہر جانا بہت مسئلہ ہے۔ آپ تو فخر سے بیٹھے ہیں ہم مجب کارٹون بنے

ہوتے ہیں۔“ رہا باب نے نقوش کو گھورا تھا جو اپنے فیئر کوٹنا کر آیا تھا۔

”یار انٹی ٹیڈی وچ سے ہم ہیں قدر کرنی چاہیے ان کی اور۔“

”ہائے نقوش کیسے ہیں آپ کین یو پلیز ٹیک سیٹلی وڈی۔“ ماذرن ازم کا شاہکار لڑکی اس کی اجازت سے قلم ہی کمال بے تکلفی سے اس کے چہرے سے چہرہ ملا کر سیٹلی لے چکی تھی۔ ممما بابا بہن کے سامنے یہ مظاہرہ اسے ٹھگ کر گیا تھا۔ جب کہ اس کے برابر اس کی جان اس کی بیوی نگارش بیٹے کو لیے بیٹھی تھی۔

”بہت ہی نامعقول فیملی ہے تمہاری کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کر سکتے تم۔“ اعظم علی نے اسے لڑا تھا۔

”بابا ہر طرح کے فیئر ہوتے ہیں۔ سب کو فیس کرنا پڑتا ہے۔“ وہ قدر سے شرمندہ تھا۔

”بھائی ذرا خیال کریں آپ کو یاد ہے نا آپ کی ایسی فیئر اور پو پو شپ سے گھبرا کر نگارش آپ سے شادی کرنے سے انکاری تھی۔ یہ نہ ہو کہ آپ پھر مشکل میں پڑ جائیں۔“

”اللہ نہ کرے رہا باب! کیسی اوجاہات باتیں کرتی ہو تم۔“ ثمنین نے اسے ڈانٹا تھا۔

”بھولنے دیں اسے ممما! میں جب پہلے نگارش کو سنبھال سکتا ہوں تو اب تو یہ میری بیوی ہے مکمل میری دسترس میں۔“ نقوش نے قدرے شوقی سے دمکی دی تھی۔ اسے جو ابھی تک اس منظر کے زیر اثر خاموش تھی۔

”خبردار میرے سامنے میری بیوی کو دمکی دی تو خاموشی سے کھانا کھاؤ۔“ اعظم علی نے اسے ٹھکر کر کھانا شروع کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”حسن! آپ کس کے ساتھ اسکول سے نکلتے تھے۔ آپ کے دین ذرا پیچیدہ نے مجھے کال کی تھی۔“

خزینہ نے بری طرح ڈانٹ کر پوچھا تھا۔

”ممدو! اگلے کمرہ ہے تھے وہ مجھے جانتے ہیں۔ انہوں نے مجھے اس کمرے میں بھی کھلائی تھی۔ کیا وہ جھوٹ بول رہے تھے؟“ صحن نے مصحوبیت سے سوال کیا تھا۔

”بیٹا! انہیں چھوڑو آپ تو انہیں نہیں جانتے ناں اس طرح کسی کے ساتھ نہیں جاتے جب تک ممما نہ کہیں تھی بار سمجھایا ہے۔ خبردار! آئندہ یہ حرکت کی تو جان نکال دی آپ نے میری۔“

”سوری ممما! آئی ول ٹوروڈ ویت۔“ خزینہ گہری سوچ میں تھی۔

”کون ہے وہ شخص جو مکمل باخبر تھا۔“

☆ ☆ ☆
”نگارش! یہ دیکھو بھائی کی کسی فنن نے کتنی ساری پکچرز اور انفارمیشن ڈالی ہیں سر“ رہا باب نے لب تاب اس کے سامنے کیا تھا۔ وہ عکس پڑھنے لگی۔

ایک لائن پر نظر ٹھہر گئی۔

”نقوش آئی لو یو۔“ لڑکی کی تصویر سے لگ رہا تھا اس نے پہلے بھی اسے دیکھا ہے۔

”کچھ نہیں ہوتا یہ لفظ تو لوگ ٹھوک کے حساب سے بولتے ہیں۔ تم میری سرمت ہو جانا۔“ رہا باب نے اسے ٹھٹھا کیا تھا۔

”ہاں ان کی لائیٹنگ بہت ہے۔“ وہ خود کو سمجھاتی اٹھ گئی تھی۔ حالانکہ نقوش جس فیملی میں تھا وہاں یہ عام تھا مگر جانے کیوں اسے برا لگا تھا اسے نقوش پر اعتبار تھا پھر بھی ہوتے ہیں نا کچھ جذبات کچھ الفاظ فقط کسی خاص کے لیے جسے یوں سرعام خرچ کرنا برا سا لگتا ہے۔ یہی سوچی وہ گیٹ تک آئی تھی کہ گارڈز نے اس کے نام کا کوریڈر کردہ پارسل اسے دیا تھا۔ حیرت سے انجان لڑکی کا نام دیکھا تھا۔ ٹکٹ کے اندر سے

یو ایس لی برآمد ہوئی تھی۔ اس نے فوراً لب تاب اون کیا، انتہائی ماذرن لڑکی کی خوب صورت سیٹلی تھی

☆ ☆ ☆

”آپ کے دین ذرا پیچیدہ نے مجھے کال کی تھی۔“

آ کے اسی لڑکی کے نقوش کے ساتھ کلوز پیچر تھی۔ پھر لگا تار دونوں کی قربت کے شاہکار اس کے دل و دماغ بلا گئے تھے۔ ایک جھماکے سے اسے یاد آیا یہ غریبوں میں سیٹھی پھر ٹھیکس اور اب ان پیکر تک گیا ہے۔ سیٹھی میں شاید نقوش کی رضا مندی نہ تھی مگر یہ تصاویر ان کی ہم آہنگی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ جھٹکے سے شٹ ڈاؤن کر کے شاید وہ باہر جا کر سب کو بلانی مگر وہ رک گئی شاید سب یقین نہ کریں مگر نقوش کو وہ جانتی تھی کس طرح سب کو ششے میں اتارتا ہے۔ سب اسی کو دہاتے لیکن اب وہ اس شخص کا چہرہ برداشت نہیں کر سکتی تھی جو اتنے سال کی رفاقت اور بچنے کے بعد بھی اس کا نہ ہوا ابھی وہ لاہور میں تھا۔ اس کے آنے سے قبل ہی کچھ کرنا تھا۔ مسلسل سوچتی مستقل رو رہی تھی۔

☆.....☆

”حسن یہ گفٹ کس نے دیا آپ کو؟“ بیٹے کے ہاتھ میں موجود ریوٹ کارڈ بھی تھی۔ جو عین عام شاہیں پر نہیں مل سکتی تھی۔ ”مما یہ مجھے وہ اسکول والے اکل نے دی تھی لاسٹ ویک۔“

”کیا لاسٹ ویک مگر میں نے تو آج دیکھی ہے۔“

”مما میں چپ کر کھیتا تھا۔ اکل نے کہا تھا آج میں عاقل کو دکھانے لایا تھا سوری۔“ جواب سے پہلے ہی اس نے حسن کو پیٹر مارا تھا۔

☆.....☆

”السلام علیکم بابا! آخرت ایک دن بعد ہی میری یاد آگئی۔ آپ کو۔“

”نقوش! اگر یہ فوراً فلائٹ نہ ملے تو ہاے روڈ نکلو ابھی کہ ابھی۔“ اعظم علی نے بغیر کوئی بات کیے ہدایت کی تھی۔

”بابا! اب ٹھیک ہے امی سے بات کر امیں کیا ہوا ہے۔“

”نقوش! اب ٹھیک ہیں، تم آؤ یہاں بس۔“ اتنا کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

اسلام آباد سے کراچی آتا ہی سڑاس کے لیے امتحان تھا مگر کے لان میں سب موجود تھے اسے سب کے چہرے دیکھ کر قدرے مطمئن ہوا۔

”بابا! اس طرح کیوں بلایا ہے آپ نے مجھے۔ یہاں تو سب ٹھیک ہیں مگر نگارش، نگارش کہاں ہے سو رہی ہے کیا؟“ اس نے اسے تلاش کیا تھا۔ بیٹھ پر تپاک استقبال کرنے والی آج کہاں ہے بھرا می کی زبان سے اس کا قابل یقین خبر نے استقبال کیا تھا۔ وہ اندر تک مل گیا تھا۔ تین دن میں ایسا کیا ہوا کہ وہ دل میں ہر یکہ موجود ہے مگر نظروں سے کوسوں دور۔

☆.....☆

”مما! آپ ابھی مت جائیں۔ اکل آنے والے ہوں گے میں نے انہیں رات میں ہی کال کر دی تھی کیوں کہ آپ ناراض تھیں ناں۔“ حسن نے مصومت سے کہا تھا۔

”آپ کے پاس ان کا نمبر بھی ہے۔“ حیرت ہی حیرت تھی اسے مگر حسن کے جواب سے قبل جس شخص نے آکر اسے گود میں اٹھایا تھا وہ اس کے بچوں سے زمینیں کھینچ چکا تھا چند لمحوں تک وہ مفلوج تھی اور وہ اسے کھلی ہانڈہ کر دیکھ رہا تھا۔

”حسن! اھر آؤ کھر چلیں۔“ خزینہ نے بیٹے کو اپنی طرف کھینچا تھا۔

”کیوں مجھ سے نہیں ملیں گی آپ مس خزینہ۔ اوہ

سوری سز نگارش نقوش ملی۔ آپ کو لگا تھا اپنا اور بیٹے کا نام بدلنے سے میں آپ کو حفوظ نہیں سکوں گا۔“

نقوش نے نظریہ اسے سر تاپا گھورا تھا جو غور سے اپنے بیٹے کو اس کی گرفت میں دیکھ رہی تھی۔

”حسن ڈونٹ یو این اھر آؤ۔“ اسے اپنے ساتھ کھینچ کر بمشکل گھر پہنچ کر حسن کو روم میں اس طرح لاکھ کیا تھا جیسے وہ سیار یہاں بھی آکر اس کے بیٹے کو قید کر لے گا اس کا شک درست تھا وہ اپنے چھوٹے سے گھر میں اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیوں آئے ہیں آپ یہاں کوئی تعلق نہیں ہے میرا آپ سے نہیں جانتی میں آپ کو۔“ دہی دہی آواز میں پچھتی تھی۔

”بالکل، مجھے بالکل نہیں جانتی ہو مگر نہ یہاں نہ ہو تمیں تعلق تم سے نہیں ہے یہاں اپنے بیٹے مزہ نقوش علی کو لینے آیا ہوں۔“ اہلی آواز میں فرمایا تھا۔

”خبردار! آپ نے میرے بیٹے۔“

”میرے بیٹے نہیں ہے تمہارا بیٹا، میں اسے ہر قیمت پر لے جاؤں گا۔ جاے اس کے لیے مجھے تم پر انوکھا کام کرنا پڑے، کیوں کہ آپ کے پاس نکاح نامہ نہیں ہے جزوہ کی ماں نقوش تھی۔“ خزینہ نے آئی ڈونٹ کیئر تم عدالت جاؤ یا تھانے۔“

”ہاں آپ کو کیوں فرق پڑے گا۔ جب فرق نہیں پڑا جب آپ نے پانچ سال بعد بھی دھوکا دیا تو اب۔“

”ہاں نہیں پڑنا فرق تم ہو کیا آخر جی چاہتا ہے۔ کل تک صرف کل تک کا وقت سے میرا بیٹا میرے حوالے کر دو روزہ تم واقعی مجھے نہیں جانتی ہو۔“

اسے وارن کیا تھا پھر پلٹ کر آیا تھا۔

”اور ہاں یہاں سے فرماری کو شش با کام ہوگی باہر میرا گمن میں کھڑا ہے۔“

”آپ ایسا نہیں کر سکتے مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

وہ حیرت زدہ ہی سسک اٹھی تھی۔

”آزما لیتا اور یقین تو تمہیں کبھی تھا ہی نہیں مجھے پر۔“ تھی تو خیر میں اپنی صفائی دینا اپنی تو ہیں بھینتا ہوں، وہ بھی تمہارے سامنے۔ کل تک کا ٹائم ہے تمہارے پاس، مائنڈ اٹ۔“ بہت کچھ باور کراتا وہ گیا تھا۔ دن سے رات رات سے صبح تک اسے کچھ آیا تھا۔ علی صراط پا کر گنا کیا ہے، کتنی ہی بار وہ چپ کر اور جزوہ کو گلے لگا کر روئی تھی۔ گزشتہ سالوں کا عرصہ اسے اپنا شہر چھوڑ کر کافی سکون میں گزارا تھا کہ وہ اس شخص کی دھڑکن سے باہر ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یقین پختہ ہوا تھا۔ اب جس انداز میں نقوش اس کے سامنے تھا وہ اس کی بساط سے بہت آگے تھا۔ دو پہر کو ڈورنٹل رنگ ہوئی تھی۔ اسے لگا تھا اس کا دل رک جائے گا۔ جزوہ کو لاکھ کر کے گیٹ کھولا تھا۔ وہ شخص کسی آسیب کی طرح سامنے موجود تھا۔

”آنا تو صبح ہی تھا کیوں کہ میرا بیٹا۔“

”نہیں ہے آپ کا بیٹا۔“ وہ بلند آواز میں چپتی تھی۔

”شٹ اپ۔“ وہ بھی دہاڑا تھا۔

”نقوش کیا کر رہے ہو لوگ جمع ہو رہے ہیں، اندر چلو۔“ اعظم علی نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔ نگارش چھوٹے سے علاقے میں رہ رہی تھی۔

”لما! آپ کو اب بھی اس سے ہمدردی ہے۔“

”نگارش! ہمیں اندر تو آنے دو تمہارے ماں باپ بھی باہر کھڑے ہیں۔“

”آپ لوگوں کو جو کہتا ہے یہیں کہہ لیں۔“ سب انتہائی حیرت میں تھے۔ اس کی بدقسمتی پر اس سے پہلے کوئی کچھ کہتا تھا نقوش ایک جھٹکے سے اندر داخل ہوا تھا۔ جزوہ کو آواز دی تھی جس کا جواب جزوہ نے فوراً دیا تھا۔ نقوش نے اسے باہر نکالا تھا۔ نگارش نے کوئی حراحت نہیں کی تھی فقط آنکھیں موندھے آنسو بہا رہی تھی۔ جیسے وہ آخر وقت میں سب کچھ ہار گئی تھی۔ رہا اب بے اختیار اس کے گلے لگ گئی تھی۔

”کیوں کیا نکارش! یہ سب تم نے ہم سب کا کیوں نہیں سوچا، کیا مجھ کو نہیں تھا ہم پر۔“

”ہاں نہیں تھا اب بھی نہیں ہے اور اس شخص پر تو بالکل بھی نہیں ہے۔“ اس کے ہاتھ جھٹکتی دور ہوئی تھی۔

”نکارش! کس طرح بات کر رہی ہو نقوش۔“

ایک تو نقوش کی اور بدلتی ہی کر رہی ہو۔ ”ممانے اسے لٹو کا تھا۔“

”ممانے سب کون ہیں انکل آپ ممانے کیوں لڑ رہے ہیں۔“

”مزہ مانی سن! آئی ایم یو قادر۔“ بہت کڑواہٹ تھا اپنی ذات کو اپنے خون پر اور کرنا یقین دلانا کہ تم میرے ہو، نقوش کا دل چاہ رہا تھا اس کا حشر کرو۔ جس کی وجہ سے بیٹا باپ سے پوچھ رہا تھا تم کون ہو؟“

”ممانا اڑا لڑو؟“

”نہیں اب آپ انہی کے پاس رہیں گے۔ آپ لوگ مزہ کو لے جائیں میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ سفاکی کی انتہا کی تھی۔

”نکارش اپنے ماں باپ کو کس طرح چھوڑ سکتی ہو۔“ اس کے بابا نے حیرت سے کہا تھا۔

”خدا را میرے ساتھ چلو تم میری اکلوتی اولاد ہو، کچھ تو خیال کرو اپنی مانتا کا احساس ہے تم بھی تو میری اولاد ہو۔“

”ٹھیک ہے میں چلتی ہوں آپ کے ساتھ مگر میرا تعلق صرف آپ لوگوں سے ہوگا۔ مزہ میرے ساتھ رہے گا۔“

”مزہ میرے پاس رہے گا تم نے تعلق توڑ لیا تھا۔ بہت پہلے مجھ میری طرف سے بھی ختم کر مزہ۔“

”ٹھیک ہے آپ لوگ جاسکتے ہیں۔“ اس نے بات کالی تھی۔

”نکارش ٹھیک ہے مزہ کو تم رکھ لینا مگر ہم اس سے ملیں گے تم بے شک کسی سے تعلق نہ کرنا۔“ اعظم ملی

نے نقوش کو ٹھنڈا کر کے جوڑ دی تھی۔

”چلو نکارش۔“ بابا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ پھر رو دی تھی۔ جس کا نقوش پر کالی اثر ہوا تھا۔ وہ باہر نکل گیا تھا۔ ان کے گھروں کی دیواریں ملی ہوئی تھیں۔ نقوش اس کا تباہا زخم تھا وہ اکثر سوچتی تھی۔ اب تو بس آنکھوں کے پانیوں کا سبب تھا وہ شخص۔ وہ دیکھ رہی تھی کچھ دنوں سے مزہ کی حرکتیں اور باتیں مشکوک ہیں۔ بھی کھتا رات کو بابا کے ساتھ ہوتا ہے۔ کبھی بابا کا گھر بیٹا رہا ہے، انہی سوچوں میں کہ وہ کیلا دو پستار پر پھیلا رہی تھی۔ لاشعوری طور پر اوپر دیکھا وہ نقوش کی نظروں کے حصار میں تھی۔ نکارش نے نظریں چرائیں اور اندر بڑھ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی اس نے میرے آسودہ کچھ لیے ہوں گے اس کے دیکھنے کا انداز کیا تھا۔ سخر اڑا تا خود پر غصہ کرتی رہی تھی۔

”آپ جیسی کھانسیں کی کھانسیں تو میں بھی نہیں کھاؤں گا۔“

”مزہ خدمت کرو میں تجھے لگا دوں گی۔“ آج نقوش کی پہلی انوائیڈ تھی۔ سبھی وہ بچے نہیں جا رہی تھی اس کی دھمکی پر مزہ سہم گیا تھا۔ مجبوراً اسے آنا پڑا تھا پورے وقت نقوش کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ کھانے کے بعد تائی نے اس کو بھی لاؤنج میں روک لیا۔ اب مزہ کی فرمائش پر خود کو کوس رہی تھی۔

”پلیز ماما سب کے ماما بابا ایک روم میں رہتے ہیں۔ آج ہم بھی بابا کے ساتھ سوئیں گے۔“ ان دونوں کے لیے سب کے سامنے یہ شاک بہت بڑا تھا۔

”شٹ اپ مزہ اینڈ کوٹو سلیپ ناؤ۔“ اس نے سنجیدگی کی تھی۔ سب کی نظریں ان پر تھیں۔ نکارش کی نسبت نقوش اطمینان سے تھا۔

”تو ماما آئی ڈیسا یخینڈ انٹ۔“ مزہ نے دودھ کا گلاس چٹا تھا۔

”بی ہیو یو سلیپ۔“ نکارش نے ہاتھ اٹھا دیا تھا نقوش نے روتے ہوئے مزہ کو اٹھا لیا تھا۔

”اب سے میرا بیٹا میرے پاس ہی رہے گا۔“

”بھبی۔“

”بابا آپ کے ساتھ بھی نہیں مجھے آپ دونوں کے ساتھ رہنا ہے۔ آدرواڑ آئی ہیو نو کو فرام دیتے۔“

”مزہ! کیا بدلتی ہی ہے اندر چلو۔“

”نو۔“

”وئے؟“

”آئی گو و یو آپ میری ایک وٹش بھی نہیں مانتے۔“ مزہ سوز لیا تھا۔ نکارش بڑبڑاتی تھی۔

”میری جان مت تنگ کر دما لوز یو۔“ اس نے جواب نہیں دیا سب اس کی ضد پر حیران تھے۔ وہ باقاعدہ فٹ ہاتھ پر لیٹ چکا تھا۔

”مزہ! اوکے میں آپ کی بات مان رہی ہوں۔“

”ابو جلدی ماما ڈور اس۔“

”نہیں آئی براس۔“ بیٹے میں تو اس کی جان تھی کالے کوں ملے کرنے پر راضی تھی جو ہر ماں اپنی اولاد کے لیے کرتی ہے۔ وہی اولاد اکثر اسے کالے پانی اور تہائی کی سزا دیتی ہے۔ نقوش اب تک اس کے فیصلے پر ملگ تھا۔ کس طرح اس نے نقوش کے گھر سے تنگ کر لیا تھا۔ وہ سبھی جانتی تھی اسے لگا تھا بلور عورت جس مان، وقار، انا کو بچایا تھا۔ آج بلور ماں اپنے ہاتھوں سے خود کی خودی مار دی تھی۔ ماں اولاد کی خاطر دینا ہے لڑائی ہے۔ اسی اولاد کے لیے ہار بھی جاتی ہے۔ وہ سوتے ہوئے مزہ کے پاس بیٹھ کر شدت سے رو دی تھی۔ اپنے برابر نقوش کو دیکھ کر اٹھنے لگی تھی کہ اس نے ہاتھ تھی سے پکڑ کر بٹھا لیا تھا۔ وہ خاموش رہی۔

”کیوں کیا تم نے وہ سب، یہ میں جانتا ہوں، میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔“

”آپ کو حق بھی نہیں ہے۔“

”اب اگر ایک لفظ بھی بولا تو دیکھنا۔“

”خاموشی سے سنو۔“ نقوش نے ہاتھ کو جھٹکا دیا تھا۔

”صد ا کی ہے وقوف عورت ان فیک بکچرز پر یقین کر لیا میری سن سالہ جیتی جاگتی محبت پر نہیں۔ لوگ سائنس کے ساتھ چاند پر ملے گئے، تم اصل نعل نہ پہچان سکیں۔ اتنا اس لڑکی میں اتنا لو تھا تو پانچ سال جنہیں کیوں ڈھونڈتا رہا۔ اب بھی یقین نہیں ہے مجھ پر تو نہ کرو مگر آئندہ کوئی حماقت نہ کرنا۔“ ہاتھ نری سے دبا کر آنسو صاف کیے تھے۔

”آج میں جان لیتی عورت اپنا آپ خود اولاد کے لیے توڑ دیتی ہے۔ بٹھ جاتی ہے۔“ آنسوؤں میں شدت تھی۔

”اچھا بس یا رانا دکھ یاد ہے جو میرے ساتھ کیا خیر چلوا سی وہ سب سائنٹ پر ایک ہی تھیں۔“ اس نے تائب کیا تھا۔

”ایز آفین کی کو لاک کر کریں مگر اپنے کمرے اور حرکات سے کسی کی زندگی برباد نہ کریں۔ وہ بھی انسان ہیں جنہیں فرق پڑتا ہے مسٹر اینڈ مسز نکارش نقوش۔ تمہارے بال اب بھی بہت خوب صورت ہیں۔“ نقوش کا موڈ بدلا دیکھ کر وہ بدک کر اٹھی تھی۔ جس پر وہ لگا ہوں سے وارن کر رہا تھا۔ صبح وہ دونوں ڈانٹنگ ہال میں آئے تو کل کی مزہ کی ضد کا سبب سمجھ آیا تھا۔

”پھوپھو! کیا ایکٹ کیا میں نے دیکھا آپ نے۔“

”تو جینا اسکرپٹ بھی تو رہا اب پھوپھو کا تھا۔“ وہ سب سمجھ گئے تھے۔ رہا اب ان کے تہہ دیکھ کر فرار ہونے کو تھی کہ نقوش نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ نکارش نے کشن مارا تھا۔

”سوری ماما! مزہ کی مصیبت پر سب کلکھلا کر نہیں دیئے تھے۔“

السنہ لہو

حصن مسکرا کر یوں لیں۔

”جیسے جلدی سو گئے تو جلدی اٹھ پاؤ گے ناں۔“
نانو کے کہنے پر ممانے بھی ایک نظر اس پر ڈالی اور نفی
دی دیکھنے لگیں۔

”جی نانو! ہم عاطف سے بات کر کے سوئے
جا رہا ہوں۔“ اس کا دھیان ابھی بھی موبائل پر لگا ہوا
تھا۔

نانو بس ٹی ٹی میں سر ہلا کر رہ گئیں جب کہ ممانے
ایک اچھی نظر اس پر ڈالی اور بڑبڑا میں۔
”ایک تو اس لڑکے کو عاطف کے بتا چکیں نہیں۔“

ان کے یوں بڑبڑانے پر وہ جس پڑا
”مما جان! اتنا پیارا دوست ہے میرا عاطف،
اس سے تو جیلس نہ ہوں۔“ ممانے اسے سمجھ کر

دیکھا۔ پھر اس کی شرارت بھری مسکان پر بے ساختہ
مسکرا اٹھیں۔ ممانے کو مسکراتا دیکھ کر وہ بے اختیار ان
کے گرد بانٹیں ڈال کر ماتھے پر بوسہ دینے لگا اور پھر

نانو کو بھی اسی انداز میں پیار کر کے شب بخیر کہتا ہوا
اپنے کمرے میں سوئے چلا گیا۔ ماں اور نانو کی پیار
بھری نظریں عاقب کا تعاقب کرتی رہیں۔

☆.....☆

صبح صبحی خولہ بڑی خوشی خوشی اپنی ماں سے
پوٹی بندھوا رہی تھی۔ آج وہ اپنے بھائیوں اور بابا کے
ساتھ کھلی دفعتاً اسکول جا رہی تھی۔ وہ ان بچوں میں

سے نہیں تھی جو اسکول جانے کا نام سن کر رونے لگے

دل نگار حسن کی دیوی ملکہ کے عشق میں گونے
گونے ڈوبنا ملکہ سے شادی کے شرط کے مطابق دنیا
کی سب سے بیش بہا شے کی تلاش میں جنگل

ہیا ہیاں، ریگستان و گستان، صحرا و پہاڑ کی خاک چھاننا
کوئی تیسری بار جب ایک شہید محبت وطن سپاہی کا
آخری قطرہ خون لیے ملکہ کی خدمت میں حاضر ہوا

اور اس کے قدموں پر قطرہ خون رکھا تو ملکہ نے
دلفگار کی محبت کو بہت ہی گرم جوشی کے ساتھ قبول
کر لیا اور ایک صندوقچہ منگولیا اور اس میں سے ایک

لورج نکالا جس پر آپ زر سے لکھا تھا:
”وہ آخری قطرہ خون جو وطن کی حفاظت میں
مرے دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے۔“

پریم چند کی کتاب کے آخری طور پڑھ کر ان کے
لب مسکرا اٹھے اور انھیں جھلکا لگیں، ان کا خاندان
تقریباً تین دہائیوں سے ملک کی حفاظت پر مامور

تھا۔ خود وہ بھی آرٹی پبلک اسکول کی پرنسپل تھیں۔ پر
اب تک ان کے خاندان میں شہادت کا رتبہ کسی نے
نہ پایا تھا۔ انہوں نے نظریں ٹیک دیکھ کر سے اتار

کر کتاب پر رکھی اور آرام کی غرض سے بستر کی جانب
چل دیں۔ آج اسکول میں پھر دل پارٹی بھی تھی۔

☆.....☆

”مما! کل صبح مجھے جلدی چکائیے گا۔“ وہ نانو کی
گود میں سر رکھ کر لیٹا ہوا موبائل پر سچ کرتے ہوئے
بولتا۔ اس کی نانو اس کے بالوں کو پیار سے سہلا رہی

جاتے بلکہ وہ تو بہت خوش اور پر جوش تھی۔ اسکول جانے کے لیے آج سے پہلے وہ اپنے تئیں بھائیوں کو اسکول جانا دیکھتی آ رہی تھی مگر آج خود ان کے ساتھ جانے کی خوشی اس کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی۔ ماں کی دعاؤں اور آیت الکرسی کے حصار میں خولہ اپنے بابا اور بھائیوں کے ساتھ اسکول کے لیے روانہ ہوئی۔

”شاہ رخ بیٹا! آپ نے اپنا بیک چیک کر لیا ناں۔“ شاہ رخ آئینے کے سامنے کھڑا کی بائند رہا تھا بھی اس کی امی نے صدا لگائی۔

”جی امی۔“ شاہ رخ نے جواب دیا اور جگر کچھ یاد آنے پر کہنے لگا۔

”امی! آج شام کو میرے دوست میرے گھر آئیں گے مجھے برتھ ڈے دینا ہے۔ آپ ٹھیک اور فرائیز ضرور بنائے گی۔“

”اوکے میری جان! ضرور بنائیں گی اپنے بیٹے اور اس کے دوستوں کے لیے مزیدار ٹھیک اور مہیا کیا ہے آپ کے لیے ایک آئٹل گفٹ بھی رکھا ہے جو شام کو ملے گا آپ کو۔“

”مما دودھ کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے شاہ رخ کے بال سنوارتے ہوئے بولیں۔“

”اوہ! حینک یو ماما لو یو سوچ۔“ شاہ رخ نے ماں سے لپٹتے ہوئے فرط جذبات کے عالم میں کہا۔

”مما لو یو سو سوچ میری جان۔ چلو اب جلدی جلدی دودھ پی لو۔ گفٹ دیر نہ ہو جائے اسکول کو۔“

مما کے کہنے پر شاہ رخ جلدی جلدی دودھ پینے لگا۔ اس کی ماں اسے پیار سے دودھ پینا دیکھنے لگی۔ انہیں اپنا شرمیلا، سیدھا سادھا، حساس اور بے حد محبت کرنے والا یہ بیٹا بے حد عزیز تھا۔

☆ ☆

”امی! دیکھیں میرے ہاتھ میں چوٹ لگ گئی ہے۔ درو بھی ہو رہا ہے بہت مجھے آج اسکول نہیں جانا۔“ شاہ رخ کب سے اپنی ماں سے اسکول کی چٹھی

کروانے کی ضد کر رہا تھا۔

”نہ بنے، چھوٹی چھوٹی چوٹوں سے نہیں گھبرا جاتے۔ آپ نے تو بہت بہادر فوجی بننا ہے۔ بڑے ہو کر دشمن سے لڑنا ہے آپ تو میرے بہادر بیٹے ہونا اور بہادر انسان چھوٹی موٹی تکلیفوں سے نہیں گھبراتا۔“ شاہ رخ کی امی نے پیار سے سمجھاتے ہوئے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

شاہ رخ، ماں کی بات کو سمجھ چکا تھا۔ بھی چوٹ بھلائے اسکول جانے کے لیے جلدی جلدی ناشتہ کر رہا تھا۔

”امی! جب میں بہادر فوجی بن جاؤں گا تو آپ بہت خوش ہوں گی ناں، مجھ پر فخر بھی کریں گی۔ ناں پھر۔“

”سرف میں ہی نہیں میرے بیٹے پوری قوم آپ پر فخر کرے گی۔“ ماں نے مناسے سے چہرے میں بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”عاطف بیٹا! جلدی کرو، آج فخر و دل بھی ہے کہیں دیر نہ ہو جائے۔“ عاطف کی ماما جو کہ خود بھی اس کے اسکول کی پیچھے تھیں کب سے تیار ہو کر اسے آوازیں لگا رہی تھیں۔

”امی! بس پرندوں کو دانہ ڈال دوں۔“ عاطف اپنے پرندوں کے منجھروں میں دانہ ڈالتے ہوئے بولا۔

”بیٹا روز چھاری جب سے دیر ہو جاتی ہے اور دیکھو تو ذرا۔۔۔ میں نے کب سے ناشتہ بنا کر رکھا ہوا ہے اور تم نے وہ بھی نہیں کھایا امی ابھی تک۔“ انہوں نے اس کے ناشتے کی پلیٹ کو ڈھکتے ہوئے ناراضی سے کہا۔ عاطف پرندوں کو دانے ڈال کر مچھن سے اندر آ چکا تھا۔

”امی! آپ نے اپنے ہاتھوں سے ناشتہ بنایا ہے ناں تو تمہیں میں نے کھالیا۔“ وہ انہیں پیار سے

کہیں تھیں کہ بہادر بنوں گا تو سب فخر کریں گے۔ ماما میرا تو نہیں ہوں میں شہید ہوا ہوں اور شہید بس دنیا والوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے ماما میں اوجھل ہوں تو کیا ہوا آپ کے پاس تو ہوں۔ پلیز نہ روئیں ماما۔“ شاہ رخ اپنے پیارے ہاتھوں سے ماں کے آنسو صاف کرتا ہوا بول رہا تھا۔ اس کی ماں اور شہدہ سے رونے لگیں۔ شاید اپنے بیٹے کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی انہیں۔

وہ تئیں بھائی اپنی پریوں جیسی بہن خولہ کی تصویریں دیکھ کر بلیک بلیک کر رہے تھے۔ اس بات سے انجان کہ ننھی خولہ انہی کے ساتھ بیٹھی ان کے آنسو صاف کر کے ان کے ہاتھوں کو چوم رہی تھی۔

چوٹیوں سے چھپتا گھر آج سنائے کی زد میں گھر آ ہوا تھا۔ ڈانگ ٹیبل پر اب تک صبح کا ناشتہ ڈھکا پڑا تھا۔ اندر کمرے سے عاطف کی ماں کے بین کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

”میرا بیٹا۔۔۔ میری آنکھوں کے سامنے گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا میں بیٹا بھی نہ پاکی۔ غالموں کے بیٹے میں دل نہیں تھا پھر تھا۔ مار ڈالا میرے عاطف کو۔“ آہ وزاری کرتی عاطف کی والدہ کو عاطف کی ماں نے اپنے ساتھ لگا کر حوصلہ دینے لگیں۔ ان کا عاطف اگر آج زندہ تھا تو عاطف ہی کی بدولت تھا وہ خود ایک ماں تھیں اور اپنے بیٹے کو انتہائی بری حالت میں چھوڑ کر اس ماں کے پاس بیٹیس حوصلہ بڑھا رہی تھیں جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بیٹے کو بولہاں ہوتے دیکھا تھا۔

وہ سب مرنے والوں کو شہید کہہ رہے تھے مگر یہ بھول بیٹھے تھے کہ شہید بھی مرنے لگے۔

عبر و استقامت کا نشان بنے اسکول کی پرنسپل کے بیٹے جو اپنی ماں کی بہادری پر فخر محسوس کر رہے تھے کہ ان کی ماں نے بزدلی نہ دکھائی بلکہ آخری

سائیں تک اپنے طالب علموں کے ساتھ ہی رہیں اور بڑی بہادری سے شہادت کو گلے لگایا۔ وقت پرے ملک کی فضا سو گوار کر کے دلوں کو دشمنوں سے چور کر کے اب آگے بڑھ رہا تھا۔

☆ ☆

12 جنوری 2015ء کی خوشگوار صبح، آرمی پبلک اسکول اپنی بائیں پھیلائے، مسکراتا ہوا بڑی شان سے کھڑا تھا۔ سبز کوٹ میں ملیوں طالب علم قوی جذبے اور پختہ عزم کے ساتھ اس کی بائیں میں سامنے کھڑا تھے۔ دشمن نے اندھیرا کرنا چاہا تھا مگر اجالا ہوا تھا پہلے سے بڑھ کر اجالا۔ بیٹے اب علم حاصل کرنے کا مقصد جان چکے تھے۔ ان کے دلوں میں علم کی شمع مزید آب و تاب کے ساتھ روشن ہو چکی تھی۔ وہ عہد کر چکے تھے کہ علم حاصل کر کے اپنے ملک و قوم کی حفاظت کریں گے اور دشمن کو منہ توڑ جواب دیں گے۔ وہ اپنے شہید بھائیوں، بہنوں اور اساتذہ کے خون سے وعدہ کر چکے تھے کہ ان کے مصحوم لہو کا حساب ضرور لیں گے۔

اسکول کی نئی پرنسپل نرم مسکراہٹ کے ساتھ بچوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ عزم کہاں ٹوٹا تھا۔ سب ایک تھے سب ایک رہیں گے۔ آڈیٹوریم میں موجود تمام طالب علم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے یکجان تھے۔ ان کی آنکھوں میں دشمن اگر جھانک لے تو جان جائے کہ اس ناحق گھٹی گئی خون کی ہولی کا قاتل کون رہا۔

وہ سب یک زبان ہو کر اپنا پیغام دنیا تک پہنچا رہے تھے اور ان کے اس پیغام سے آڈیٹوریم گونج اٹھا تھا۔

بتا کیا پوچھتا ہے وہ کتابوں میں ملوں گا میں کیے ماں سے ہیں جو میں نے، کیے دھروں میں ملوں گا میں

☆ ☆

ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے بولا تو وہ بھی مسکرا دیں۔
"پچیس ایسی اب۔ عاقب کا منہج آیا ہے وہ تو
چنچے والا ہے اسکول۔" عاقب نے موبائل پر نظر
دوڑاتے ہوئے کہا۔

"بس سب سے زیادہ عاقب کی فکر ہے جنہیں،
ماں اب سے جلدی جلدی کا شور مچا رہی ہے۔ اس
کی کوئی پروا نہیں۔" اس کی امی اس کے سر پر ہینار
سے چپٹ لگاتے ہوئے بولیں۔
"امی آپ بھی ناں۔" وہ ماں کی بات پر ہنستا
چلا گیا۔ دونوں ماں بیٹے خوشگوار موڈ میں کمرے
باہر نکلے۔

☆.....☆

بڑی ہی روشن صبح تھی۔ اسکول کی عمارت اپنے
طالب علموں سے بھر چکی تھی۔ جوئیر سیکشن کے
طالب علم کی کلاسیس شروع ہو چکی تھیں جب کہ نویں
اور دسویں جماعتوں کے طالب علم آڈیٹوریم میں جمع
ہو رہے تھے۔ آج ان کی فیکر ویل پارٹی تھی۔ سب
کچھ بہت خوب چل رہا تھا۔ آڈیٹوریم اساتذہ اور
طالب علموں کے قہقہوں اور تالوں کے شور سے
گورنر رہا تھا کہ اچانک اسکول کے ارد گرد موجود
درختوں سے پرندے یکدم پروں کو پھڑ پھڑاتے شور
مچاتے ہوئے اڑ گئے شاید کچھ ہوا تھا اور پھر اسکول
کی عقیبی جانب سے شلواریٹھیں میں لمبوں، لمبی لمبی
داڑھیوں والے کچھ انجینی افراد اسکول کے اندر
داخل ہوئے اور پھر ہنستا مسکراتا خوشگوار ماحول لمحے
بھر میں جیج و پکار، دھماکوں اور فائرنگ سے گورنر اٹھا
خود کو طالبان کہلانے والے خالموں نے مصمص
طالب علموں کے خون سے ہوئی کا کھیل کھیلنا شروع
کر دیا۔ پورے ملک میں یہ خبر جنگل میں آگ کی
طرح پھیل گئی کہ پشاور کے آری پبلک اسکول پر
دہشت گردوں نے حملہ کر دیا۔ پورا پشاور دل تھامے
اسکول کے گرد اکٹھا ہو گیا۔ ان سب کے دل خوف

زدہ کہ جانے اسکول کے اندر کیا قیامت برپا ہو رہی
ہے۔
اسکول پر حملے نے پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔
آری کے جوانوں نے وہاں پہنچ کر پوزیشنیں
سنجھال لیں تھیں۔ وہاں موجود لوگ بے حد غصے
میں تھے۔ وہ اسکول کے اندر جا کر ان بزدلوں دہشت
گردوں کو جہنم رسید کرنا چاہتے تھے۔ مگر آری کے
جوانوں نے بھرپور حوصلے و عزم اور جھلملائی
آنکھوں سے یہ کہہ کر انہیں روک دیا کہ۔
"نہیں! ابھی ہم زندہ ہیں آپ کی حفاظت کے
لیے۔"

جو بھی تھا یہ تو پوری قوم جان مٹی تھی کہ دشمن نے
آج ان کے دل پر کاری دار کر ڈالا ہے۔ آری کے
جوانوں اور دہشت گردوں کے بیچ فائرنگ کا شدید
جاول شروع ہو چکا تھا۔ آری کے جوانوں نے
اسکول کے اندر جا کر مصمص بچوں کو بیٹانا شروع
کر دیا۔ کچھ وقت گزرا تو اطلاع آئی کہ کچھ دہشت
گرد مارے جا چکے ہیں۔ اسکول سے حفاظت کے
ساتھ باہر آنے والے بچوں کے ساتھ ساتھ ٹیڈیوں
اور لاشوں کے بھی باہر آنے کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ وہ
دن تھا جب لاشیں اٹھانے والے رضا کار بھی
دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔

مصمص بھی خولہ کی لاش اس کے ماں باپ کو خون
کے آنسو روا لگئی۔ اس کے بھائی دھاڑیں مار مار کر
رونے لگے۔ شاید وہ شہادت کی چمک مٹی جو منہ سے
خولہ کے چہرے پر جھنگھڑی تھی۔ ان کی مصمص بہن
خولہ شہیدوں میں اپنا نام لکھوا چکی تھی اور پھر یہ
اندوہناک خبر سننے کوئی کہ نہیں، دسویں جماعت کے
تقریباً تمام طلبہ شدید زخمی ہیں اور اکثریت شہید ہو
جانے والوں کی ہے۔ اسکول کے باہر کھڑے مجمع
کے دل دہل گئے۔ سانسیں رک گئیں۔ پوری قوم
سنانے میں آ گئی۔ ایسا سانحہ وقوع پذیر تھا کہ لب

سل گئے تھے۔ آنکھیں بھیگ گئی تھیں لفظ کم ہو گئے
تھے اور پوری قوم سراپا احتجاج بن چکی تھی۔ شام
ہوتے ہوئے سارے دہشت گرد مارے جا چکے
تھے۔ مصمص بچوں کی لاشیں غم سے ہلکان ان کے
لواحقین کو ملنے لگی تھیں۔

مصمص شادری کی خون میں لت پت لاش جب
اسکول سے باہر آئی تو اس کی ماں مارے سکتے کے اس
کی لاش دیکھتی رہ گئی۔ چھوٹی چھوٹی چٹوٹوں سے
کھیرانے والا ان کا بیٹا بڑے بڑے زخم کھائے ابھی
نہیں سو رہا تھا۔ انہیں شادری کی آخری بات یاد آ رہی تھی۔
"امی! جب میں بہادر فوجی بنوں گا تو آپ مجھ پر
فخر کریں گی ناں پھر۔"

"صرف میں ہی نہیں میرے بیٹے، پوری قوم
آپ پر فخر کرے گی۔" انہیں اپنا کہا جملہ بھی یاد آیا۔
دل میں ایک ٹیس سی ٹھی اور وہ زارو تھار رونے
لگیں۔ کیا خبر کی کہ وہ وقت پلک جھپکتے ہی آجائے گا
جب پوری قوم شادری جیسے مصمص شہیدوں پر فخر کر رہی
ہوگی۔

عاقب شدید زخمی حالت میں باہر آیا تھا اور اپنی
تلفیظوں کو بھلائے اس کے لمبوں پر بس ایک ہی
سوال تھا۔

"عاقب کہاں ہے؟ اس نے میرے حصے کی
گولی اپنے سینے پر کھائی ہے۔ اسے ڈھونڈو اسے باہر
کالو۔" مگر اس کی بات کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔
عاقب کا اب تک کچھ پتا نہ چل سکا تھا۔

میڈیا اسکول کے باہر کھڑا اسکول سے باہر آنے
والے ڈرے سبے بچوں سے ملاقات کی بوچھاڑ کیے
جا رہا تھا۔ شاہ رخ بہت دیر بعد اسکول سے باہر نکل
پایا تھا۔ جب تک وہ اندر رہا اس کے والدین کی جان
سولی پر لگی رہی۔ شاہ رخ بہت شدید زخمی حالت
میں تو نہیں مگر زخمی ضرور تھا۔ اس نے اپنے دوستوں
کی جان اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے بچائی تھی،

ان کی میچر نے انہیں اسکول کی ایک خفیہ سرنگ میں
چھپا دیا تھا۔ ایک رپورٹر کے کسی سوال کا جواب دیتے
ہوئے شاہ رخ نے اپنی بہادر پرنسپل اور میچر کے
بارے میں بتایا کہ انہوں نے اپنے اسکول کے
طالب علموں کا ساتھ۔ آخری دم تک نہ چھوڑا۔ انہیں
کئی مواقع ملے تھے۔ اسکول سے باہر جانے کے مگر
وہ ہمت اور بہادر خاتون تھیں۔ بچوں کو چھوڑ کر جانا
گوارا نہ کیا۔ نتیجتاً درعدوں نے ان کے شاگردوں
کے سامنے ہی ان کی ہر طرح پر پرنسپل کو زندہ جلا دیا۔
اپنی پرنسپل کا ذکر کرتے ہوئے شاہ رخ کی آواز
کچکپانے لگی تھی۔ نہ جانے کیا گزری ہوگی ان
مصمصوں پر جب اپنی پرنسپل کو جان بچھڑا دیکھا
ہوگا۔ نہ جانے کیسے شاہ رخ میں اتنا حوصلہ آ گیا تھا
کہ وہ اپنا ڈر بھلائے اپنے ساتھیوں کی جان بچا رہا
تھا۔ وہ شرمیلا سا بچہ آج بہادر ہیرو کے طور پر سامنے
آیا تھا۔

عاقب کی والدہ بہت بڑھ چالی حالت میں اسکول
سے باہر لائیں گئیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے
خالموں نے ان کے بیٹے کو شہید کیا تھا۔ وہ اس
دخراش لمحے سے باہر نکل ہی نہیں پاری تھیں پورا مجمع
ان کی حالت دیکھ کر اٹھ بھا رہا تھا۔

اسکول اپنی تمام دلچراش و اذیت ناک یادوں کو
سیٹھ بند ہو چکا تھا۔

☆.....☆

دیران سا وہ گھر جہاں صبح تک مسکرا بیٹھیں،
کھٹکھٹا بیٹھ گورنر ہی میں اب ماتم کر رہا تھا۔ وہ
دھیرے دھیرے سے اپنے ننھے قدم اٹھاتا اس
کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں اس کی ماں
لوگوں کے مجمع میں گھری بیٹھی رو رو کر ہلکان ہوئی
جا رہی تھی۔

"مما! ماما مت روئیں ناں۔ دیکھیں میں آپ
کے پاس ہوں، آپ کے ساتھ ہوں۔ ممّا آپ ہی تو

دل کے دروازے

”میری بچھ میں نہیں آ رہا آخر یہ لڑکیاں میری خوب صورتی سے جلتی کیوں ہیں؟ اگر اللہ نے مجھے اتنا خوب صورت بنایا ہے تو پھر یہ خوب صورتی میرا نصیب تھی اور تو اور میری اپنی سکھیاں بھی میری خوب صورتی پر جل کر کونڈہ ہونے لگیں۔ جلتی رہیں مجھے کیا ہونہ۔“ شاہین اپنی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور اپنے دل میں خوب صورتی پر جتنے والوں کو کوس رہی تھی۔ اس نے ایک کالا ٹیکہ مانتے پر لگایا اور پھر سوچنے لگی۔

”مجھے اپنے اوپر اتنا پیار آ رہا ہے۔ میرے سپنوں کا شہزادہ جب مجھے دیکھے گا تو پھر اس کا حال کیا ہوگا؟ یقیناً وہ تو اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھنے گا۔“

اس کے خیالات اس سے پہلے کہ وسیع ہوتے اچانک روم کا دروازہ بجتے لگا۔ شاہین نے مخصوص انداز سے اپنے لمبے بالوں کو جھٹکا دیا اور وہیں سے کہا۔

”کون ہے بھی آجائیں۔ دروازہ کھلا ہوا ہے۔“

دروازہ کھلا تو اس کی پیاری دوست مایا کا چہرہ نمودار ہوا۔ ویسے تو مایا کا نام کچھ اور تھا مگر شاہین کی کوئی بہن نہیں تھی تو شاہین نے اس کا نام مایا میں رکھ دیا اور پھر رفتہ رفتہ اس کا مایا نام سب کی زبان پر آ گیا۔ مایا، شاہین کی بچپن کی دوست تھی۔

گاؤں میں ایک ساتھ کھیل کود کر بڑی ہوئی تھیں ان دونوں نے مدرسہ ایک ساتھ پڑھا۔ گاؤں میں اسکول تو تھا مگر لڑکیوں کی پڑھائی پر مکمل پابندی تھی۔ شاہین تھوڑا بہت لکھ پڑھ جانتی تھی۔

”ہائے مایا! تم کب آئیں؟“ اس نے مایا کو دیکھتے ہی کہا۔ شاہین مایا کو پیار سے مانتی تھی۔

”بھئی ظاہر ہے ابھی آئی ہوں، کوئی گھنٹہ پہلے نہیں آئی کہ دروازے کے سوراخ سے سترہ کے حسن کے جلوے دیکھتی رہی۔“ مایا نے اس کے قریب آ کے کہا۔

”مایا! تم بھی میری خوب صورتی سے جلتی ہو ہونہ۔ شکر ہے میں ہمیشہ کالا ٹیکہ مانتے پر لگنا نہیں بھولتی۔“ اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اچھا کافی دنوں کے بعد آئی ہو۔ کیسے آئی ہو؟“

”میں اپنے لیے کوئی شہزادہ ڈھونڈنے میں تھی۔“ مایا نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”پھر کوئی ملا اگر نہیں ملا تو کوئی جن ہی پکڑ لیتیں۔“ شاہین نے شرارت سے کہا۔

”ارے کہاں بھئی، ہمارے بڑے جو فیصلہ کرتے ہیں ہم ان کی مانتے ہیں۔“ مایا نے ہنستے ہوئے کہا۔



”ہاں یہ بات تو ہے اس معاشرے میں ہمیں
نہ لے کر کچھ بھی نہیں دیا جاتا۔“ شاہین افسردہ ہو
گئی۔

”میرے بہنوئی کا شہنشاہ نہ جانے کب آئے
گا۔ میری طرح حسین خوب صورت شہزادہ۔“
شاہین کی بات سن کر ماہین نے کہا۔ ”مجھے تو نہیں لگتا
کہ تمہیں لینے کوئی شہزادہ آئے گا۔“

”ماہی! شاہین نے پیچھے ہوئے نگاہ اٹھایا
اور اس کے سر پر دے مارا۔
پھر تو یہ سلسلہ چل پڑا ابھی شاہین آئے تو ماہین
پیچھے۔ ماہین آئے تو شاہین پیچھے۔ کچھ ہی لمحوں میں
دونوں نے کمرے کا ستیاناس کر دیا۔ جب تھک
گئیں تو شاہین نے کہا۔

”ماہی! تم جب بھی آتی ہو میرے کمرے کا
کباڑہ کر دیتی ہو، اب شرافت سے کمرہ سیٹ
کر دو۔“ شاہین کی بات پر ماہین ہنستی رہی۔
پھر دونوں نے کمرے کو سیٹ کرنا شروع کر دیا۔
کمرہ سیٹ کر کے ابھی انہوں نے سکے کا سانس بھی
نہیں لیا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور شاہین کی امی
ہنستی ہوئی داخل ہوئیں۔

☆ ☆

شاہین کے چچا دلاور خان نے اپنے بڑے
بھائی بہادر خان کو خیالوں میں کھویا ہوا پریشان
دیکھا تو اس سے رہانہ کیا اور پوچھا۔ ”ادا ساسی!
خیر تو ہے آپ پریشان نظر آ رہے ہو۔“

”بس دلاور خان! کیا بتاؤں مجھے شاہین کا غم
کہا ہے جارہا ہے۔ تمہیں تو پتا ہے اپنے خاندان
میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے اپنے خاندان کی
لڑکی کسی اور خاندان میں دی ہو۔“ بہادر خان نے
افسردگی سے کہا۔

”ادا ساسی! خاندان کی فکر مجھے بھی ہے میں
خود نہیں چاہتا کہ خاندان کی عزت پر کوئی آج

آئے۔“ دلاور خان کی بات سن کر بہادر خان نے
کہا۔

”اللہ کرے ایسا ہو کہ ہماری عزت و شان
برقرار رہے۔“

”آپ فکر نہ کریں ادا ساسی۔“ دلاور خان
نے ان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”شانتہ اب امید سے ہے۔“ شاہین نے جس
خاندان میں پرورش پائی وہ خاندانی اصول کے
پابند لوگ تھے۔ یہ سندرہ کا خاندان تھا۔ ان کا یہ
اصول بہت اہم تھا کہ کچھ بھی ہو جائے، خاندان کی
لڑکی کسی دوسرے خاندان میں نہیں دی جانی یا یوں
سمجھ لیں کہ وہ کسی اور کو اپنی مثال نہیں سمجھتے تھے۔

انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان
کو بھلا دیا تھا یا پھر شاید سنا نہیں تھا کہ ”اے
مسلمانوں! کسی بھی عربی کو بھی پر نفیت حاصل نہیں،
تم سب ایک آدمی کی اولاد ہو اور آپس میں بھائی
بھائی ہو۔“

ان کے اس غلامانہ اصول کا خود شاہین کی
پھوپھی شکار ہوئی تھیں۔ جب اس کی شادی کی عمر
گزرتی تو شاہین کے دادا نے اپنی بیٹی سے شادی کا
حق بخشوایا اور صرف سر کو جھکا کر ہی وہ چپ رہی۔

ان کو بولنے کی اجازت نہیں تھی اور خاندان میں
لڑکی کا چپ رہنا رضا مندی سمجھا جاتا ہے۔ پھر
اپنے بابا کے جانے کے بعد وہ رات بھر اتنی روئیں
کہ آنکھوں کا نور جاتا رہا، اب ہر رات ان کی
رونے کی ہوتی اور وہ روتے روتے کنواری ہی
موت کے منہ میں چلی گئیں۔

بہادر خان کا اب ہر دن ہماری گزرتے لگتا تھا۔
شاہین کی امی ان سے زیادہ پریشان تھیں ان دونوں
کے خیالات ایک جیسے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ
کاش شاہین پیدا ہی نہ ہوئی یا پھر پیدا ہوتے ہی مر
کیوں نہ گئی۔ لوگ اللہ کی رحمت کے طلب گار

ہوتے ہیں اور اللہ نے اپنی رحمت ان پر نازل کی
شاہین کی صورت میں تو یہ ان کو عذاب لگ رہی
تھی۔ بہادر خان اپنی بیگم کے ساتھ ہمیشہ کی طرح
خیالوں میں گم تھے کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا
اور دلاور خان اپنے ہاتھوں میں ایک بچہ لے کر
حاضر ہوا اور وہ بچہ شاہین کی امی کی گود میں رکھا
جس کو دیکھ کر دلاور خان کی آنکھوں سے خوشی کے
مارے آنسو کھل آئے۔ یہ کیسے خوشی کے آنسو تھے،
اپنے خاندان کی عزت بچ جانے کی خوشی کے آنسو
شاہین ان لوگوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ خوشی کے آنسو
شاہین کے لیے غم کے آنسو بن جائیں گے۔
شاہین کے دل کے ارمان بکھر جائیں گے۔

☆ ☆

شاہین اور ماہین نے کو دیکھا۔ پھر ایک
دوسرے کو دیکھا۔ شاہین کی امی نے چھوٹے بچے کو
شاہین کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

”شاہین! یہ بچہ ہے تمہارا سرتاج۔ سنبھالو اب
اسے۔“ امی کی بات سن کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔
وہ چونک گئی اس کے تو ہمارے خواب، دل کے
ارمان ٹوٹ کر بکھر گئے۔ اس کی آنسوؤں کی سی اور ہو
کیا گیا۔ بچے کو اپنی گود میں لینے ہوئے کہا۔

”امی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں یہ تو رات ہی پیدا
ہوا ہے۔“ شاہین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”شاہین! یہ غم سب کا فیصلہ ہے اور بڑوں سے
بحث نہ کرو۔ جو حیرے لیے بہت تھا وہی ہم نے کیا
ہے۔“ امی ڈانٹتے ہوئے چلی گئیں۔ شاہین کے
آنسو بھی نہیں دیکھے اور نہ ہی اس کے دل کے
ارمان آنکھوں کے خواب دیکھے جو ٹوٹ کر بکھر گئے
تھے۔

شاہین بچے کو دیکھ کر اپنی قسمت پر جتنے گئی۔
ماہین یہ سب کچھ حیرانی سے دیکھتی رہی اور پھر کہا۔
”شاہین! یہ کب بڑا ہو گا جو تیری شادی ہو

گی؟“
”یہ نہیں مانی! ہم لڑکیوں کے ایسے نصیب
کیوں ہوتے ہیں؟“ اور پھر وہ رونے لگی۔ چھوٹا
بچہ بھی اس کی قسمت پر رونے لگا۔ نصیب تو اس
کے بھی بڑوں نے تباہ کر دیے تھے۔ پیدا ہوتے ہی
دلہن کے حوالے کر دیا تھا۔

یہ کیسا مذاق تھا جو قسمت نے ان دونوں سے کیا
تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ شاہین روز بیتی مرتی رہی۔
ماہین کی بھی شادی ہو گئی۔ وہ تھی خوش نصیب تھی کہ
اسے اپنی عمر کا خاندان ملا تھا۔ وہ جب بھی شاہین سے
ملنے آتی اور اپنے پیار کی باتیں کرتی تو شاہین کی
آنکھوں سے آنسو کھل آتے لیکن وہ نصیب کے
آگے مجبور تھی۔ کچھ برس کے بعد چھوٹا بچہ اسفند بھی
بڑا ہونے لگا۔ اب وہ اسکول جانے لگا تھا۔ اس
کے چھوٹے ذہن میں یہی بات ڈال دی گئی تھی کہ
شاہین تیری بیوی ہے۔ بچپن میں تو اسفند کو اچھا لگتا
تھا۔ اپنے چھوٹے چھوٹے کام کروا کر خوش ہوتا تھا
لیکن جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا تو شاہین اسے اچھی
نہیں لگنے لگی۔

کچھ برس کے بعد ان دونوں کی باقاعدہ شادی
کرادی گئی۔ شادی کی رات اسفند نے شاہین
سے بات بھی نہیں کی وہ سوچ رہی تھی کہ کیا شادی
ایسی ہوتی ہے نہ ہی اس کا گھونگٹ اٹھایا۔ نہ کوئی
پیار بھرا جملہ کہا نہ ہی تعریف کی کسی نے۔ اسفند خود
پریشان تھا۔

”ابو نے یہ میری کسی شادی کروائی ہے۔ ایک
بڑھاپا میرے لیے باندھ دی ہے۔“ لیکن وہ بڑوں
کے فیصلے کے آگے مجبور تھا۔

اگر قسمت سے یہ شادی ہو ہی گئی تو کم از کم اسفند
کو ایسا سوچنا نہیں چاہیے تھا۔ ان کی شادی، شادی
نہ ہونے کے برابر تھی کچھ دنوں کے بعد اسفند
پڑھائی کے بہانے شہر چلا گیا۔ سال میں ایک دو

رواؤ اجٹ

MOVEETA
The Touch of Softness

Quality Tissue No More An Issue

نفاست اور سہولت مودو مٹاشون کی بدولت

UNION PLUS سے چار گنا کم قیمت پر خریدیں

ایکڑی لمبے مٹاشون صحت اور خوشبو

بہت کم قیمت پر حاصل کر سکتے ہیں

Super Soft

نفاست اور سہولت

Perfumed Scent

خوشبو اور صحت

Super Soft Roll
& Kitchen Roll

نفاست اور سہولت

A PRODUCT OF M.S. THERMOS

TEL: (021) 8802418

FAX: (021) 8802418

لے اس کی ساری خوشی خاک میں مل گئی۔

”یہ چائے ہے یا زہر۔۔۔ چائے بنائی بھی نہیں آتی خواہ کچھ کھر والے تیری تعریف کرتے پھرتے ہیں۔“ اسفند خند کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ اپنے ہاتھوں میں منہ چسپا کر رونے لگی۔ سوئے گئی۔

”آخر مجھے کس گناہ کی سزا دی جا رہی ہے میں نے تو نہیں کہا تھا کہ میری شادی ان سے کرواؤ۔ یہ تو خاندان والوں کا فیصلہ تھا۔ پھر میری قسمت میں اتنی درد اور زلت کیوں ہے؟“

سال کے بعد پھر جب اسفند آیا تو اس نے ہمت کر کے پوچھ لی۔

”اسفند! آپ نے شہر میں دوسری شادی کی ہے نا۔۔۔“

دوسرے نے ایک تھپڑ اس کے گالوں پر پڑا۔ ”تیری یہ ہمت کہ مجھ سے سوال وجواب کرو۔ اگر پوچھا ہے تو سنو۔۔۔ ہاں میں نے شادی کی ہے تم خود کو دیکھو بوڑھی لگ رہی ہو۔ جی آئینہ دیکھا ہے۔“ اسفند بہت کچھ بولا گیا۔ مگر اس کے ذہن میں اس کے الفاظ کو نہ سمجھ سکے۔

”ہاں میں نے شادی کی ہے۔ تم بوڑھی ہو چکی ہو۔“ اسفند چاچا کا تھا۔ آج ساری امیدیں ٹوٹ گئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی اور دیکھا کہ سر کے بالوں میں جگہ جگہ چاندی چمک رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بن رہے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ ہنس پڑی۔

”اسفند ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔ میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔“ آخر کب تک عورت کے ارمانوں کا خون ہوتا رہے گا کب تک عورتیں رتوں، رسوں کی بجائے چمکتی رہیں گی کب تک؟؟

☆

دفعہ ہی آتا تھا۔ ایسے دن۔ بچے اور مینے گزرتے رہے اب کی بار جب شاہین دیکھا گیا کہ اسفند آج آنے والا ہے تو ایک خوشی کا رنگ اس کی آنکھوں میں چمکا اس نے جلدی جلدی ایک لسٹ چیزوں کی تیار کی، اس لسٹ میں اسفند کی پسندیدہ ساری چیزیں تھیں۔ وہ لسٹ سامان کو پکڑا کر خود بھی تیار ہونے لگی۔ تیار ہوتے ہوئے اس نے سوچا اب شاید اسفند کی سوچ میں تبدیلی آگئی ہو۔ ہو سکتا ہے اسے میری یاد آئی ہو۔ وہ اپنی سوچوں کے محل تیار کرتی رہی۔ آخر انتظار پورا ہوا۔ اسفند آیا، سب سے ملاپس ہنس کر سب سے باتیں کیں مگر جوں کی ایک نظر کے لیے تڑپ رہی تھی اس کی طرف تو دیکھا بھی نہیں۔ پھر سب نے مل کر کھانا کھایا۔ سب شاہین کے ہاتھوں کے بنے کھانے کی تعریف کر رہے تھے۔ شاہین کو جس کی تعریف سننے کا انتظار تھا اس نے تو ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ شاہین کا انتظار انتظار ہی رہا، اسفند تھکاوٹ کا بہانہ بنا کر سو گیا۔ وہ ساری رات اپنے ارمان آسو میں بہا رہی لیکن اسفند ان کی دلی کیفیت سے بے خبر ہوتا رہا۔

دوسرے دن اسفند واپس جانے لگا۔ شاہین اس کے کپڑے اور دوسرا سامان تیار کر رہی تھی تو اسفند کمرے میں آیا۔

”شاہین چائے کا ایک کپ تو پلانا۔“ شاہین کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ آج اسفند نے اس کا نام لے کر پکارا ہے۔ وہ خوشی کے مارے ہنسنے کی طرف لپکی جلدی جلدی چائے تیار کرنے لگی۔ وہ ایک عجیب سی خوشی محسوس کرنے لگی۔ عورت پر جتنے ظلم و جبر کرو، کتنے ہی اس کے ارمانوں کا خون کرو مگر جب بھی پیار سے پکارو تو وہ سارے ستم بھول جاتی ہے۔ یہ عورت بھی عجیب ہے اس نے خوشی سے چائے بنائی اور اسفند کو دی۔ دوسرے

ہر عورت میں ہستی و عشق کی زبان

نماز کی ادائیگی کے لیے وہ صبح کے کپے پر ان کے کمرے میں ہی آگئی تھی۔ وہ بھی یہ جان کر مطمئن ہوگئی تھیں کہ شام کو لپاش اوپر ہارون کے کمرے میں آرام کر رہے ہیں۔ دروازے کو تھوڑا سا کھول کر ایک لمبے کمرے کا



باز رہا تھا۔ پر سکون گہری خاموشی میں وہ عبادت میں مشغول تھی۔ ایک کے لیے بہت مشکل تھا اپنے جذبات کو چھپائے رکھنا۔ عمارش کی حد بند یوں پر وہ اس سے بھی ناراضی اور غصے کا اظہار کر چکا تھا۔ غصے کے آگے پیچھے گھومتے اسے مسلسل اپنی طرف متوجہ رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کئی ایسے نازک لمحے آئے تھے جس میں وہ سب کچھ بھول جاتا چاہتا تھا وہ اسے بتاتا چاہتا تھا کہ یہاں سب کس اذیت سے گزر رہے ہیں پھر وہ کیوں ہر چیز سے انجان یہاں اطمینان سے ہے۔

”ایک“ ”حقب سے ابھرتی مسجد کی تہنیتی پکار پر وہ کرنٹ کھا کر پلٹا تھا۔

”تم کیوں اسے تنگ کرنا چاہتے ہو اسے سکون سے نماز تو پڑھنے دو اور یہ تم کس طرح کمرے میں بھانک رہے تھے وہ تمہاری وجہ سے ٹھہرا کر یہاں نہیں رکے گی مجھے الگ شرمندہ کر دو گے تم۔“ وہ مدہم آواز میں اسے سمجھا رہی تھیں۔



”ان کے فون پر عارش کی کال آ رہی تھی میں ان کو یہ بتانے آیا تھا۔“ وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ بولا تھا۔
 ”تو تم عارش کو کال کر کے بتاؤ کہ خرمین ابھی نماز پڑھ رہی ہے۔“
 ”مجھ سے مت کہیں جو کرنا ہے وہ خود کریں۔“ انتہائی ہٹ دھرمی سے وہ غصے کا اظہار کرتا گیا تھا۔ جبکہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے سمجھنے کے لئے کادروازہ دوبارہ بند کر دیا تھا۔
 دوپٹہ سر سے اتارتے ہوئے اس نے بیڈ پر پھیلے اسکارف کو دیکھا تھا جو وضو کے دوران کچھ بھیگ گیا تھا اسے خشک ہونے کے لیے مزید کچھ دیر ایسے ہی وہ ڈریسنگ کے سامنے آ رہی تھی۔ بالوں میں برش پھیرتے ہوئے وہاں موجود ہوتے ہوئے بھی وہ کہیں اور بھی اس کا دل اس دور پر تھا یہ سوچ کر کہ عارش وہاں احمد حسین اور فاطمہ کے قریب ہے اور وہ یہاں ان سب سے کئی دور تھی تنہائی محسوس کر رہی ہے۔ اس وقت وہ جیسے ہوش میں آئی تھی جب کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ ہشام تزلزاش کو اچانک وہاں دیکھ کر وہ ایک لمبے کے لیے ساکت ہو گئی تھی مگر ہشام تزلزاش کے لیے تو اس لمحے ساری دنیا ہی ساکت اور جامد ہو گئی تھی جس حقیقت نے ان کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی آج اس حقیقت کو اپنے سامنے دیکھتے ہوئے پھر قدموں کے نیچے سے زمین ٹوٹ گئی تھی، قابل برداشت اذیت سے دل جیسے پھٹنے لگا تھا محض کرب سے سرخ ہوئی ان کی پستی انگلیں اس پر ساکت تھیں ان کی اذیت سے بے خبر وہ بچلت میں سلام کرتی دوپٹے کا ہاتھ مٹھت نکالتی بیڈ سے اپنا اسکارف اٹھا کر ان کی طرف آئی تھی جن کی روح تک کانپ رہی تھی۔

”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ وہ ان سے کیا پوچھ رہی تھی ان کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا وہ بس اسے اپنے سینے میں جذب کر کے اپنے صدیوں سے جلتے دل کو ٹھنڈا کرنا چاہتے تھے ان کی بے بسی لا چاری اور دل سے رستے خون کے آنسوؤں کے درمیان زمین اور آسمان تھے جو بس اس طرح کا تھا شاید کچھ رہے تھے ان کے خاموش ہونٹوں کے پیچھے قید تھی کہیں نہیں وہ ان سے ناواقف تھی۔ جس کے چہرے پر کرب بول گیا تھا ان کی سرخ آنکھوں اور چہرے پر پھیلے کرب کو وہ کوئی نام تو نہ دے سکی مگر اس کمرے میں اسے اپنا دم ٹھکانا ہو محسوس ہوا تھا دل پر بڑھتے ہوئے جھٹ سے اسے اتار پراساں اور پریشان کیا کہ اگر یکدم ہشام تزلزاش پلٹ کر کمرے سے باہر نہ نکلے تو وہ ان کی نظروں سے دور بھاگ جاتی۔ کمرے کی تنہائی میں اسے اپنا دماغ سن ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا یہ سب کیا ہوا تھا؟ کیا وہ درحقیقت ان کی آنکھوں میں یہ سوال اسے حیران اور پریشان کر رہے تھے۔ غائب دماغی سے اسکارف اپنے چہرے کے گرد لپیٹتے ہوئے وہ مسلسل ہشام تزلزاش کی آنکھیں اپنے آپ پر محسوس کرتی رہی تھی۔

☆.....☆

اسے معلوم تھا وہ دیکھ رہی تھی محسوس کر رہی تھی کہ وہ یہاں سب کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے اتنی بڑی برائی اتنی کرم جوئی کہ وہ شرمندہ ہی ہو رہی تھی ہارون بھی اپنی ساری مصروفیات ترک کر کے اسے پہنچ دے رہا تھا ایک اور سمجھ تو مستقل اس کے ارد گرد ہی رہتے تھے سمجھ پر تھوڑی دیر بعد اس کی فکر میں جھلا ہو رہی تھیں کہ وہ پریشان تو نہیں یا یہ کس کو کی چیز کی ضرورت ہے اور یہ بھی کہ وہ یہاں اچھا محسوس کر رہی ہے یا نہیں۔ خرمین ان کو اپنی طرف سے متعلق کرتی رہی مگر ان کی خاطر داری اور آؤ بھگت کے باوجود سمجھ میں نہیں ہو پاری تھیں شاید بوسلکا تھا کہ وہ اس کی اندرونی کیفیات کو بھانپ رہی ہوں خرمین پر یقین تو نہیں تھی مگر یہ سچ تھا کہ دھیرے دھیرے اس کے اعصاب باد کا شکار ہو رہے تھے بظاہر سب کچھ اچھا نظر آ رہا تھا مگر ایک عجیب سا پیرا اسے ماحول میں محسوس ہو رہا تھا جیسے جیسے رات سر پر آتی جا رہی تھی بے چینی اور گھبراہٹ سی پیدا ہونے لگی تھی ہشام تزلزاش سے دوبارہ

اس کا سامنا نہیں ہوا تھا اور جانے کیوں اسے یہی قیمت لگا تھا سمجھ کے روکنے کے باوجود وہ کھانا نہیں کھا سکا
 میں ان کی مدد کرتی رہی تھی اور پھر ہارون کو بلانے اسیر کی طرف بڑھ گئی تھی وہ کچھ دیر پہلے اوپر گیا تھا بیچ کر نے کیونکہ کھانے کے بعد اسے ریڈیو اسٹیشن کے لیے بھی لگنا تھا۔ دستک دیتے ہوئے اس نے ہال کی دیوار پر لگی قد آدم ساز کی تصویر کو دیکھا تھا تب ہی دروازہ کھلتے پر ہارون کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔
 ”کھانے پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔“ اسے اطلاع دیتے ہوئے خرمین کی نگاہ اس کے کالر پر جا رہی تھی مگر اسے چمکنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

”بس ایک منٹ۔“ سرعت سے گریبان کا اوپر ہی ہٹن بند کرتا وہ دروازے سے ہٹ گیا تھا ”جبکہ خرمین خاموشی سے اس قد آدم ساز کی تصویر کی طرف بڑھ گئی تھی آنکھوں کی کرسی پر سمجھ اور ہشام تزلزاش پر ایمان تھے جبکہ ان کے دائیں بائیں ایک اور ہارون موجود تھے۔ گردن موڑ کر اس نے اسی جانب آتے ہارون کو دیکھا تھا۔

”یہ تصویر بہت خوبصورت اور ہر طرح سے مکمل ہے کہیں کوئی کمی نہیں ہے۔“
 ”آپ انھیں اکثر دھوکا دے جاتی ہیں ہو سکتا ہے جو انھیں نظر آ رہا ہو وہ سچ نہ ہو۔“ ہارون کے سمجھدہ چہرے نے اسے حیران کیا تھا۔

”اس تصویر میں کیا حق نہیں ہے؟“

”یہ تصویر ہر طرح سے مکمل نہیں ہے بہت بڑی کمی ہے جو اس وقت تمہیں دکھائی نہیں دے گی۔“
 ”آپ مجھے کیوں کر رہے ہیں۔“ تصویر پر نگاہ ڈالتی وہ ابھی تھی۔

”اگر ایسا ہے تو میں مطمئن چاہتا ہوں چلو نیچے چلے ہیں۔“ ہارون نے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ دیا تھا جس کی انھیں قانعگی کھانے پر ہشام تزلزاش موجود نہیں تھے طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے مگر اخلافا خرمین نے سرسری انداز میں ان کی غیر موجودگی کے بارے میں سمجھ سے پوچھ لیا تھا۔

☆.....☆

کمرے میں داخل ہوتی وہ دنگ ہوئی تھیں جبکہ ان کی طرف متوجہ ہوتی خرمین کچھ شرمندہ ہوئی تھی۔
 ”ایک کے دوست چلے گئے؟“ ان ہلکے یک میں ڈالتی وہ پوچھ رہی تھی۔
 ”مگر یہ کیا تم یہ کب سے استعمال کر رہی ہو۔“ اس کے قریب پہنچتی وہ تشویش زدہ نظروں سے اس کے چہرے پر ابھرتی غائب کو دیکھ رہی تھیں۔

”ہمیشہ سے ہی یہ میری ضرورت ہے آپ پریشان نہ ہوں اور میں آپ کو پریشان نہیں دیکھنا چاہتی۔“
 مسکراتے ہوئے خرمین نے ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ چہرہ لکھنک وہ خاموشی سے اس کی سیاہ شفاف آنکھوں کو دیکھتے رہی تھیں۔

”جانتی ہو جب جب تمہارے چہرے کو تمہاری آنکھوں کو دیکھتی ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے۔“ ان کا لہجہ گھٹنے لگا تھا ان کی نرم آنکھوں نے خرمین کی مسکراہٹ غائب کر دی تھی۔

”کیا لگتا ہے آپ کو؟“ اس کے سوال پر سمجھ کی آنکھیں ڈبڈبائی تھیں لہی میں سر ہلاتے ہوئے انہوں نے مسکراتے کی ناکام کوشش کی تھی اور پھر اس کا چہرہ انھوں میں تھا مگر انھوں نے اس کی ناکام کوشش کو سن کر گھٹے تھے بہت محبت سے وہ اس کی آنکھوں کو چوم رہی تھیں اور پھر اسکارف میں بچھی اس کی پیشانی کو بھی چومتے

ہوئے اسے گلے لگایا تھا کیا قرار کیا سکون تھا یہ جس کے لیے وہ تڑپتی رہی تھیں ندوہ اپنی کیفیت کو سمجھ رہی تھیں
 نہ اس کو سمجھا سکتی تھیں۔
 ”آپ کیوں رو رہی ہیں مت روئیں۔“ ان کے آنسو صاف کرتے خرمن کا دل پھیلنے لگا تھا جبکہ صبیحہ بکھر
 ی خود کو سنبھال لگی تھیں۔
 ”کیا آپ مجھے اپنے دل کی بات نہیں بتائیں گی؟ میں آپ کو اس طرح روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی آپ
 بس مسکراتے ہوئے مجھے اچھی لگتی ہیں جو چیز آپ کے آنسوؤں کا سبب ہے آپ مجھے بتا کے دل ہلکا کر سکتی ہیں
 میں آپ کی کچھ نہیں لگتی؟“
 ”ایسا مت سوچو میری بیٹی میں تمہیں اپنے دل کی ہر بات بتاؤ گی مگر ابھی کچھ مت پوچھو۔“ وہ راز سے
 لہجے میں بولی تھیں۔
 ”تمہاری طبیعت بہتر نہیں لگ رہی تم اب کمرے سے باہر نہیں نکلو گی۔ بس سو جاؤ تمہیں اب آرام کی
 ضرورت ہے۔“ ان کی تاکید پر وہ مسکرائی تھیں۔
 ”اتنی جلدی مجھے نیند نہیں آئے گی اور میں نے ہارون سے کہا تھا کہ جب وہ واپس آئیں گے تو میں ان کا
 کے لیے کافی بناؤں گی۔“
 ”ہارون کو وہاں ہی میں دیر ہو جائے گی اس کے لیے کافی تم کل بھی بنا سکتی ہو کل تو چھٹی کا دن ہے وہ گھر میں ہی
 ہو گا اب تم عارش کو کال کر کے اس کی خبر سے مطلع کرو میں ذرا ان کو دیکھ آؤں۔“ وہ تاکید کرتی اٹھ گئی تھیں۔
 ”میری وجہ سے اکل کو ہارون کے کمرے میں جانا پڑا وہ پریشان تو نہیں میری وجہ سے؟“ خرمن کو شرمندگی
 ہوئی تھی۔
 ”بالکل نہیں جب ان کی طبیعت خراب ہوتی ہے وہ اسی طرح ہارون کے کمرے میں رہتے ہیں ان کو وہاں
 سکون ملتا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھیں۔ چہرہ ہلکا ہوا صبیحہ کے چہرے پر بند دروازے کو دیکھتی رہی تھی اور
 پھر گہری سانس بھر کر اپنے سبیل نوں کی جانب بڑھ گئی تھی جو چیخ اٹھا تھا۔
 ”میں ابھی نہیں کال کرنے ہی والی تھی۔“
 ”سب خیریت ہے؟“ عارش کے لہجے میں تشویش تھی۔
 ”ہاں سب خیریت ہے۔“
 ”کیسا وقت گزر رہا ہے سب کے ساتھ؟“
 ”بہت اچھا لگ رہا ہے یہاں مگر یہاں وقت گزر کر نہیں دے رہا ایسا لگ رہا ہے سب کچھ رکار کا سا ہے۔“
 ”کوشش کے باوجود وہ اپنے غموساات نہیں چھپا سکتی تھی۔
 ”فکرت کرو میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہے آخر ہم دونوں پہلی بار ایک دوسرے سے جدا ہوئے ہیں۔“
 عارش کے مسکراتے لہجے نے بھی اس کے اندر اچھے اضطراب کو کم نہیں کیا تھا۔
 ”میں تو اب تو بہ کر رہا ہوں تمہارے بغیر کسی سفر پر نہیں نکلوں گا عجیب ہو رہا ہے میرے ساتھ تم سے دور ہوں
 مگر دل دماغ تمہاری طرف ہی لگے ہیں ابھی بھی سب سے جان چھڑا کر تم سے بات کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا ہے
 لیکن مجھے پتہ ہے تم مجھے بالکل یاد نہیں کر رہی ہو ورنہ مجھ سے پہلے خود کال کر لیں اپنی آواز سنانے کے لیے۔“
 ”عارش اتم میری بھی کوئی بات سنو گے؟“ اس کے جھکے لہجے نے عارش کو چونکا دیا تھا۔

”خرمن تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے تمہاری طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی؟“ عارش کو یکدم کچھ محسوس ہوا تھا۔
 ”پتہ نہیں مجھے یہاں کچھ عجیب محسوس ہو رہا ہے مگر کیا یہ میں نہیں جانتی۔“ اس کی آواز رندہ گئی تھی۔
 ”خرمن اگر کوئی بات ہوتی ہے تو مجھے بتاؤ مگر اس طرح پریشان مت ہو ورنہ میں ابھی واپس آنے کی تیاری
 کروں گا۔“ اس کے غم لہجے نے عارش کو بے طرح بے چین کر دیا تھا۔
 ”نہیں کوئی بات نہیں ہے یہاں سب بہت اچھی طرح میرے ساتھ پیش آرہے ہیں لیکن یہاں رات بھر
 رہنا میرے لیے بہت مشکل ہو رہا ہے۔ مجھے نیند بھی نہیں آئے گی۔“
 ”خرمن میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں تم وہاں سے گھر واپس آنا چاہو گی کوئی زبردستی نہیں روکے گا مگر وہاں
 رکنے کی جگہ بھی پھر لینے کے بعد اب تم گھر جانے کی بات کرو گی تو وہاں سب کی دل آزاری بھی ہو سکتی ہے تمہیں
 ان سب کی فیلینگز کا خیال بھی تو رکھنا ہے۔ پریشان مت ہوا ایک رات کی بات ہے میں ابھی عثمان کو فون کرتا ہوں
 وہ صبح ہی تمہیں یک کرنے پہنچ جائے گا کوئی بھی بہانہ کر کے تمہیں ساتھ لے جائے گا۔“ عارش کی تسلی نے اسے
 کچھ حواس دی تھی۔
 ”ٹھیک ہے۔“ وہ اتنا ہی بولی تھی۔
 ”اچھا سنو اتم نے صبیحہ اتنی سے نیزہ کے بارے میں کوئی بات کی؟“ عارش کو یاد آیا تھا۔
 ”ہاں نیزہ اتنی اچھی ہے ان کے بیٹے کی بھی پسند ہے پھر وہ کیوں راضی نہیں ہوں گی۔“
 ”اچھی بات ہے ابھی نیزہ سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا میں پہلے اس مسئلے کو آگاہ کروں گا۔“
 وہ تاکید کر رہا تھا۔
 رات میں ہارون کے واپس آنے پر اس کی مدد لے کر صبیحہ نے ایک کوزہ بردستی اس کے کمرے میں بھیجا جس
 پر خرمن کو بہت ہنسی آئی تھی لیکن ایک ناراض ہو گیا تھا اس بات کا انہوں نے بھی تھا کہ اس کی باتوں میں وقت
 گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔
 ”اب آپ بھی سو جائیں میری باتوں سے آپ کی نیند بھی ڈسٹرب ہوگئی ہے۔“
 ”میری فکرت کرو تم اب سو جاؤ کافی رات ہو چکی ہے۔“ صبیحہ کے پر شفقت لہجے پر اس نے مسکراتے
 ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔ نائٹ بلب کی مدد سے روشنی میں وہ اس کے بیڈ اسٹارف میں قید پائیزہ چہرے کو
 دیکھتی رہی تھیں۔ ہاتھ رخسار کے نیچے رکھے اس کے سونے کا پانداز یکدم ہی صبیحہ کو چونکا گیا تھا یہ اعزاز بہت
 مانوس سا تھا شام تیز لپاش کی عادت تھی کہ وہ سیدھے ہاتھ کی سیڑھی پر چڑھ نکلا کر سوتے تھے۔ خرمن کے اس اعزاز
 پر ہلکا سا مسکراتے ہوئے وہ بھی سونے کے لیے آنکھیں بند کر چکی تھیں۔

☆—☆

گہری نیند سے اچانک ان کی آنکھ کھل گئی تھی انہوں نے وال کلاک میں وقت دیکھا تھا ساڑھے تین بج
 رہے تھے اس وقت تو وہ تھک چکی تھیں مگر آج پتہ نہیں کیسے ان کی نیند اتنی طویل اور گہری کیسے ہوگئی
 تھی۔ اٹھ کر بیٹھے ہوئے انہوں نے اپنے دوپٹے کی سمت ہاتھ بڑھایا تھا مگر اگلے ہی لمب ان کا ہاتھ ہی نہیں
 آنکھیں بھی ساکت رہ گئی تھیں قریب ہی وہ اپنے آپ سے بھی غافل ہوگئی تھی صبیحہ سانس لیتا بھول گئی تھیں
 ان کے وجود پر لرزہ طاری ہو گیا تھا ان کی وحشت زدہ آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں جس کا اسٹارف کھل کر اس کی
 گردن کے گرد لپٹا رہ گیا تھا۔ ایک قیامت تھی جو ان پر سے گزر رہی تھی ان کے چہرے پر پیسے کے قطرے نمودار

ہو چکے تھے دل اذیت سے پڑ پڑا رہا تھا بمشکل انہوں نے اپنا کامپنا تھا جس کی طرف بڑھایا تھا۔ بشی اسکا رن پھسلتا ہوا ان کے ہاتھ میں آتا اس کی گردن کو حویاں کر گیا تھا۔

”میرے اللہ!“ ان کے دل سے کراہ بلند ہوئی تھی اس کی فہرہ رگ کے نیچے وہ نشان واضح تھا ایک بار پھر ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر وہ پتھری نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئیں جو ان کی ٹوٹی قیامت سے بے خبر تھی۔ وحشت سے چٹنی آنکھیں ایک لمبے لمبے اس پر سے ہٹائے وہ اگلے قدموں دروازے کی طرف بڑھی گئیں اور ٹنگے جڑی کرے سے نکل گئی تھیں۔ اگلے چند ہی لمحوں میں وہ ہشام قزلباش کا ہاتھ جکڑے وہاں کرے میں آئی تھیں۔ بیڈ کی طرف نظر جاتے ہی ہشام قزلباش پتھر کا مجسمہ بن گئے تھے۔

”میں نے کہا تھا آپ سے میرا خواب فطرت نہیں تھا۔“ ان کا بازو جھجھوڑتے ہوئے صبیحہ کی کراہیں بلند ہونے لگی تھیں۔ ہشام قزلباش سرعت سے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر بمشکل ہی ان کے کھڑکتے وجود کو سنبھالتے کمرے سے نکل گئے تھے۔

تیز ہیز ہز کتے دل کے ساتھ خرمن نے آپ صبح کھول کر بند دروازے کی طرف دیکھا تھا اور اگلے ہی لمبے تیزی سے بیڈ سے اترتی کمرے سے باہر نکل آئی تھی دے قدموں سے وہ ڈرائنگ روم سے کچھ فاصلے پر رک گئی تھیں صبیحہ کی کرب ناک آوازیں بخوبی اس تک پہنچ کر اسے سن کر رہی تھیں۔

”میرا دل ایسے ہی تو اس کی طرف نہیں کھینچا تھا آپ نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے وہ میرے ہی وجود کا حصہ ہے مجھے یقین ہے آپ بھی واقف ہیں اللہ کو کچھ پرہیز آگیا مگر آپ کو نہیں میرے صبر کا میری تڑپ کا تماشہ دیکھتے رہے آپ میں آپ کو معاف نہیں کروں گی عارش کو بلا کر مجھے یقین ہے اسے بھی سب معلوم ہے آپ سب نے مل کر مجھ پر ظلم کیا ہے سب نے مل کر۔“ ساتوں تک پہنچی یہ سچی دیکھا اس کے وجود کو محمد کر گئی تھی دماغ آؤف ہو رہا تھا وحشت ناک نظروں سے وہ ہشام قزلباش کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ رہی تھی اس کا چہرہ لٹنے کی مانند سفید ہونے لگا تھا بے جان قدموں کو پیچھے کی طرف کھینچتے وہ بھاگ جانا چاہتی تھی مگر دماغ کا رابطہ وجود سے ختم ہو گیا تھا ہشام قزلباش کی آنکھوں سے اسے گرم سیال بہتا دکھائی دے رہا تھا ان کا لڑنا تھا جس کے سر پر آکھرا تھا جس کا دل مکمل ڈوب گیا تھا۔

”ہارون!“ ان کا ہاتھ جھٹکتی دھرمیت سے اس کی جانب گئی تھی جو بے حس و حرکت تھا۔

”یہ سب کیا ہے کیا ہو رہا ہے؟“ خرمن کی لرزتی آواز گھٹ گئی تھی اس وقت صبیحہ اس کے قریب آ پہنچی تھیں زار و قطار درخشاں دیکھی اسے گٹے لگے تھیں کبھی اس کے چہرے کو ہاتھوں کو چوم رہی تھیں۔ بار بار اس مکمل کو دہرا رہی تھیں ان کی بے تابی ان کی سسکیاں اس کے اعصاب تک کو بے جان کر گئی تھیں آہوں کراہوں کے ساتھ وہ کیا بول رہی تھیں اگر خرمن ہوش میں ہوتی تب بھی ان بے ترتیب گفتگو کو نہیں سمجھ سکتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کبھی صبیحہ سے خود کو چھڑاتی کمرے کی طرف بھاگ گئی ان کی پکاروں نے بھی اس کے قدم نہیں روکے تھے۔

دروازہ اندر سے لاک کرنے تک وہ بیٹھے میں ٹراہور ہو گئی تھی سینے میں سانس بری طرح جھنسنے لگی تھی وحشت سے چٹنی نظروں سے وہ بند دروازے کو دیکھ رہی تھی جہاں دستک بڑھتی جا رہی تھی باہر اگر دروازہ آیت کا طوقان اٹھتا تو قیامت اب بھی برپا تھی۔ صبیحہ کی دردناک پکاروں نے اس کے اندر پیمان کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی کانوں پر ہاتھ رکھ کر وہ چند لمحوں تک رک گئی مگر پھر بھی بہت برقی رفتار سے اس نے اپنے سیل فون پر عثمان سے رابطہ کیا تھا۔

”عثمان ابھی اسی وقت آؤ مجھے یہاں سے لے جاؤ ورنہ میں یہاں مر جاؤں گی میں زندہ نہیں رہوں گی مجھے لے جاؤ یہاں سے۔“ دوسری جانب سے کچھ سے بغیر وہ ہڈیانی انداز میں جھنجکی پٹی گئی تھی۔

☆.....☆

”اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا ہے تم اسے باہر آنے کے لیے کہو اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں کیا جواب دوں گا عارش کو۔“ شدید اضطرابی لہجے میں ہارون نے عثمان سے التجا کی تھی جو بری طرح حواس باختہ ہو کر بیلا کے ہمراہ یہاں پہنچا تھا دوسری طرف بیلا کا دماغ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا ایک طرف خرمن کی طرف سے اندیشے اسے خوف زدہ کر رہے تھے تو دوسری طرف صبیحہ کی حالت نے اسے پھیلا دیا تھا وہ بمشکل ہی اپنی تسلی دہنی سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی اس کی نظروں کے سامنے صبیحہ دو بار بے ہوش ہوئی تھیں۔

”ہارون! مجھے اس وقت خرمن کی بھی جیانی حالت کا اعازہ ہے میں اسے فوراً اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں آپ کسی طرح آتنی کو سنبھال لیجیے۔“ پریشان نظروں سے عثمان نے اجازت طلب نظروں سے ہشام قزلباش کے تاریک ہوتے چہرے کو دیکھا تھا۔

”اسے یہاں سے مت لے جاؤ ورنہ وہ مر جائے گی۔“ ہشام قزلباش کے لرزاتے لہجے پر اس نے صبیحہ کو دیکھا تھا فرش پر بیٹھی بیلا نے ان کا سراپے شانے پر ٹکایا ہوا تھا۔ صبیحہ اس وقت بالکل غر حال تھیں ان کے لبوں پر صرف خرمن کا ہی نام تھا۔

”میں خرمن کی خواہش پر یہاں آیا ہوں وہ یہاں سے جانا چاہتی ہے وہ یہاں کسی کی امانت ہے اور میں مجبور ہوں۔“ عثمان کو کھانا پڑا۔

”آپ ان کو یہاں سے نہیں لے جاسکتے میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گا آپ چلے جائیں یہاں سے۔“ ایک پھر کرجی اٹھا تھا۔

”تم خاموش رہو۔“ ہارون غصیلے انداز میں ایک پریرہ سا تھا۔

”عثمان وہ جو چاہتی ہے تم ویسا ہی کرنا چاہو اسے باہر آنے کے لیے کہو۔“ جھکے جھکے لہجے میں ہارون نے اسے بند دروازے کی جانب جانے کا اشارہ دیا تھا۔

گھٹنوں سے سر اٹھا کر اس نے دروازے کی سمت دیکھا تھا عثمان کی پکار اسے سنائی دے رہی تھی بمشکل ہی وہں پہنچتے ہوئے اسے کمرے کی ہر چیز آپس میں گڈمڈ ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

یہ کوئی خواب نہیں تھا وہ جانتی تھی یہ خواب ہے نہ حقیقت یہ کوئی عذاب ہو سکتا تھا دردناک عذاب رشتوں پر سے اعتبار اٹھا دینے والا عذاب اس کی آنکھوں سے سیلاب رواں ہو گیا تھا۔

دنگ نظروں سے عثمان نے اس کے چہرے کو دیکھا تھا جو دروازہ کھولتے ہی پھوٹ پھوٹ کر روتی اس سے لپٹ گئی تھی۔

”یہاں سے لے چلو مجھے یہاں سے چلو۔“ وہ چیخ رہی تھی اس کے بعد عثمان کو ہر طرف سے آنکھیں بند کر گئی پڑی تھیں۔ اسے بازو میں چھپا تا وہ سرعت سے وہاں سے لٹکا تھا بیلا کی گرفت میں صبیحہ اس کو دہانہ وار پکارتیں پیچھے جا رہی تھیں مگر ہارون نے ان کو روک لیا تھا ان کی جھجھوں نے بیلا کے قدم بھی روک لیے تھے جو عثمان کے پیچھے جا رہی تھی۔

”آپ چاہیے میں ان کو سنبھال لوں گا۔“ ہارون کے کہنے پر وہ بمشکل اپنے آنسو روکتی آگے بڑھی تھی۔

”اسے واپس نہیں آتا ہے وہ ہم سے دور نہیں گئی ہے۔“ ہشام تزلزلہ آواز میں ان کو سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہے تھے جو کھڑکی چارہ تھیں بارون کو ہماری طوق اپنی گردن میں پڑتا محسوس ہو رہا تھا غار دارو زنی آہنی زنجیریں اس کی گردن کو جکڑتی جا رہی تھیں ماضی کے تاریک سائے مغربیت بن کر اسے لٹکتے کے لیے اپنا حصار تنگ کر رہے جا رہے تھے۔

☆.....☆

فلپش بیک

ادھ کھلے دروازے کے قریب رک کر اس نے اندر جھانکا تھا۔ ڈیرینک کے سامنے بیٹھی عورت اس کے دل میں اپنی نفرت بڑھا رہی تھی۔ اس کمرے کی ہر چیز پر اس کی ماں کا حق تھا جس پر اب اس عورت نے قبضہ کر لیا تھا وہ اس عورت کو اپنے کمرے میں برداشت نہیں کر سکتا تھا اس کی ماں کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا وہ چیخ کر اپنے باپ کو بتا چاہتا تھا جو اس عورت کو اس کے سر پر منڈھ چکے تھے اس کی رکوں میں ابال اٹھنے لگا تھا جب وہ عورت چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”تم وہاں کیوں رکے ہو یہاں آؤ میرے پاس۔“ مہربان مسکراہٹ چہرے پر سجائے وہ اسے اپنے پاس بلارہی تھی جو شدید ناگوار نظروں سے ان کو گھورتا اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں تھا اس کی ڈھٹائی پر وہ خود آگے بڑھ آئیں تھیں۔ گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھنے ہوئے انہوں نے اس کا محسوس چہرہ اپنے ہاتھوں میں قلمبند کیا۔

”تم مجھ سے دور دور کیوں رہتے ہو؟“ ماما سے نہیں بھاگتے ماما سے بھاگتے ہیں اور بائیں کرتے ہیں۔“ آپ میری ماما نہیں ہیں۔“ ان کے ہاتھ جھٹکنا وہ چٹا تھا اور پلٹ کر وہاں سے بھاگ گیا تھا جبکہ صبیحہ کچھ ٹم زدہ ہوئی تھی وہ جتنی محبت اس کے لیے رکھتی تھی اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتی تھیں وہ اتنا ہی ان سے نفرت اور کراہیت کا اظہار کرتا دور بھانسا تھا صبیحہ جانتی تھیں کہ اس کا محسوس ذہن آہستہ آہستہ ہی ان کو ان کے منصب کے ساتھ قبول کرنے کا لہذا وہ صبر کے ساتھ اس کے رویے کو برداشت کرتی تھیں۔ مگر اس سے شفقت اور محبت کا اظہار کرتے رہنے سے خود کو روک نہیں پاتیں تھیں۔ ایسے میں اس کا بگڑنا لازمی ہو جاتا تھا اگلے دن والے ہر دن کے ساتھ یہ معمول کا حصہ بنتا جا رہا تھا۔

”میں تو بس اسے اسکول جانے کے لیے تیار ہونے میں مدد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔“ ان کی طرف بڑھتے ہوئے صبیحہ شدید پریشانی بلکھونے والی کیفیت میں بتا رہی تھیں۔

”بہنی یہ کیا بد شہری ہے؟ کس قسم کی حرکتیں کرنے لگے ہو تم۔“ ہشام نے اس کا بازو پکڑ کر اسے سامنے کیا تھا جو بیڈ شیٹ کو جوتلی انداز میں ہٹا رہا تھا۔

”سوری کہو ماما سے ابھی اسی وقت۔“

”میں نہیں کہوں گا۔“ وہ روتے ہوئے چٹا تھا۔

”میری ماما نہیں ہیں۔“

”کیا اس صدمہ کو دور نہ میں چھڑ ماروں گا تمہیں۔“ ہشام بری طرح بیٹے پر برہم ہوئے تھے۔

”اس طرح قصہ نہ کریں نا مجھ بچہ ہے۔“ صبیحہ دل اٹھی تھیں۔

”پہلے ہی یہ دور کر حال سے بے حال ہو چکا ہے۔ مجھے خیال رہتا تھا بچے کا غلطی میری ہے۔“

”تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے یہ دن بدن خود مر رہتا جا رہا ہے میری نرمی نے اسے بگاڑ رکھا ہے۔“ غمیلی

نظروں سے دو اسے دیکھ رہے تھے جس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

ہشام تزلزلہ آواز میں ایک بیٹنی چڑبائی اور نفسیاتی دواؤں سے بہت اچھی طرح آگاہ تھے اس لیے پہلے سے زیادہ اس پر مہربان رہتے تھے۔ صبیحہ کے ساتھ اس کے بچے کو بھی نظر انداز کر جایا کرتے تھے مگر کبھی کبھی وہ ان کو بہت زیادہ زنج کر دیتا تھا۔ صبیحہ کی طرف سے ان کو کوئی شکایت نہیں تھا اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ بھی صبیحہ کو

دوسری بیوی اور اپنے بچے کی دوسری ماں کے روپ میں یہاں نہلاتے اپنی اولاد کے لیے دودھ آٹھیں بند کر کے صبیحہ پر بھروسہ کرتے تھے کیونکہ وہ بھی ہی اس قائل۔ بارون بہت چھوٹا تھا بہت ساری چیزیں وہ ابھی نہیں کچھ سکا تھا وہ جانتے تھے اس لیے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کرتے رہتے تھے مگر اس کے باوجود اپنے بیٹے کی بدتمیزیوں کے لیے انہیں صبیحہ کے سامنے شرمسار ہونا پڑتا تھا اس لیے بھی کہ صبیحہ نے کبھی شکایت کا ایک لفظ تک نہیں کہا تھا ان کی پشیمانی پر بل تک نہیں آیا تھا وہ بارون کی خصوصی کو نظر انداز کرنے کی عادی ہوئی جا رہی تھیں۔

ڈرائنگ بک پر نظر کرتے ہوئے اس نے رک کر دروازے کی سمت دیکھا تھا اور پھر فوراً ہی دوبارہ جھک گیا تھا چنانچہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ہشام بیڈ کے کنارے بیٹھے چند لمحوں تک غمتی رہے تھے مگر جانتے تھے کہ وہ ان سے شدید ناراض ہے ایسے میں وہ خود ان کی طرف نہیں آئے گا ان کے پکارنے پر وہ فوری طور پر منسوب نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی خاموشی سے ڈرائنگ بک بند کرنا اٹھا تھا۔

”ادھر آؤ میرے پاس۔“ بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہشام نے اسے اپنے سینے پر لٹایا تھا۔

”ماما سے ناراض کیوں ہوتے ہوئی؟ تم جانتے ہو کہ کیا پاپا سے کتنا پیار کرتے ہیں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتے مگر پھر بھی تمہیں پاپا سے تھوڑا سا بھی پیار نہیں۔“ اس کے نرم ہاتھوں میں انگلیاں بیکھرتے وہ بولے تھے۔

”میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں۔“ ان کے سینے سے سر اٹھا کر وہ بولا تھا۔

”تو پھر تم میرا کہتا کیوں نہیں مانتے میں کتنا سمجھتا ہوں تمہیں۔“ ان کی شکایت پر وہ چند لمحوں تک ان کے چہرے کو دیکھتا رہا تھا اور پھر وہاں ان کے سینے پر سر رکھ لیا تھا۔

”بہنی تمہاری یہ ماما بہت اچھی ہیں تم سے بہت پیار کرتی ہیں ابھی انسان کبھی اس سے نفرت نہیں کرتے جو ان سے پیار کرتا ہے اور تم تو میرے بہت اچھے بیٹے ہو کیا تم کو یہ بتانا چاہے ہو کہ تم ابھی بچے نہیں ہو؟“ نرم لہجے میں وہ آج پھر اسے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

”مجھے خند آ رہی ہے۔“ وہ منہ نہایتا تھا۔

”ہاں سو جاؤ مگر میں نے جو کہا ہے اسے یاد رکھنا۔“ اس کے سر کو چومتے ہوئے وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے جو دودھ کا گلاس تھا اسے اندر آئی تھیں۔

”بہنی اٹھو پہلے دودھ پی کر سو جانا۔“ ہشام نے اس کی پشت چھتی تھی۔

”مجھے نہیں پینا بس سونا ہے۔“ ان کے سینے میں چہرہ چھپایا وہ کچھ جھنجھلایا تھا اس سے پہلے کہ ہشام کچھ کہتے صبیحہ نے اشارے سے ان کو روک دیا تھا۔

”میں جا رہی ہوں مجھے بھی اب سونا ہے آپ کو تو اس وقت تک نیند نہیں آئے گی جب تک اسی دودھ کا گلاس خالی نہیں کرے گا۔“ گلاس ان کو تھا کہ صبیحہ نے مجھے اس کو سنایا تھا اور پھر مسکراہٹ چھپانے کے لیے لکل مکی تھیں کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ اب وہ دودھ پینے سے انکار نہیں کرے گا جانتی تھیں کہ وہ اپنے باپ سے کچھ خاص ڈرتا نہیں ہے مگر ان سے محبت بہت کرتا ہے ان کی کوشش یہی ہوتی تھی باپ بیٹے کی محبت کے درمیان نہ آئیں

مگر ان کی کوشش کچھ زیادہ کارگر ثابت نہیں ہو رہی تھی۔

پلیٹ میں موجود چاولوں میں چبچے چلاتے ہوئے وہ ناگواری سے ابھڑکھڑے ان کو گھور رہا تھا جو کھانے کے دوران مسکراتے ہوئے اپنے شوہر سے کوئی بات کر رہی تھیں۔ اپنے باپ کو بھی مستقل ان کی طرف متوجہ دیکھنا اس کی برداشت سے باہر تھا۔ سائے چھٹی یہ عورت اس گھر پر ہی نہیں اس کے باپ پر بھی تسلط بننا چکی تھی یہ سب اس کی عورت سے زیادہ اپنے باپ سے بدگن کرتا تھا۔

”سبجیل رکھنا دیتا؟“ اس کے ہاتھ سے چبچے چھوٹ کر گرا تھا تو ہشام اس سے بولے تھے۔

”چلو آج میں اپنے ہاتھ سے کھانا کھلائی ہوں۔“ صبیحہ نور اس کے برابر والی کرسی پر آ بیٹھی تھیں مگر ان کے ہی پل ان کا چہرہ مائل کیا تھا جب وہ بگڑے سانداز میں کرسی سے اتر گیا تھا۔

”واپس بیٹھو اور کھانا کھاؤ۔“ ہشام جو اس کے تیردیکھ رہے تھے اس کا بازو پکڑ کر تنہی لہجے میں بولے تھے۔

”مجھے کھانا نہیں کھانا۔“ اپنا ہاتھ چہرے پر اتار دیا تھا۔

”اب مجھ سے بدتمیزی کرو گے تم مجھ سے ادنیٰ آواز میں بات کرو گے کہاں سے سیکھ کر آتے ہو یہ سب۔“

ان کے سخت لہجے پر وہ سر جھکائے وہاں سے چلا گیا تھا۔

”کھانے کے وقت کیوں غصہ کیا آپ نے اس پر وہ بعد میں کھانا کھا لیتا ہے ابھی دل نہیں چاہ رہا ہو گا اس کا۔“ صبیحہ نے انہیں شانت کرنا چاہا تھا۔

”اگر میں اسے نوکوں کا نہیں تو یہاں طرح خوسری کے مظاہرے کرتا رہے گا۔“

”پھر بھی اتنی سختی سے بات نہ کیا کریں مجھے اپنا آپ قصور وار لگتا ہے۔“ صبیحہ دم آواز میں بولی تھیں۔ ”اس

سب میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے یہ اپنی ماں کے بہت قریب تھا اس کے قتل ابھی اس کے دل و دماغ پر گہرے

ہیں کچھ وقت لگے گا مگر پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ان کے مہجائے چہرے کو دیکھتے وہ تسلی دے رہے تھے مگر

انداز سے وہ خود پریشان تھے۔

☆.....☆

”کب سے فون کر رہی ہوں اور تم اب آرہے ہو؟“

”میں باہر کے پھیلے نمناؤں یا تمہارے فون پر دوڑ دوڑ کر یہاں آؤں؟“ عثمان نے بگڑ کر اس کے فون چہرے کو

دیکھا تھا۔

”میں سب کچھ نہیں سنبھال پاری ایک آج پھر یہاں آیا تھا خرمن کے پاس جانے کی ضد کر رہا تھا میں اسے

کس طرح روک رہی ہوں یہ میں ہی جانتی ہوں اوپر سے عارض نے فون کر کے مجھے باگل کر دیا ہے خرمن اس

سے بھی بات نہیں کرنا چاہتی اس نے اپنا سیل فون آف کر رکھا ہے۔ وہ جو مجھ سے بھی بات نہیں کر رہی پہلے ہی اس

کی طبیعت خراب ہے نہ کچھ کھانے کے لیے تیار ہے نہ کمرے سے باہر نکل رہی ہے مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا اچانک

سب کیا ہو گیا ہے۔“ بیلا کی پریشانی حد سے سوا تھی۔

”تم ایسا کرو ساری پریشانیاں اپنے سر لے لو اور میں پھر نتائج بھگت لوں گا۔“ عثمان کا لہجہ غصیلا تھا۔

”خرمن سے زیادہ تم مجھے پریشان کر رکھا ہے تم جانتی ہو اس وقت تمہیں اپنا کتنا خیال رکھنے کی ضرورت

ہے مگر تمہیں مگر نہ پتا ہی پرواہ ہے اور۔۔۔“ بری طرح برستادہ بات ادھوری چھوڑ گیا تھا۔

”نیزہ کہاں ہے اب تک واپس کیوں نہیں آئی؟“ بگڑے تیروں سے سوال کرتے ہوئے اس نے نیزہ

سے رابطہ کیا تھا۔

”جس ساری صورت حال کا اندازہ ہے پھر بھی تم بیلا کو یہاں تنہا چھوڑ کر اپنے گھر چلی گئیں۔“ نیزہ کی

کچھ سے بغیر وہ غصہ اس پر اتار گیا تھا۔

”میں کچھ دیر پہلے ہی گھر آئی تھی بھائی کا انتظار کر رہی تھی ان کے ساتھ ہی تو وہاں آؤں گی ورنہ پھر تم مجھے

لینے آ جاؤ۔“

”دماغ خراب ہے کیا تمہارا میرے پاس اپنی بیوی کی خبر خیر لیے کی فرصت نہیں ہے تمہاری ڈسے داریاں

بھی مجھے ہی پوری کرنی ہیں تو ایک ٹکٹ تم بھی پر صحوالو مجھ سے۔“ وہ بگڑا تھا۔

”میں بس چندہ منٹ میں وہاں پہنچ رہی ہوں تم اپنے کام نمٹاؤ۔“ اس کے اشتعال پر نیزہ ہول کر بولی

رابطہ منقطع کر گئی تھی۔

”تمہارا دماغ تو واقعی ٹھکانے پر نہیں ہے جو منہ میں آیا وہ بولتے چلے گئے جس میں نیزہ پر اس طرح بھڑکنے کا

کوئی حق نہیں ہے۔“ غصیلی نظروں سے بیلانے اسے دیکھا تھا۔

”شام کو عارض یہاں پہنچے گا تب ہی میرا دماغ ٹھکانے پر آئے گا ابھی میرے منہ کوئی نہ لگے۔“ وہ بگڑ کر بولا

تھا۔

”اور جا کر اس سے کہا کہ گرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو اپنے شوہر کا انتظار کر لے مجھے سولی پر لٹکانے کا انتظام نہ

کرے۔“ عثمان کے غصے کا رخ اب خرمن کی طرف ہو گیا تھا جس کی خاموشی اور کمرے میں بند رہنے کی ضد نے

سب سے زیادہ اسے ذوق کر رہا تھا۔

☆.....☆

بیشکل اپنی سوچی آئیں کھول کر اس نے تیز روشنی کی وجہ سے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا شاید وہ تاریکیوں

میں گم ہو کر ہر سوچ سے دور بھاگ جانا چاہتی تھی روشنی تو جیسے عذاب بن گئی تھی جو ہر جگہ کو مایاں کر رہی تھی اور ان

چہروں کو بھی جن کو وہ کبھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی جب وہ خاموشی و ترپ اس نے اپنی زندگی سے ملاؤ ڈالی تھی تو پھر

اب یہ سب کیوں؟ اس کے اندر ایک بار پھر طوفان اٹھنے لگے تھے پھوڑے کی طرح دیکھتے سر کو وہ سنبھالتی وہ اٹھ

بیٹھی تھی گھٹنوں پر سر رکھے جانے اسے کتنا وقت گزر چکا تھا اچانک اسے کمرے کے باہر کچھ مل جاتی ہوتی محسوس

ہوئی تھی۔ کانوں سے ٹکراتیں کچھ مانوس آوازیں اس کی آنکھیں بند دروازے پر ساکت ہو گئیں تھیں شدید

بے بسی آنکھوں میں لپے وہ ان کو دیکھ رہی تھی جو کمرے میں داخل ہو رہے تھے ان کے عقب میں ہی دکھائی دیتا

وہ چہرہ اس کے سینے کھڑکھڑاتا تھا۔

”ہا ہا! لہوں سے چٹکی سکتی کے ساتھ وہ بھاگتی ہوئی ان سے لپٹ گئی تھی۔

”میں صرف آپ کی بیٹی ہوں آپ کی اولاد ہوں۔“ بلک بلک کر روتی وہ سبکی الفاظ دہرا رہی تھی اسے حسین

اور قاطع سے سنبھالنے کی کوشش میں آبدیدہ ہو رہے تھے دروازے پر کھڑا عارض اسے ساکت نظروں سے ٹوٹا

مگر تا دیکھ رہا تھا یہاں قہقہے سے پہلے ہی عارض اس کی کیفیت سے باخبر تھا کمرے کی بلند ہوتی کراہیں اور چٹکیں

اسے شدید دھچکے سے دوچار کر رہی تھیں خرمن کا یہ شدید رد عمل اس دماغ کو ماف کر رہا تھا۔

☆.....☆

فلپس بیک

اس کا ہاتھ پلائے ہشام کمرے میں داخل ہوئے تھے جو بخیر و ناپ کے ہمراہ ان کی سمت جا رہا تھا۔ جو اسے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی تھیں مگر وہ بہت کمزور اور زرد دکھائی دے رہی تھیں۔

”تمہاری ماما تمہارے لیے بہت پیارا کٹ لائی ہیں تم اسے دیکھو گے؟“ ہشام اس سے پوچھ رہے تھے صبح نے اپنے قریب کر لیا تھا حیرانی سے اس نے گلابی ٹبل میں لپٹے جو دو کو دیکھا تھا اور پھر سر اٹھا کر اپنے باپ کو دیکھا تھا۔ جن کا چہرہ خوشی اور مسرت سے جگمگا رہا تھا۔

”دیکھو یہ کتنی پیاری لڑکی ہے۔“ ہشام بولے تھے جبکہ وہ بس پلکیں جھپکاتا لڑکی کی بندھا آنکھوں اور ننھے سے چہرے کو دیکھتے جا رہا تھا۔

”دیکھو اس کی گردن پر بھی ویسا ہی نشان ہے جیسا بابا کے پاس ہے اور ذہنی کے پاس بھی ہے۔“ مگر اس کے پاس ایسے دو نشان ہیں۔“ انہوں نے اس کی شہادت کی اگلی سوتی ہوئی لڑکی کی پیشانی پر پلکے سے لگائی تھی مگر وہ کسی بھی دھچکی کے بغیر سر جھکا کے سیاہ چہرے کے ساتھ بیٹھا رہا تھا۔

”صبح اس کا چہرہ تو بالکل اسی جیسا ہے۔“

”ہاں اس کا سب بچھائی جیسا ہے یا اس کے لیے تو آئی ہے۔“ شوہر کی تائید میں بولتے ہوئے انہوں نے اس کا سر کو چوم لیا تھا۔ جو وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

”صبح تم نے بہت خوبصورت عقد دیا ہے مجھے میری یہ شہید آرزو تھی کہ میری ایک بیٹی ہو۔“ اپنی بیٹی کے گلابی چہرے کو آنکھوں میں سوتے ہوئے وہ بولے تھے۔

”کتنا خوبصورت ہو گا وہ دن جب یہ بیٹی کے ساتھ اسکول جائے گی۔ یہ دونوں ملی کر خوب شہر تیں کریں گے اور جب میں مگر آؤں گا تو تم مجھ سے ان کی شکایتیں کرو گی۔“ آنے والے حسین دنوں کی روشنی آنکھوں میں لپے وہ صبح کو دیکھ رہے تھے۔

”مہی! تمہاری لڑکی مجھ سے کہہ رہی ہے کہ میں آج بھائی کے ساتھ سوؤں گی تم مانو گے اس کی بات؟“ ہشام اس سے پوچھ رہے تھے جو سر جھکا کر بالکل خاموش تھا۔

رات کو جانے کون سا پہرہ تھا جب اس کی نیند ٹوٹی تھی مدھم روشنی میں وہ ان کو دیکھ سکتا تھا جو قریب ہی مگر کی نیند سوتی ہوئی تھیں شدید الجھن اور ناگواری محسوس کرتا وہ غیر محسوس انداز میں حرکت کرتا وہ ان سے دور ہوا تو باپ کی عدم موجودگی کا اسے احساس ہو گیا تھا ان کی تلاش میں اس نے تکیے سے سر اٹھایا تھا۔ بو جھل پلکیں جھپکاتے وہ ان کو دیکھ رہا تھا جو سامنے ہی صوفے پر موجود اس ننھے سے وجود میں گم تھے وہ بار بار اس کے چہرے کو اس کے چہرے

چھونے لگا تھا تو اس پر دم چڑھ رہا تھا ان کی دالہا نہ محبت کے نظارے دیکھتے ہوئے وہ شدید غم کی جلن میں مبتلا ہونے لگا تھا اپنے ملاوہ بھی اس اپنے باپ کو کسی دوسرے بچے کی طرف متوجہ نہیں دیکھا تھا سامنے نظر آتا منظر اس کے لیے ناقابل برداشت تھا اس کے معصوم ذہن کے لیے ناقابل قبول تھا اپنے باپ کے سینے سے لگاؤ تھا جو اس کے لیے قابل نفرت تھا وہ جگہ صرف اس کی بھی اس کا دل چاہا کہ وہ اس ننھے وجود کو اپنے باپ سے جھین کر کہیں

دور پھینک آئے ہشام اپنی خوابیدہ بیٹی پر محبت نچھاور کرتے بالکل اس طوفان سے بے خبر تھے جو اس وقت ان کے کہن اور حساس بچے کے دل و دماغ میں جاری تھا تکیے میں چہرہ چھپائے بے آواز سسکتے ہوئے وہ باپ سے بد

ظن تھا اور صرف اپنی ماں کو یاد کر رہا تھا۔

دوسری صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے کمرے میں خود کو تنہا پایا اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اسے کچھ قائل پر دی

گلابی ٹبل میں قید تھا وہ جو نظر آیا تھا چند لمحوں تک وہ جھکا بخیر و ناپ کی بند ہوئی کھلی آنکھوں کو دیکھتا رہا اور پھر جانے کس جذبے کے تحت ہاتھوں میں اٹھانے کی کوشش کی تھی اسے ہاتھوں میں سنبھالے وہ بیڈ سے اتر رہا تھا جب توازن بری طرح بگڑا تھا اور اگلے ہی پل وہ سر کے بل نیچے تھا۔ واش روم سے باہر نکلتیں صبح دہلی کر چھ انہیں صبح دوسری طرف برق رفتاری سے کمرے میں داخل ہوئے ہشام نے تیزی سے منہ کے بل گری ہوئی

بیٹی کو اٹھایا تھا اور اس کے ساتھ ہی ان کا بھاری بھرپور اس کے چہرے سے نکلا تھا جو دوبارہ کارپٹ پر گر گیا تھا۔

”جب تمہیں پتہ ہے کہ تم اس کو نہیں سنبھال سکتے تو کیوں اسے اٹھاؤ تم نے؟“ شدید پیش میں وہ اس پر

برے سے تھے جو گلاب پر ہاتھ رکھے ساکت نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ہشام اب بری طرح اپنی بیٹی کے لیے پریشان تھے جو کتنی بچھن آواز میں روتی سرخ ہوئی جا رہی تھی وہ بمشکل ابھی چاروں کی تو ہوئی تھی شکر تھا کہ

ننھے نرم و پیر کارپٹ تھا مگر اتنی بے دردی سے کرنے کے بعد اب کسی طرح اس کا رونا بند نہیں ہو رہا تھا۔ صبح

حاصل بیٹی کو بھلانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر ہشام کا دل اپنی بیٹی کی تکلیف پر بند ہو رہا تھا وہ اسی وقت بیٹی کا

چیک اپ کرانے کا پائل روانہ ہو گئے تھے اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی وہ بس ڈر تھی تھی چیک اپ کے بعد ڈاکٹر

نے ان کو ملی آمیز جواب دیا تھا مگر ہشام جب ہی مطمئن ہوئے تھے جب بیٹی کا رونا بند ہوا تھا۔ بہر حال اپنی

پریشانی میں وہ اسے نہیں بھولے تھے جس کے ساتھ وہ آج چار حانہ سلوک کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

”آپ کو اس پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا بچوں سے ایسی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں اس نے جان بوجھ کر ایسا

نہیں کیا تھا۔“ صبح شدید تاسف سے ان سے مخاطب تھیں اور وہ قشوریں زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے جو

بنار میں تھا اس وقت سو رہا تھا۔

”آپ نے اسی لیے اسے مارا کہ اگر اس کی غلطی پر آپ اسے کچھ نہ کہتے تو مجھے آپ سے شکایت ہوتی؟“

کھوجی نظروں سے صبح نے ان کو دیکھا تھا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں میرے اٹھے کا اٹھا کر نا ایک فطری رد عمل تھا۔“

"اللہ۔۔۔ نہیں تم پھر کوئی برتن توڑ دو گے۔" کچن کی طرف جاتی دلا دلا کر منع کر گئی تھی۔

"عثمان! ابھی سوچ نہیں ہے مگر مجھے تم سے بات کرنی ہے اور تم جانتے ہو کہ مجھے کس بارے میں بات کرنی ہے۔" احمد حسین کے سنجیدہ لہجے نے اس کے تاثرات کو بھی سنجیدہ کر دیا تھا۔ چہرہ نظروں سے اٹھنی طرف دیکھتے عارض کو وہ کچھ نہیں بول سکا تھا ویسے وہ ذہنی طور پر تیار تھا کہ موعج ملتے ہی احمد حسین اس سے باز پرس ضرور کریں گے اس بارے میں جوان کی غیر موجودگی میں رونما ہو چکا ہے۔

☆.....☆

"وہ سب کچھ جانتے تو ہیں پھر اب اس بارے میں کیا بات کریں گے تم سے؟" گھر میں داخل ہوتے ہی بیلا اس پر چوری چھپی جواس کے پیچھے ہی آتا گیٹ بند کر رہا تھا۔

"میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں" اس کی خاموشی پر بیلا کی تھی۔

"ظاہر ہے جو غلط ہوا ہے اسی بارے میں بات کریں گے۔" اس کی طرف آتا وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

"کیا غلط ہوا ہے مجھے بتانا پسند کرو گے؟" بیلا کے تاثرات بگڑے تھے۔

"تم جانتی ہو۔"

"نہیں میں کچھ نہیں جانتی تم مجھے ابھی بتاؤ۔" بیلا کے تیز لہجے پر اس نے گہری سانس لی تھی۔

"نہیں اس وقت کچھ بتانا چاہتا ہوں اور نہ کچھ سننے مجھنے کے مواقع ہیں نہیں بس اب بحث کرنی ہے اور میں اس وقت سکون سے سونا چاہتا ہوں۔" تنہائی نظروں سے دیکھتا وہ آگے بڑھ رہا تھا جب بیلا نے ایک ٹھٹکے سے اس کا بازو پکڑ کر اسے قہراً روکا تھا۔

"مجھے جواب چاہیے کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میرا تمہارے گھر میں ہونا ہی غلط ہے میری وجہ سے تمہاری اور سب کی زندگی میں غلط ہوا ہے کیوں نہیں پیچیدگی دیتے مجھے اپنے گھر سے اور اپنی زندگی سے باہر۔" اس کے ہلکنے پر عثمان کا چہرہ چپ اٹھا تھا۔

"غلط یہ ہے کہ میرا باپ میری آواز تک سننا نہیں چاہتا غلط یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کی شکل تک دیکھنا نہیں چاہتی یہ سب میری نظر میں تمہاری نظر میں غلط نہ ہو مگر کسی بھی تیسرے انسان کی نظر میں یہ غلط ہے تمہارے پیچھے چلانے سے یہ غلط درست نہیں ہو سکتا۔" عثمان کی آواز اب اس سے زیادہ بلند تھی۔

"اور میں آخری بار تمہیں سمجھا رہا ہوں اس گھر سے نکلنے کی بات کر کے مجھے دوبارہ جانور بننے پر مجبور نہیں کرنا۔" انتہائی سخت لہجے میں اسے وارن کا تواد رک نہیں تھا جا رہا تھا قدموں سے کمرے کی سمت بڑھا تھا سن کھڑی وہ بند دروازے کو دھکتی رہی تھی۔

☆.....☆

فلپش بیک

بے بہت چلتے چلتے اب اس کے سر جھکنے لگے تھے دھوپ چلا جاتی ہوئی تھی اس کا بخار زردہ وجود فضاہت سے چور تھا سفید ٹھڑی ٹوپا زو میں دبانے وہ سرک کے کنارے چلتا دور سے ہی اس کو دیکھ کر چوٹا تھا دلچسپی سے اس ٹرک کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک خیال کودتا تھا بھاری اور بڑی بڑی یورپوں سے لدے اس ٹرک کے نزدیک نہ کوئی تھانہ ہی اس کی طرف متوجہ تھا جو بڑی پھرتی سے اس ٹرک پر چڑھتا احتیاط سے ان یورپوں کے درمیان جگہ بناتا اندر چھپ گیا تھا چہرہ کھول بعد ہر طرف سے اطمینان محسوس کرنے کے بعد اس نے

ٹھڑی میں کھلبلا تے غصے و جود کو دیکھنے کے لیے کھل اس کے چہرے سے ہٹایا تھا گری شاید اسے بھی گراں گزر رہی تھی۔ تب ہی تو اس کا چھوٹا سا گلابی چہرہ سرخ ہو رہا تھا اس کے رشتی چھوٹے چھوٹے ہال بیٹے سے چپکے ہوئے سر سے چپکے ہوئے تھے۔ تیز روشنی میں اس کی آنکھیں کل نہیں پار ہی تھیں لہذا بند آنکھوں کے ساتھ ہی اس کی پٹین روٹی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اس کا روٹا بند کروانے کے لیے وہ بس اتنا ہی کر سکا کہ اس کی کھل میں دلی فیڈر کی چھوٹی سی بوتل اس کے منہ سے لگادی تھی یورپوں کے اخبار کے درمیان لینا ہوا وہ بہت تھک چکا تھا اسے کوئی تشویش نہیں ہوئی تھی جب ٹرک نے سرک پر دوڑنا شروع کر دیا تھا ہوا کے مدم جھوکوں میں اس کی پوجھل پلٹیں بند ہوتی چلی گئیں تھیں۔ جانے کتنا وقت گزرنے کے بعد اس کی نیند ٹوٹی تھی پہلے تو وہ اپنے ارد گرد کے ماحول اور تاریکی سے خوفزدہ ہوا تھا اور اگلے ہی لمحوں اسے سب کچھ یاد آ گیا تھا ڈرتے ڈرتے اس نے یورپوں سے سر نکال کر ارد گرد کا جائزہ لیا تھا تاریکی میں نظر آتی ہی جگہ اس کے لیے اجنبی تھی وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا اسے اپنا گھریاؤ رہا تھا اسے بار بار اپنے باپ کا خیال رلا رہا تھا ٹرک اس وقت رکا ہوا تھا کچھ قافلے پر ہی چائے کا ہول تھا جہاں کچھ لوگ بیٹھے اسے نظر آ رہے تھے۔ اس کا دل خوف سے لرز رہا تھا سفید ٹھڑی بیٹے میں دبانے وہ ٹرک سے اتر آیا تھا ٹرک کا یہ جھکی حصہ بہت تاریک جگہ پر تھا جہاں اسٹریٹ لائٹ پہنچ نہیں سکتی تھی اس لیے وہ کسی کی نظروں میں آ نہیں سکا تھا سرک پر آتی جالی گاڑیوں کی تعداد سے لگ رہا تھا کہ رات بہت زیادہ بیت چکی ہے خوف میں گھیرا وہ یہی سوچ رہا تھا کہ وہ اسی راستے پر واپس چلتا چلا اپنے گھر تک پہنچ جائے گا اور یہ اس کی مصیبت ہی تو تھی کہ وہ یہ بھول گیا تھا کہ دوپہر سے ٹرک اب تک ایک جگہ نہیں کھڑا رہا ہے۔ وہ جب گھر پر نہیں تھی جہاں سے وہ ٹرک میں چڑھا تھا سرک کے کنارے تیز چلتے ہوئے اس کی ہراساں آنکھیں ہر طرف کھوم رہی تھیں۔ وہ دھماڑیں مار مار کر روٹا چاہتا ہی تھا کہ خوف سے اس کی سسکیاں ملنے میں بند ہو گئیں تھیں۔ کچھ ہی قافلے پر دوپہر کیس کا شیل دکھائی دینے لگے خوف سے اس کی کھلی ہندی سرک سے ہٹ کر اس نے ایک ڈھلوانی سرک کی سمت بھاگنا شروع کر دیا تھا سفید ٹھڑی کو سینے سے لگایا وہ بس بھاگ رہا تھا ہر سمت تاریکی تھی کتوں کے بھونکنے کی کریمہ آوازیں اس کے خوف کو بڑھاتی جا رہی تھیں بھوک پیاس سے بڑھا حال ہوتے اس کے قدم بے جان ہو رہے تھے اس کی رفتار کم ہوتی گئی تھی وہ روٹا جا رہا تھا چلتا جا رہا تھا اسی دوران اسے اپنے عقب میں کسی کے قدموں کی آوازیں سنائی دی تھیں بری طرح دہشت میں مبتلا ہوتا وہ دوبارہ اندر جا دھند بھاگ کھڑا ہوا تھا وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں آ پہنچا ہے وہ ایک ٹوٹی ہوئی دیوار تھی جس کے عقب میں جاتے ہوئے اس کو بڑی شدید ٹھوک لگی تھی وہاں کھپ اندر میرا تھا منہ کے بل گرنا ہوا سفید ٹھڑی اس کے ہاتھوں سے ٹھٹکی تھی کچرے کی بو اور سرائند نے اس کی سانسیں روک دی تھیں اور دہشت نے اس کے حواس کم کر دیے تھے گرتا ہوا تادہ اپنے پیچھے آتی عفریت سے بچنے کے لیے ایک بار پھر اندر جا دھند بھاگنا شروع کر چکا تھا چپ نہیں کہاں سے گزرتا وہ ایک سرک پر پہنچا تھا اس کے پیر شل تھے ہاتھ خالی تھے بیٹے میں شرابور ہوش و خرد سے بیگانہ ہوش آیا تو اس نے خود کو اسی ٹرک کے قریب کھڑا پایا تھا یورپوں کے درمیان دیکھا وہ کانپ رہا تھا زار و قطار رو رہا تھا اس کے لیے جسے وہ جانے کہاں پیچھے نہیں گم کر آیا تھا اس پر قیامت گز رہی تھی جسے سہتا وہ غشی میں مبتلا ہو رہا تھا اسے بس اتنا یاد رہا کہ ایک آسمان پر ادھورا چاند بھی اس کے ساتھ ہی انجان راستوں پر سفر کرنا شروع کر چکا ہے خود کی میں اسے کچھ آوازیں سنائی دے رہی تھیں کوئی سخت ہاتھ اس کے چہرے کو تھپتھپا رہا تھا۔ تیز روشنی میں وہ بد شکل آنکھیں کھول سکا تھا اپنے ارد گرد سے دیکھنے کا موعج نہیں مل سکا تھا کیونکہ

اسے پولیس کی وردی میں ایک کرخت چہرہ دکھائی دے رہا تھا وہ اس سے کیا پوچھ رہا تھا اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا اس نے شدید خوف سے اپنی آنکھیں میچ لی تھیں۔
قیامت تو کہیں اور بھی ٹوٹی تھی شہر کی ایسی کون سی جگہ تھی جہاں وہ اپنے بچوں کی تلاش میں مارے مارے نہ پھرے ہوں اختیارات میں کم شدگی کے اشتہارات تک دے ڈالے نہ کر سکیں سے بھی کوئی امید نہیں جاگتی تھی چین سکون لٹ چکا تھا ان کی دنیا لٹ چکی تھی۔ اولاد جیسی پوٹی ان کے ہاتھ سے نکل کر انہیں مفلک کر چکی تھی اپنے پھول جیسے بچوں کی تلاش میں وہ سر جھٹکے رہے وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ اب تک زندہ کیسے ہیں ان کو نہ اچھا ہوش رہا تھا نہ دنیا کا وہ تو مسجد کی طرف سے بھی غافل تھے جو اپنی غفلت پر دعوہ اوروں سے سرگرم تھیں ماتم کر رہی تھیں دن رات روتے روتے ان کے آنسو ننگ ہو چکے تھے وہ پھر کی صورت بن کر وہ کہیں نہیں ان کے لیے اس دنیا سے سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

پولیس کی نری ختی اور خوف سے ہلا خراس کے حلق میں قید آہیں کر رہی ہیں آزاد ہو گئی تھیں اسے اپنے باب کا نام بتانا پڑا تھا ایک دس سال کے بچے کو اپنے بارے میں کتنی معلومات ہو سکتی تھیں وہ سب اس نے پولیس کے گوش گزار کر دی تھیں پولیس انکسٹن سے اسے کن لوگوں کی کسٹری میں دیا گیا وہ نہیں جانتا تھا وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کس جگہ آچکا ہے۔ یہاں بہت سارے بچے تھے جو اس کی طرح گھر سے بھاگے ہوئے تھے یا بے سہارا اور لاوارث تھے مگر وہ جانتا تھا وہ ان سب میں سے نہیں ہے یہ اس کی دنیا نہیں ہے یہاں وہ کسی سے بات نہیں کرتا تھا دوسرے بچے اسے ہر وقت روتے دیکھ کر اس کا مذاق اڑاتے تھے اسے تنگ کرتے تھے اور وہ گھٹنوں میں سر دینے اپنے باپ کو یاد کرتا اور اسے بھی جسے وہ تارکیوں کے حوالے کرتا تھا اس کے دل میں یہ خوف بھی تھا کہ اگر اس کے باپ نے اسے ڈھونڈ لیا تو وہ اس کے ساتھ کیا کریں گے وہ کیا جواب دے گا اس کے بارے میں جسے وہ ان سے چھین چکا تھا اسے یقین تھا کہ اس کا باپ اسے ڈھونڈ لے گا اور چند دن بعد ہی اس کا یقین درست ثابت ہو گیا تھا۔ وہ زہر ہا تھا جب اس نے اپنی طرف آنے محسوس کو دیکھا تھا وہ کھٹی کھٹی آواز میں رو رہا تھا دوسری جانب ہشام اسے ساکت نظروں سے دیکھتے گھٹنوں کے تل اس کے قریب بیٹھ گئے تھے وہ اپنے بیٹے کو بچان نہیں سکے تھے وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ 15 دن گزرنے کے بعد یہاں آتے ہوئے ہشام کو بہت زیادہ امید نہیں تھی کہ وہ اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھ سکیں گے مگر اب وہ اسے دیکھ رہے تھے ان کا دل کانپ رہا تھا آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے وہ اسے اپنے بیٹے میں سمجھتی تھیں جو بلند آواز میں رو رہا تھا۔

”میں نے اسے کھو دیا پاپا! میں نے اسے کھو دیا۔“ ہلک ہلک کر روتا وہ ایک ہی جملہ دہرا رہا تھا اور پھر غم کی شدت سے ان کے بازو میں ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کو کس کڑی جرم کی سزا مل رہی ہے وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی فریادیں کیوں آسمان تک نہیں پہنچ رہی ہیں وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ نے ان کی آنکھیں تو انہیں لوٹا دی ہیں مگر یہانی کیوں نہیں واپس مل رہی تھی۔ وہ ڈھمکے تھے ٹوٹ چکے تھے اب وہ صرف ایک ہی کام کر سکتے تھے اور وہ تھا میر بیوی کے غم اور اجڑی کودکا ازلہ وہ نہیں کر سکتے تھے مگر جو کر سکتے تھے وہ انہوں نے کیا تھا میر بیوی کے سامنے ہاتھ جوڑے وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے اور وہ بس پڑ پڑاتی نظروں سے انہیں دیکھتی رہتی تھیں۔

☆.....☆

رات کا جانے کو سا پہر تھا اس کی جلتی آنکھیں نیند سے محروم تھیں وہ جانتا تھا کہ اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر

ایک ایسا گھر ہے جس کے کئیں اس کے لیے تڑپ رہے ہوں گے جو اپنے آپ سے بھی غافل تھی اور وہ خود بھی کہاں پر سکون تھا خرس سے بات کیے بغیر اس کی بے چینی کہاں ختم ہونے والی تھی وہ اس قدر بے خبری کی نیند نہیں سوتی تھی کئی بار اس نے پاپا کے خرس کو زبردستی آنکھیں کھولنے پر مجبور کرے اسے بتائے کہ وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے جانتا چاہتا ہے کہ وہ کیا سوچ رہی ہے مگر۔۔۔ اسی کشش میں رات گزرتی جا رہی تھی اور پھر اچانک اس نے خرس کو عجیب سے انداز میں اٹھتے دیکھا تھا۔

”خرس تم ٹھیک ہو؟“ اس کا سر ہاتھ پکڑتے ہوئے عارض نے کچھ تشویش سے اس کے سپاٹ چہرے کو دیکھا تھا وہ مہم سرخ روشنی میں وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں اتنے دن بعد تمہارے پاس آیا ہوں تم نے اب تک مجھ سے کوئی بات ہی نہیں کی۔“ ہاتھ کی پست دھیرے سے اس کی پیسے سے غم خشیانی اور خسران کے گرد پھیرتے ہوئے وہ ہلکے لہجے میں بولا تھا۔

”میں اپنے ساتھ ماموں جان اور ماما کو صرف تمہارے لیے آیا تھا مگر تم نے ان سے بھی باتیں نہیں کیں۔“

”کہاں ہیں وہ کیا وہ مجھے چھوڑ گئے؟“ اس کے لڑتے لہجے نے عارض کو تنگ کیا تھا۔

”وہ تمہیں کیوں چھوڑ کر جائیں گے؟ وہ دونوں سہیلی ہیں۔“

”مجھے ان کے پاس جانا ہے۔“ اس کے لہجے میں عجیب سا خوف تھا۔

”ابھی نہیں خرسن وہ لوگ سڑکی کھن اٹھا چکے ہیں ان کو آرام سے سونے دو تم صبح ان سے بات کرنا نہ وہ کہیں جا رہے ہیں نہ تم۔“ کھانے والے انداز میں وہ نرم لہجے میں بولا تھا دوسری جانب وہ چند گھنٹوں تک بغیر پلک جھپکے اسے دیکھتی رہی تھی۔

”میں جتنی بری ہوں تم اتنے دن بعد وہاں آئے ہو اور میں نے تمہاری خیریت کے بارے میں بھی نہیں پوچھا تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟“ اس کے چہرے کے گرد ہاتھ رکھے وہ جس طرح پوچھ رہی تھی عارض کچھ بول نہیں سکا تھا البتہ خرس کے لیے اس کی تشویش بڑھنے لگی تھی۔

”اب کبھی مجھے یہاں تو پھر پھر نہیں جانا تھا ہمارے دور جانے سے سب کچھ غلط ہونے لگا ہے تمہیں احساس ہونا چاہیے میری حالت کا میں امی اور بابا کو بھی یہاں سے نہیں جانے دوں گی سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا نہیں کوئی الگ نہیں کر سکے گا کوئی ہمارے درمیان نہیں آئے گا۔“ اس کے شانے سے سر نکالے وہ عجیب سی کیفیت میں بول رہی تھی اس کے بے دریا جملوں کو سننے ہوئے عارض کو کشش کر رہا تھا اس کی ذہنی کیفیت پر شہنہ کرے مگر وہ کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا خرس کا شانت رویہ لہجہ اس کی ایک ایک جہن کچھ بھی تو نازل نہیں لگ رہا تھا۔

☆.....☆

گھر سے سناؤں میں جب اچانک جھنجھو اور کراہوں سے درود پوار رزتے تو وہ سہم کر کسی کو نے میں چھپ جاتا اور پھر جیسے طوفان گزرنے کے بعد کھری خاموشی اور سکوت ہر سمت اپنے سیاہ پر پھیلا دیتا۔

صبح کو اچانک پڑتے ہشام کے دورے پڑتے جا رہے تھے ہلا خرد ہا چل میں ایلیٹ ہو گئیں تھیں ہشام اپنے لیے سانس لینا ختم کر چکے تھے وہ اگر زندہ تھے تو صرف اپنی بیوی کے لیے ان دونوں کو سنبھالنے کے لیے انہیں جبراً خود کو مضبوط رکھنا تھا ہر دن ہر رات ہر لمحہ ان کا دل خون ہوتا تھا جو اولاد ان کے پاس بھی اس کی

گم ہم حالت دیکھ کر وہ روز مرتے تھے اور جو اولاد ان سے دور ہوئی تھی اس کے لیے ان کی آنکھوں سے بہتا سیلاب روکے نہیں رکھتا تھا اس کا معصوم چہرہ آنکھوں کے سامنے لہراتا ان کی بے قراری کو حد سے سوا کر دیتا تھا۔ صرف چند دن اس فرشتے جیسے وجود سے ان کے دل میں ان کی زندگی میں روشنائی جگمگائی تھی مگر اب تو سارے عالم میں اندھیرہ تھا وہ زندہ بھی ہے یا نہیں؟ یہ سوال کسی اچھی ٹھکنے کی طرح ان کے دل کو جکڑ رہا تھا ان کی بے خواب بے چین راتیں اس کی یاد میں ترپتے ہوئے اس کے لیے اللہ سے فریاد کرتے ہوئے گزرتی تھیں صبر کرنا بہت صعب تھا مگر اللہ کے لیے ان کو صبر کرنا ہی تھا۔

گم سے غم حال رو رہے تھے پچھلے چند سال گزر گئے تھے عمر کے ساتھ جیسے جیسے اس کی عقل و شعور میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے اپنا آب ایک مجرم کی طرح لگتا تھا وہ اپنی ہی نظروں میں ایک گناہ گار تھا بچپن تو بہت پہلے ہی کئیں تاریکیوں میں ختم ہو چکا تھا اور اب ایک تنہائی اور اذیت کا خیل تھا جو اس کے گرد مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ صبیحہ سے شہر ہات کرنا تھا یہی نظر لگتا تھا اس کی کوشش ہوتی تھی کہ ان سے سامنا بھی نہ کرے مگر ایک گھر میں رہتے ہوئے ایسا ہونا ناممکن تھا صبیحہ بھی وہاں راست اسے مخاطب نہیں کرتی تھیں مگر وہ اس سے غافل نہیں تھیں گہری چپ کی یادداشت وہ اس کی اور اپنے شوہر کی ضرورتوں کا خیال رکھتا تھا جس گھر کے ماحول میں ہر وقت سو گاری اور دیرانی چھائی رہتی تھی دوسری جانب ہشام کی نظروں سے بھی بیٹے کی کم کوئی اور الگ تھلک رہنے کی عادت چھپی نہیں تھی اس کی دنیا اپنے کمرے کی حد تک ہی محدود کی اس کو اپنے آنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں ہی بند رہتا تھا کچھ اور کتا بوں کے علاوہ اس کی کوئی مصروفیت نہیں تھی وہ اپنے باپ سے بھی کچھ بچتا تھا ایک عجیب سی جھجک اور تکلف کا پردہ باپ بچے کے درمیان آچکا تھا مگر ہشام بھی کوشش کرتے تھے کہ اس کے گریز کو کم کریں وہ خود اس کے کمرے میں جا کر اس سے باتیں کرتے اس کی اسٹوری کے بارے میں سوالات کرتے آفس سے آنے کے بعد وہ اسے وقت دیتے تھے کیونکہ وہ اب بڑا ہو رہا تھا اس عمر میں داخل ہو رہا تھا جس میں اسے باپ کی زیادہ ضرورت تھی۔

ان دنوں اس نے اپنا اولیٰ مکمل کیا تھا جب گھر میں ایک عرصے بعد خوشی کی لہر دوڑی تھی پہلی بار اس نے باپ کے چہرے پر ایک چمکی مسکراہٹ دیکھی تھی صبیحہ ایک بار پھر ماں بنی تھیں اس بار اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا ان کی سوتلی کو دو بچے شاد و باد کیا تھا گھر کی دیران فضا کچھ خوشگوار ہوئی تھی مگر اس تبدیلی نے اس پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا اس نے بھی گھر میں ہونے والے اس نئے اضافے کو دیکھنے کی جرأت نہیں کی تھی جس دن صبیحہ ہسپتال سے گھر آئیں وہ تب بھی اپنے کمرے میں محو دور رہا تھا اپنے بچے کو لے کر جب ہشام اس کے کمرے میں آئے تو وہ بالکل زرد ہو رہا تھا جانے درود کا احساس تھا یا کچھ بتانے کی اذیت کہ وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ سکا تھا اسے سینے سے لگائے ہشام اسے کوئی دلاسا دینے کے قابل نہیں رہے تھے مگر پھر بھی انہوں نے بھی اسے مجبور نہیں کیا تھا کہ وہ ان کے بچے کی طرف متوجہ ہو اس کے گریز اس کے آنسوؤں کی وجہ سے جانتے تھے۔

اس رات وہ نہیں سکا تھا سفید کپل میں لپٹا وہ تھا جو داروہ تاریک بھیا تک رات اسے رلاتی رہی تھی۔ ننھے ایک کی آمد نے صرف گھر کی دیرانی کو دور نہیں کیا تھا بلکہ صبیحہ اور ہشام پر چھائے جو دو بھی توڑ دیا تھا۔ ایک نے ٹکٹوں کے بل چلنا شروع کیا تو گھر میں پہلے ہی رہتی صبیحہ کو گھر کے کام چھوڑ کر اس کے پیچھے پلکان ہونا پڑتا تھا ایک کی طرف سے ہارون کی لاشق کو وہ محسوس کرتی تھیں کبھی اگر لادان میں وہ بیوی دیکھنے کے لیے

پشتا تو ایک شعل اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرنا ایسے میں یا تو اسے بالکل ہی نظر انداز کرنا یا پھر اس کے سامنے سے ہی ہٹ جانا ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ہارون نے اس کے رونے پر اسے چپ کروانے کی کوشش کی ہو یا اسے بھی گود میں اٹھایا ہو۔ ایک کو گھر میں سارا دن ماں کے علاوہ ہارون ہی دکھائی دیتا تھا وہ بھی جب جب وہ کسی وجہ سے کمرے سے باہر نکلتا تھا اسی لیے وہ ہارون کے قریب جانے کی کوشش کرتا مگر ہر بار ہارون کی بے رخی اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی اس لیے وہ رو کر چیخ کر اپنے غصے کا اظہار کرتا تھا بچوں پر چلے تک اس نے ہارون کے کمرے میں گھسنے کی مہارت حاصل کر لی تھی ہر بار ہارون اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر چھوڑ دیتا تھا وہ بھی ایسا ہی ایک دن تھا جب ہارون نے اسے باہر کر کے دروازہ کھل بند کر دیا تھا۔ ایک نے چیخ چیخ کر گھر میں پراٹھا لیا تھا۔ دروازے پر ہاتھ مارا وہ اپنے ہی انداز میں احتجاج کر رہا تھا کچن میں موجود صبیحہ کچھ دیر تک مزید برداشت کرتی رہیں تھیں اور پھر ایک تک پہنچی تھیں اور پہلی بار انہوں نے بلند آواز میں ایک پر برستے ہوئے تین چار لمبے رسید کیے تھے اور اسے وہیں بچ کر اوپل کچن میں چلی گئیں تھیں کمرے سے باہر نکلے ہوئے ہارون نے ایک نظر فرش پر پھاڑیں کھاتے ایک کو دیکھا تھا اور پک کر اسے اٹھاتے ہوئے اس کے لمبا نچلے سرخ ہونے والے کالوں کو بے اختیار چوم لیا تھا کچن کی وڈو سے صبیحہ نے دیکھا تھا کہ ایک کو کندھے سے لگائے وہ اپنے کمرے میں واپس جا رہا تھا۔ اسی شام جب ہشام آفس سے واپس لوٹے تو ایک ناقابل یقین منظر انہیں دکھائی دیا تھا صوفے پر نیم دراز ہارون کے سینے پر ایک چڑھا ہوا تھا ایک کی گفتاریں اور ہارون کے سینے کی آوازیں نے ان کو تنگ کیا تھا ایک ایک سال کا ہونے والا تھا اور اس تمام عرصے میں انہوں نے پہلی بار اپنے بچوں کو اتنا قریب بٹنے کھٹکھٹاتے ہوئے دیکھا تھا ان کے دل کو کچھ راحت سی اسی پہل محسوس ہوئی تھی۔

بہت اچانک تو نہیں مگر انہوں نے اس شہر کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا وہ جانتے تھے کہ وہ جب تک اس شہر کو نہیں چھوڑیں گے ان کے گھر کوئی فرد ماضی کے اس سانحے سے نہیں نکل پائے گا یہاں ہارون کی شخصیت بالکل مٹ چکی ہو سکتی تھی اور وہ یہ کیسے ہوتا دیکھ سکتے تھے۔ صبیحہ کو اس سلسلے میں سمجھنا بہت صعب مرحلہ تھا مگر وہ ان کو سمجھانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔



زندگی کی پریچ راہوں سے گزرتے ہوئے انسان جس قدر احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے اپنے قافلے سے ہزار بے کی کوشش کرے مگر ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے کہ یا تو اس کے قدم قافلے کے ساتھ چلتے سے منعقد ہو جاتے ہیں یا پھر وہ خود قافلے سے کٹ جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ہے زندہ رہنے کا کوئی مقصد باقی نہیں بچا ہے۔ درودا ہی ہے وقت ٹھہر گیا ہے اللہ کے سوا سب سے رابطہ ٹوٹ گیا ہے اور پھر کیا ہوتا ہے؟ اچانک وہ وقت آ جاتا ہے جس میں احساس ہوتا ہے کہ اگر آسمان پر اللہ اس کے ساتھ ہے تو اس زمین پر ایسے بندے بھی موجود ہیں جن کے ذریعے اللہ نے اسے وہ سب کچھ لوٹا دیا ہے بلکہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ۔ وہ سب کچھ جو اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا تھا۔ ان دوا سنوں کا شمار بھی اللہ کے ان ہی بندوں میں ہوتا تھا جن کو دیکھنے کے لیے جن سے رو رو رہے تھے اس لیے وہ بے چین تھے اور وہ لخت گیا تھا بڑے اور بڑے والے اس بارش انسان سے ان کو تعارف کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔

(جاری ہے)

حسن تر و متوجہ ہائے کا



”واہ! کیا عالی شان اسکول ہے۔“ اس کی آنکھیں اس اسکول کی عمارت کو دیکھ کر چلکیں جھپکنا بھول گئیں۔

”میں تو اس اسکول میں پڑھاؤں گی۔“ نامیہ نے فوراً ہی فیصلہ سنایا۔

”تو چلو پھر چل کر انٹرویو دیتے ہیں۔“ سونیانے کہا۔

”یار نامیہ! اتنا بڑا اور عالی شان اسکول ہے ہم بی اے پاس کو جا بل جائے گی اس میں، تمہیں کیا لگتا ہے؟“ سونیانے نامیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں میرے پاس وہ حسن ہے جو بڑے بڑے امیر زادوں کو میرے قدموں میں لاسکتا ہے۔“ سونیانے کہا۔

”نامیہ! اتنا غرور اچھا نہیں۔“ سونیانے اسے سمجھایا۔ سونیانہ نامیہ کی بہت اچھی دوست اور سہیلی ہوئی تھی۔ بعد ازاں کی مٹی، اچھی شکل و صورت تو اس کی بھی اچھی تھی مگر نامیہ بہت خوب صورت اور مغرور لڑکی تھی جسے خود پر بہت بھروسہ تھا۔ وہ ایک ملل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن اسے گھرانے کے بعد وہ اسکول جاب کی تلاش میں تھی۔

سونیانے ڈرتے ہوئے آفس کا دروازہ ٹوک کیا۔ اجازت ملتے ہی دونوں اندر داخل ہو گئیں۔

”Yes“ آفس میں بیٹھے پرنسپل نے دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”السلام علیکم سہ۔“

”وعلیکم السلام، مٹی فرمائیے؟“

”دراصل ہم Teaching کے لیے آئے ہیں۔“ سونیانے کہا۔

”واہ! تعریف رکھیے۔“ پرنسپل نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”مٹی آپ کا نام؟“ نامیہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا کیا۔

”نامیہ ناز۔“

”تعلیم بی اے۔“

”پڑھانے کا شوق ہے یا ضرورت؟“ پرنسپل نے کہا۔

”مٹی شوق ہے۔“ نامیہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے کل سے آپ دونوں جوائن کر سکتی ہیں۔“

”جھپک پھر!“ نامیہ کے بھائے سونیانے کہا۔

”یار نامیہ! پرنسپل تو کافی اثر کیٹو اور یک ہے۔“

اس نے تجھ سے انٹرویو لیا تجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔“

اسکول سے نکلے ہی سونیانے کہا۔

”ارے میں نے تو کہا تھا ناں کہ میرے حسن کو دیکھ کر کون نہیں دے گا جاب اب دیکھنا میرے ہاتھ تجھے بھی بغیر انٹرویو کے مل گئی جاب۔“ نامیہ نے اتراتے ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے یار! مان گئی تجھے۔“ سونیانے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں ہے میری جان مجھے۔“

رکتے دو اسکول کے اندر، اس پرنسپل اور اسکول پتائے بنایا تو کہا۔ ”نامیہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”کیا۔۔۔؟“ سونیانہ حیران ہوئی۔

”کیا کرو گی تم نامیہ؟“ سونیانے سوال کیا۔

”میں کہاں کچھ کروں گی سب میرا یہ حسن کرے گا۔ میں نے اپنی اداؤں سے اسے اپنا نہ بنایا تو کہا۔“ نامیہ نے کہا۔

”نامیہ! یہ اچھی بات نہیں غرور اللہ کو ناپسند ہے۔“

سونیانے کہا۔

”یار سونیانہ! مجھے لگتا ہے تو بھی اور لڑکیوں کی طرح مجھ سے چپکس ہو رہی ہے۔ صرف تجھے ہی میں نے اپنی فریڈ ملکہ بیٹ فریڈ ہونے کی خوش قسمتی بخشی ہے۔“ نامیہ نے ناراضی کا اظہار کیا۔

”انکی بات نہیں ہے نامیہ! تم میری اچھی دوست

ہو۔ جب ہی تمہیں سمجھاتی ہوں۔“ سونیا نے پیار سے کہا۔
 ”جیل چھوڑ یا راہاتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ کل سے اسکول آنے کی تیاری کر لیا۔“ نامیہ نے بے دلی سے کہا۔

☆.....☆

اسٹاف روم میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنے پیچھے سے آواز کی۔
 ”ہیلو مس؟“
 ”نامیہ کہتے ہیں مجھے۔“ نامیہ نے سر کر دیا۔
 ”اوہ ٹاکس ٹو میٹ یو۔“

you are so pretty
 "I am Farhi"

اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ایک دلکش مسکراہٹ اس کے چہرے پر عیاں تھی۔
 ”او کے۔“ نامیہ نے فرمی سے جان چھڑانی چاہی۔

”نامیہ! فرمی تم سے دوستی کرنا چاہ رہی تھی۔“ سونیا جو کہ نامیہ کے ساتھ ہی کھڑی تھی، اس نے کہا۔
 ”میں دوست نہیں بناتی میرے لیے ایک تو ہی کافی ہے۔“ نامیہ نے کہا۔

”Yes sir“ آپ نے بلایا۔ نامیہ نے آفس میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ جہاں سرفہدا کیلے بیٹھے تھے۔

”جی ہاں مس نامیہ! آپ اپنی کلاس کے بچوں کی رپورٹ کارڈ دکھائیں مجھے پلیز۔“

”او کے سر!“ اس نے ایک ادا سے کہا۔

”سر! میں ابھی لے کر آتی ہوں۔“ اسے اسٹاف روم کی طرف آتے دیکھ کر سونیا نے پوچھا۔

”کیا ہوا دوبارہ آفس؟“

”ہاں جاری ہوں اس پر پائل فہد پر اپنے حسن کا جادو کرانے۔“ نامیہ نے ہالوں کو سیٹ کرتے ہوئے

کہا۔ اس نے دوپٹہ ٹھیک کیا ہاتھ میں رپورٹ کارڈ اٹھا کر آفس کی طرف چل دی۔

”سر! یہ رپورٹ کارڈ ہے آپ ری چیک کر کے سائن کر دیں۔“ آج پہلی بار فہد نے اسے آنکھ بھر کے دیکھا گو کہ وہ ایک شریف انسان تھے۔ ماں باپ کے اکلوتے 27 سال کے سرفہد نے آج تک کسی بچے میں دلچسپی نہیں لی۔ پر نہ جانے کیوں آج اسے دیکھا تو دیکھتے ہی رہے۔

اس کا لہا قد، گوری رنگت، کھڑی ناک، کبھی پلکیں، کاسنی پنک کمر کے سوٹ میں وہ پنک روز لگ رہی تھی۔

”سر! یہ آپ اس پر بھی سائن کر دیں۔“ اس نے دیکھتے ہوئے دوسری رپورٹ کارڈ آگے کی۔ ”وہ کب کی سائن لے کر جا چکی تھی مگر سرفہد اس کی خوشبو میں اس کے حسن میں پوری طرح کھو چکے تھے۔

”مس نامیہ!“ وہ اسٹاف روم میں اکیلے تھی۔ فری پریڈ میں ریٹ کرنے بیٹھ گئی۔ لائٹ فیروز سی سوٹ میں وہ قدرے بے تکلف سی بیٹھی چوڑیوں سے کھیل رہی تھی کہ سرفہد کی آواز پر چونک گئی۔ سرفہد راؤنڈ پر تھے نامیہ پر نظر پڑی تو اسٹاف روم کی طرف آگئے۔

”آپ سے کچھ کہنا ہے پلیز آفس میں تشریف لائیں۔“ نامیہ کو کہہ کر وہ آفس کے اندر چلے گئے۔

”جی سر!“ نامیہ اندر داخل ہوئی۔

”مس نامیہ! میں آپ سے پرسل سوال کر سکتا ہوں۔“

”Yes sir۔“ نامیہ نے کہا۔

”Are you engage?“ سرفہد نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”No sir“

”Is some one special in your life?“

ہمدرد کا شربت فولاد

یونند یونند میں فولاد

مضبوط رکھئے جیسے فولاد

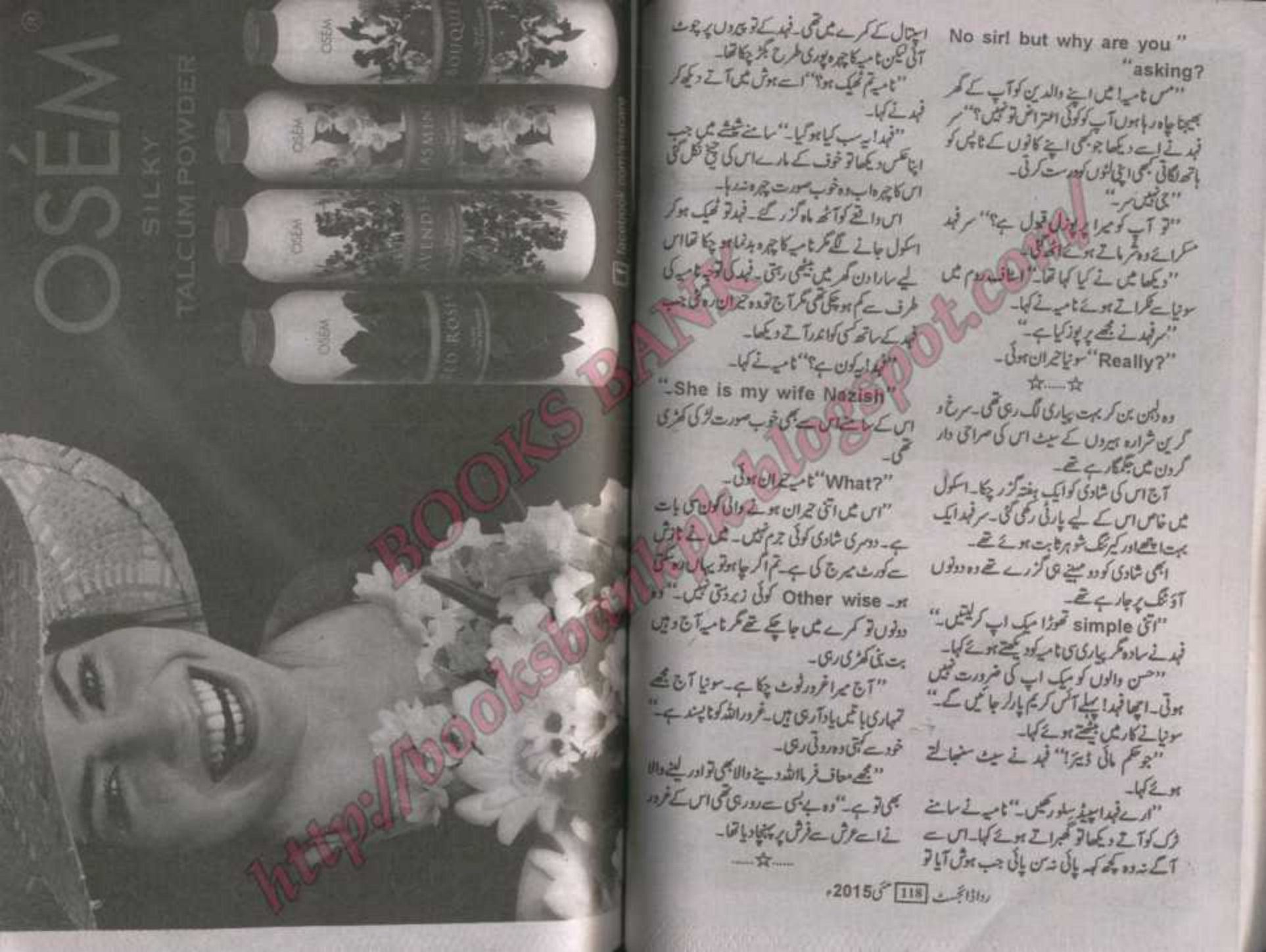
بچوں بڑوں میں سبھی کے لئے نہایت مفید و موثر

دینی و جسمانی طاقت کے لئے ہمدرد کا شربت فولاد جس کی یونند یونند میں ہے فولاد کی طاقت۔ خاندان کے ہر فرد کے لئے شربت فولاد جو روکے دن بھر چاق و چوبند۔

- بڑھتی عمر کے لئے
- بیماری کے بعد کمزوری دور کر کے
- فولاد میں موثر



ہمدرد



OSEM
SILKY
TALCUM POWDER

ہسپتال کے کمرے میں تھی۔ فہد کے تو بھروسے پر پڑت
آئی لیکن نامیہ کا چہرہ پوری طرح بگڑ چکا تھا۔
"نامیہ تم ٹھیک ہو؟" اسے ہوش میں آتے دیکھ کر
فہد نے کہا۔
"فہد ایسے کیا ہو گیا۔" سانسے شیشے میں جب
اپنا عکس دیکھا تو خوف کے مارے اس کی چیخ نکلی تھی
اس کا چہرہ اب وہ خوب صورت چہرہ نہ رہا۔
اس واقعے کو آٹھ ماہ گزر گئے۔ فہد تو ٹھیک ہو کر
اسکول جانے لگے مگر نامیہ کا چہرہ بدلتا ہوا چکا تھا اس
لیے سارا دن گھر میں بیٹھی رہتی۔ فہد کی تو یہ نامیہ کی
طرف سے کم ہو چکی تھی مگر آج تو وہ حیران رہ گئی تھی جب
فہد کے ساتھ کسی کو اندر آتے دیکھا۔
"فہد ایسے کون ہے؟" نامیہ نے کہا۔

"She is my wife Nazish"

اس کے سامنے اس سے بھی خوب صورت لڑکی کھڑی
تھی۔

"What?" نامیہ حیران ہوئی۔

"اس میں اتنی حیران ہونے والی کون سی بات
ہے۔ دوسری شادی کوئی جرم نہیں۔ میں نے نازش
سے کورٹ میرج کی ہے۔ تم اگر چاہو تو یہاں رہ سکتی
ہو۔ Other wise کوئی ذمہ داری نہیں۔" وہ
دونوں تو کمرے میں جا چکے تھے مگر نامیہ آج وہیں
بت بنی کھڑی رہی۔

"آج میرا غرور ٹوٹ چکا ہے۔ سونیا آج مجھے
تمہاری باتیں یاد آ رہی ہیں۔ غرور اللہ کو ناپسند ہے۔"
خود سے کہتی وہ روٹی رہی۔

"مجھے معاف فرما اللہ دینے والا بھی تو اور لینے والا
بھی تو ہے۔" وہ بے بسی سے دور رہی تھی اس کے غرور
نے اسے عرش سے فرش پر پہنچا دیا تھا۔

☆.....☆

"No sir! but why are you " asking?"

"میں نامیہ! میں اپنے والدین کو آپ کے گھر
بھیجتا چاہ رہا ہوں آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟" سر
فہد نے اسے دیکھا جو بھی اپنے کانوں کے ناچس کو
ساتھ لگاتی کبھی اپنی لٹوں کو درست کرتی۔

"جی نہیں سر۔"
"تو آپ کو میرا یہ سوال قبول ہے؟" سر فہد
مسکراتے وہ فرماتے ہوئے اٹھ لی۔

"دیکھا میں نے کیا کہا تھا۔" اسانف دوم میں
سونیا سے ٹکراتے ہوئے نامیہ نے کہا۔

"سر فہد نے مجھے پروا کیا ہے۔"
"Really?" سونیا حیران ہوئی۔

☆.....☆

وہ دلہن بن کر بہت پیاری لگ رہی تھی۔ سرخ و
گرین شرارہ ہیروں کے سیٹ اس کی صراحی دار
گردن میں جھنگا رہے تھے۔

آج اس کی شادی کو ایک ہفتہ گزر چکا۔ اسکول
میں خاص اس کے لیے پارٹی رکھی گئی۔ سر فہد ایک
بہت اچھے اور کیرئیر شوہر ثابت ہوئے تھے۔

ابھی شادی کو دو مہینے ہی گزرے تھے وہ دونوں
آؤٹنگ پر جا رہے تھے۔

"اتنی simple تھوڑا میک اپ کر لیتیں۔"
فہد نے سادہ مگر پیاری ہی نامیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"حسن والوں کو میک اپ کی ضرورت نہیں
ہوتی۔ اچھا فہد! پہلے آئس کریم پارل جائیں گے۔"
سونیا نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جو حکم مائی ڈیڑرا" فہد نے سیٹ سنبھالنے
ہوئے کہا۔

"ارے فہد اسپینڈ سلور رکھیں۔" نامیہ نے سامنے
ٹرک کو آتے دیکھا تو ٹھہراتے ہوئے کہا۔ اس سے
آگے نہ وہ کچھ کہہ پائی نہ سن پائی جب ہوش آیا تو

اعتبار

خالی جی پٹے میں وہ چادر ہی کالج کے لان میں
آہٹھی تھیں۔ موسم بہت خوشگوار اور آلود تھا۔ ہلکی
پھوار نے اس موسم کو اور زیادہ دلکش بنا دیا تھا۔ خسار کا
پڑا۔ رمشا سب سے باری باری پوچھ رہی تھی۔



کالج کی چٹک پر کیا ڈریٹنگ کرنے والی ہیں جب کہ
زوبلی خاموشی سے سب کی باتیں سن رہی تھی۔ نیلم نے
جب زوبلی سے پوچھا۔ ”تم کیا پتہ لگائی؟“
تو اس نے بہت اداسی سے کہا۔ ”کچھ نہیں۔“
جس پر سب ہی بے اختیار ہنس پڑیں۔
”اماں ایہ پاکستان ہے“ کچھ نہیں ”نہیں ملے گا۔“
”افو میرا مطلب کل میں نہیں آ رہی۔“ قدرے
بے زاری سے زوبلی نے انکشاف کیا۔
”کیوں؟“ سب نے حیرت سے کہا۔
”میری امی اجازت نہیں دیں گی۔“
”لو تم نے پہلے ہی طے کر لیا تمہیں اجازت نہیں
دیں گی تم بات تو کر کے دیکھو۔“ نیلم نے صلاح
دی۔
”بات کر چکی ہوں انہوں نے صاف منع کر دیا۔“
”اگ بار پھر کوشش کرنا وہ مان جائیں گی۔“ اب
کی بار پھر شار نے حوصلہ دیا۔
”ہوسم م۔“ زوبلی نے بھی بات ختم کرنے کے
لیے ہائی بھر لی۔
”جی بیک ختم ہو گیا تھا۔ نیلم زوبلی سے بات کرنا
چاہتی تھی۔ اس لیے رخسار اور رمشا تو ہمیں کہیں جب
کہ زوبلی اور نیلم نے جی پٹے تک کر لیا۔
”تم اتنا اداس کیوں ہو رہی ہو وہ تمہاری امی ہیں
تھوڑا پیار سے کہو کی تو مان جائیں گی۔“ نیلم نے پھر
ایسا بات چیرائی۔
”تم ان کو نہیں جانتیں اسی لیے ایسے کہہ رہی ہو وہ
بھری امی ہیں۔ میں ان کو اچھی طرح جانتی ہوں وہ
بھی بھی مجھے اجازت نہیں دیں گی۔ بچپن میں
ہمارے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ ہم تین بہنیں ہیں
بھائی کوئی نہیں ہے، امی نے ہم پر شروس سے ہی اپنی
سختی رکھی کہ ان سے بات کرتے ہوئے ڈرنا ہے
کب کس بات پر خفا ہو جائیں۔“ زوبلی اچانک جوش
میں آ گئی۔ لانا تھا اپنے دل کی ہر بات کہہ دینا چاہتی

ہو۔
”جہیں چاہے بچپن سے جب ہمیں کوئی چیز
چاہیے ہوتی تھی تو ہم آتی سے کہتی تھیں اور آپنی ان
سے بات کرتی تھیں مگر اب تو ان کی بھی شادی ہو گئی
ہے اور وہ پاکستان میں بھی نہیں ہیں۔ ہر چھوٹی بات
پر ان کو کیا پریشان کروں۔“
میری تو ہر وقت امی سے بات کرتے ہوئے جان
جاتی ہے یہاں تک کہ کچھ دنوں پہلے کہ ایک لڑکے
سے مجھے بہت خوف آتا تھا اور میں بہت ڈرتے
ڈرتے کھرے نکلتی تھی ہر راستے پر وہ آوارہ کھڑا ہوتا
تھا۔ اس کا ذکر بھی امی سے نہ کر سکی ان سے کہیے بات
کرتی وہ تو لانا مجھے ہی الزام دیتیں وہ تو آپنی سے
بات ہوتی تو امی نے سارا مسئلہ حل کیا اب سکون ہے
مگر پھر بھی ہر وقت ہم بہنوں پر شک کرتی ہیں۔“ اس
کی آواز رندہ کی تھی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ نیلم
زوبلی کے اندر کا خیار نکالنا چاہتی تھی۔ وہ اندر ہی
اندر گھٹ رہی تھی مگر ماں کے ہوتے ہوئے وہ ان
سے کچھ بھی نہیں کہہ پا رہی تھی جب کہ ماںیں تو سب
سے اچھی دوست بن سکتی ہیں۔
”تم فکر نہ کرو میں تمہاری امی سے بات کرتی
ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ نیلم نے اس کا دل
رکھنے کے لیے کہہ دیا۔
”نہیں! کچھ ٹھیک نہیں ہو گا اور تم فون مت کرنا
ورنہ وہ سمجھیں گی کہ میں نے تم سے کہا ہے۔“ اپنی
آنکھیں صاف کرتے ہوئے زوبلی اپنے ڈر کے
اعتراف میں نیلم کو منہ کر رہی تھی۔
”گھر آ کر نیلم کو کسی طرح بچپن ہی نہیں آ رہا تھا۔
اسے زوبلی کی امی سے بات کرتی تھی اس نے فیصلہ کیا
اور زوبلی کے گھر کا نمبر ڈائل کر دیا۔
”السلام علیکم؟“
”وعلیکم السلام جی فرمائیے۔“
”آپ زوبلی کی امی بات کر رہی ہیں۔“

Hankies

... absorbent
..... elegant
..... & luxury



Customer Service
H&P
Home & Hygiene Products

AKS DHOOT

مقابلہ کر سکے گی۔

Any ways مجھے یقین ہے کہ آپ میری باتوں پر غور ضرور کریں گی اور یہ بھی یقین ہے کہ اس پر مجھ کو سنا کر تے ہوئے اسے وہ اعتماد ضرور دیں گی جس کی اسے شدت سے ضرورت ہے میری کوئی بات بری لگی ہو تو معذرت چاہتی ہوں آگے آپ کی مرضی وہ آپ کی بنی ہے۔ آپ اس کا اچھا برا مجھ سے بہتر سمجھتی ہیں۔ اپنا خیال رکھیے گا، اللہ حافظ۔ ”زوئی کی امی فون کٹ جانے کے بعد سوچتی رہ گئیں۔ یہ باتیں بھری لڑکی مجھ سے کیا کہہ گی۔

اگلے دن وہ تینوں کالج میں بیٹھ کر یاد تک میں چمک بس میں سامان رکھتا ہوا دیکھ رہی تھیں ساری ہی لڑکیاں خوش تھیں۔ رخسار اور رشما کہہ رہی تھیں کہ زوئی نہیں آئے گی کل رات بھی رخسار کی زوئی سے بات ہوئی تھی اس کی امی نے اجازت نہیں دی لیکن فیلیم بہت برا ہوا دیکھ میں کہہ رہی تھی۔ ”زوئی آئے کی ضرور آئے گی تم لوگ دیکھنا۔“ اور تھوڑی ہی دیر میں زوئی کالج گیٹ سے اندر داخل ہوئی ہوئی نظر آئی۔

رخسار اور رشما ہنسی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئیں۔ ”تم کیسے آ گئیں تمہاری امی نے تو اجازت ہی نہیں دی تھی۔“

”ہاں رات تک تو نہیں دی تھی پتا نہیں کیسے صبح کو خود اٹھا کر بولیں تمہیں چمک پر نہیں جانا میں تو سو رہی تھی کاب جانا نہیں۔“

”پتا نہیں یہ کس شے سے ہو گیا۔“ زوئی کے چہرے پر ہر اعتماد مسکراہٹ تھی۔ فیلیم کا یقین پختہ ہو گیا۔ ہماری سب مائیں ہم سے بے انتہا محبت کرتی ہیں بس سبھی بھی ہماری بہتری کے لیے اور معاشرے کی گرم اور تیز ہواؤں سے بچانے کے لیے بخشنے سے کام لیتی ہیں۔

☆

”جی بول رہی ہوں۔“

”آئی امیں ٹیم بات کر رہی ہوں۔“

”زوئی کی دوست اچھا چٹا امیں اس کو بلاتی ہوں۔“

”تمیں آئی آپ اسے نہ بلائیں مجھے اصل میں آپ سے بات کرنی ہے۔“

”مجھ سے امی بولیں۔“

”آئی آپ کو معلوم ہے کہ کل ہمارا کالج چمک پر چارہ ہے تو کیا آپ زوئی کو بھی ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دیں گی؟“

”دیکھو چٹا ہمارے یہاں اس طرح لڑکیوں کو اکیلے جانے کی اجازت نہیں ہے۔“

”لیکن آئی او اے کیل کب ہو گی ہم سب ہوں گے اور سب سے بڑھ کر پورے کالج کی لڑکیاں ہوں گی اور پھر ہمارا سارا اسٹاف ساری بچہ زہوں کی تین بیس بھر کر چار ہی ہیں۔“

”چار ہی ہو گی لیکن ہمارے گھر کی چچیاں ایسے نہیں جانتیں۔“

”آئی آپ چاہیں تو کالج آ کر دیکھ سکتی ہیں۔“

”یہ سب ٹھیک ہے لیکن زوئی نہیں جائے گی۔“

”ٹھیک ہے آئی جیسے آپ کی مرضی ویسے میں اور ہمارے گروپ کی ساری ہی لڑکیاں چار ہی ہیں اور ایک بات میں یہ اعتماد سے کہہ سکتی ہوں کہ میرے والدین کو مجھ پر بھروسہ ہے اسی لیے میں ان کے اعتماد کو کبھی نہیں پہنچاؤں گی۔ حیرت کی بات ہے میں زوئی کو چند مہینے پہلے سے جانتی ہوں مگر پھر بھی کہہ سکتی ہوں کہ وہ بھی کبھی کوئی غلط کام نہیں کر سکتی۔ لہذا آپ بھی اپنی تربیت پر پورا بھروسہ کرتی ہوں گی مگر آج آپ اس پر اپنا یہ اعتماد ظاہر نہیں کریں گی تو ساری زندگی اس میں خود اعتمادی پیدا نہیں ہوگی۔ آپ اسے پرہیز تو رہی ہیں لیکن اس تعلیم کا صحیح مقصد اسی وقت حاصل ہو گا جب وہ پر اعتماد ہوگی تب ہی وہ دنیا کا

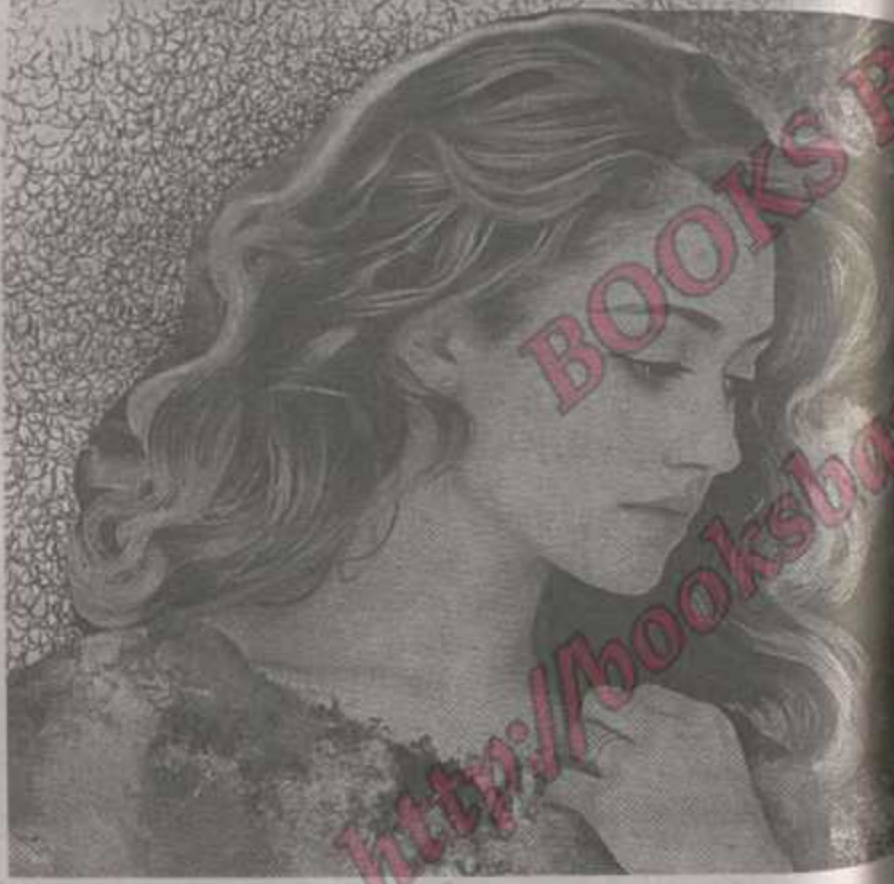
ایک تہی زویب

وہ دھلے ہوئے کپڑوں کی نوکری اٹھائے
میر حیاں اتر رہی تھی۔ اس کے آگے تین سال
تھا۔ اچانک وہ جھکا اور میر حیاں سے لڑھکتے ہوئے



بچے جاگرا اور اس کے سر سے خون کا فوارہ پھوٹ
پڑا۔ ہادی کی چھٹوں میں اس کی چھٹیں بھی شامل
ہو گئیں۔ اس اور وہ نوکری پھینک کر دوڑتے ہوئے
میر حیاں اتر کر نیچے آئی اور اس کو اپنی گود میں
اٹھالیا۔ ان کی چھٹیں سن کر طاہرہ اور اباجی بھی ان تک
پہنچے۔ طاہرہ ہادی کو اس حال میں دیکھ کر روپ اٹھا۔
”تم نے اپنی اصلیت دکھا دی اپنے بچے کے
پیدا ہونے سے پہلے اسے مارنے کی کامیاب
کوشش کی ہے تم نے۔ تم لاکھ پیار جتاؤ مگر تم ہو تو
اس کی سوتیلی ماں اور آج تم نے سوتیلے پن کی اس

جگہ کو ظاہر کر ہی دیا۔ اگر آج میرے بیٹے کو کچھ
ہو گیا تو میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا
سبب نہیں۔“ طاہرہ، ہادی کو اس کی گود سے جھپٹے
ہوئے خرایا۔
وہ اس الزام پر سن ہو کر رہ گئی اور اباجی خاموش
تماشا ہی بنے یہ سب دیکھتے رہے۔ وہ ہادی کو لے کر
ہسپتال چلا گیا اور وہ میر حیاں پر بے دم سی ہو کر بیٹھ
گئی۔ اباجی آگے بڑھے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ
کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ طاہرہ کے الفاظ نے
اسے اندر تک کاٹ کر رکھ دیا تھا اور اس تکلیف سے



نکلنے والے آنسو اس کا دامن بھگونے لگے تھے۔

☆.....☆

نصیب کو شروع سے ہی بچے بہت اچھے نکتے تھے۔ وہ گل تین بہن بھائی تھے۔ بڑی آپا! اسد بھائی اور نصیب۔ نصیب اپنے گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ جب وہ انھیں جماعت میں تھی تو سامنے والی نصرت باجی (یہ رشتے میں نصیب کی کزن تھیں) کے ہاں ان کی سب سے بڑی بیٹی آمنہ پیدا ہوئی۔ نصیب کی تو بھوید ہو گئی۔ وہ اپنا سارا وقت نصرت باجی کے پاس گزارتی اور آمنہ کو اٹھائے اٹھائے پھرتی۔ آمنہ چھوڑی بڑی ہوئی تو وہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئی۔ آمنہ بھی اس سے بہت میل گئی تھی اور اس کے پاس بہت خوش رہتی تھی۔ آمنہ جب تک اس کے پاس رہتی نصرت باجی بے فکر رہیں کیونکہ نصیب چھوٹے ہونے کے باوجود آمنہ کا بہت خیال رکھتی تھی۔ آمنہ رات کو سوتی تو وہ اسے نصرت باجی کے پاس چھوڑ کر جاتی صبح اٹھتے ہی آمنہ نصیب کے پاس جانے کو بے قرار۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھیں۔ جب نصیب سینکڑے ایئر میں آئی تو آمنہ نے بھی اسکول جانا شروع کر دیا۔ آمنہ کی دیکھا دیکھی اس کے چھوٹے بہن بھائی بھی اس سے اچھے ہو گئے تھے۔ وہ بھی زیادہ تر اسی کے گرد پائے جاتے تھے۔ نصرت باجی سب سے سبکی کہیں۔ ”بھئی بچی بات تو یہ ہے میری آمنہ کو تو نصیب نے ہی پالا ہے۔

نصیب میں کوئی تو خاص بات ضرور ہے جو بچے اتنی جلدی اس کی طرف مائل ہو جاتے تھے اور اس کے پاس خوش اور مطمئن رہتے تھے اگر وہ روتے ہوئے بچے کو بھی اٹھا لیتی تو وہ بھی چپ ہو جاتا تھا۔ بچے پہلی ملاقات میں ہی اس کے اچھے خاصے دوست بن چکا کرتے تھے۔ بچے اس کے پاس بہت خوش اور مطمئن رہا کرتے تھے۔ مارکیٹ یا کسی

پبلک پلس میں وہ کسی بچے کو مسکرا کر دیکھ لیتی تو بچہ ہلکے ہلکے کر اس کے پاس جانے کو تیار ہو جاتا۔ کچھ مائیں تو اس صورت حال کو بہت انجوس کرتیں اور بچے کے ساتھ خود بھی نصیب کی طرف متوجہ ہو کر دو چار باتیں کر لیتیں لیکن کچھ سڑیل قسم کی وہی مائیں ایسی صورت حال میں اس کو یوں کھڑک دیتیں جیسے وہ ان کا بچہ چھین کر بھاگ جائے گی اور اپنے بچے کی توجہ ادھر ادھر کرنے میں مصروف ہو جاتیں۔ سب اس کو چھیڑتے کہ یہ تو جادو کر ہے جو دوسروں کے بچوں کو اپنے بس میں کر لیتی ہے اور وہ ایسے بیمار کس پر دل کھول کر نہیں دیتی۔

نصیب سینکڑے ایئر میں تھی جب بڑی آپا چاہہ امریکہ چلی گئیں۔ وہ دو تین سال بعد پاکستان کا چکر لگا پائیں تھیں۔ ان کے تینوں بچے دور ہونے کے باوجود نصیب کے بہت قریب تھے۔ چار سال پہلے اسد بھائی کی شادی ہوئی تھی اور اس کے سال ڈیڑھ سال بعد باجین پیدا ہوئی۔ باجین بھی اس کے ساتھ بہت اچھی تھی۔ وہ بہت اچھی تھی اور بہت محبت کرنے والا دل رکھتی تھی مگر یہ نہیں کیوں اس کی بات ابھی تک کہیں نہیں سنہری تھی۔ حالانکہ کہ اس کو ماسٹرز کیے ہوئے پانچ سال ہونے لگے آئے تھے۔ اس کے امی ابو اس بات کو لے کر خاصے پریشان تھے۔

ظاہر اسد کا بہت اچھا دوست تھا۔ اسد کے ساتھ اکثر گھر آ جاتا تھا۔ اسد اور ظاہر کی یہ دوستی دونوں خاندانوں کی بھی دوستی بن چکی تھی۔ نصیب اپنی امی کے ساتھ دو تین بار ظاہر کے گھر جا چکی تھی اور ظاہر کی امی ہاجرہ بیگم اکثر ان کے ہاں آ جاتی تھیں۔ کیونکہ ہاجرہ بیگم کی دونوں بیٹیاں بیواہ کر ملک سے باہر جا چکی تھیں۔ اب اس گھر میں تین نفوس (ہاجرہ بیگم، اسلم صاحب اور ظاہر) ہی ہوتے تھے۔ پھر اسد اور ظاہر کی شادیاں بھی دو تین مہینوں کے

فرق سے آ کے پیچھے ہی ہو گئیں تھیں۔ شادی کے بعد ظاہر کی بیوی فاخرہ بھی اس کے ساتھ آ جاتی تھی۔ فاخرہ کی نصیب اور بھائی شام کے ساتھ خوب گاڑھی چٹختی تھی۔ پھر ہفتی مسکراتی پیاری سی فاخرہ کے ساتھ وہ ہو گیا جو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ڈیوری کے لیے ہاسٹل گئی اور ہادی کو جنم دے کر خود ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند گئی۔ ظاہر اور اس کی بیٹی پرتو جیسے آسان ٹوٹ پڑا تھا۔ نصیب کی بیٹی بھی اس سلسلے پر کئی دنوں اداس رہی۔

☆.....☆

وقت کسی کے لیے نہیں رکتا۔ دکھ ہو یا سکھ یہ اپنی مخصوص ڈگر پر چلتا رہتا ہے۔ فاخرہ کے انتقال کے تین ماہ بعد باجین پیدا ہوئی تو ظاہر اپنی ماں کے ساتھ اسے دیکھنے آیا۔ وہ بہت کمزور اور بچھا ہوا لگ رہا تھا۔ نصیب نے جادو جیگم سے ہادی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا۔ ”کیا تاؤں اس بد نصیب کے بارے میں جس نے اپنی ماں کا کس تک محسوس نہیں کیا۔ وہ بہت کمزور ہے۔ بیٹا یہ تو حقیقت ہے ماں کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ میں تو اسے اچھی طرح سنبھالتی ہوں لیکن ذرا کوتاہی ہونے پر اس کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ اس کی نانی اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہیں لیکن ظاہر نہیں مانتا۔ کہتا ہے میرا بیٹا میری نظروں کے سامنے رہتا چاہیے۔ بیٹا تم ہمارے حق میں دو کا کیا کرو۔“ ہاجرہ بیگم کے اصرار پر نصیب نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی۔

وقت کچھ آگے بڑھا۔ اب ہادی تین سال کا اور باجین پونے تین سال کی ہو چکی تھی۔ آج ہاجرہ بیگم کافی دنوں بعد ان کے گھر آئیں گئیں۔

”السلام وعلیکم آئی۔“
”وعلیکم السلام بیٹا!“ انہوں نے اس کے سر پر

پیارے ہاتھ پھیرا۔

آج ان کے ساتھ ہادی بھی آیا تھا۔ نصیب نے اسے دیکھا تو بے اختیار ماہین سے اس کا موازنہ کر ڈالا۔ ہادی اپنی عمر کے لحاظ سے بہت کمزور اور سہا ہوا سا لگ رہا تھا۔ ورنہ اس کی عمر کے بچے خاص طور پر لڑکے تو بھاگ دوڑ میں دلچسپی لیتے ہیں۔ نصیب کے دل میں جیسے ہادی کے لیے متا اہل پڑی تھی۔

”ہادی بیٹا! ادھر آؤ میرے پاس۔“ اس نے بازو پھیلائے تو ہادی نے سکی ہوئی نظروں سے اپنی دادی کی طرف دیکھا۔

”جاؤ بیٹا شاہاش۔“ دادی نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ کچھ لمحوں بعد ہادی جھٹکا ہوا اس کے پاس گیا۔ اس نے اس کے گالوں پر چٹ پٹ پیار کیا اور اسے لے کر اپنے لان میں چلی آئی۔ جہاں آمنہ اس کے بھائی اور باجین کھیل رہے تھے۔ وہ اسے بھی کھیلنے پر اکسانے لگی۔ تھوڑی دیر میں اس کی جھجک کم ہوئی تو وہ بھی باقی بچوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہاجرہ بیگم نے دایہیں جانے کا ارادہ کیا تو وہ اسے آئی کے پاس لے آئی۔ ہادی بہت خوش لگ رہا تھا نصیب نے اسے چھین دیئے اس نے کھانے شروع کر دیے۔

”میرا بچہ تو بہت خوش لگ رہا ہے اور آرام سے چیس بھی کھا رہا ہے۔ ورنہ یہ تو کھانے پینے سے بھی دور بھاگتا ہے۔“ ہاجرہ بیگم نے اس سے کہا۔

”آئی اصل میں ہادی گھر میں اکیلا ہوتا ہے۔ جب بچہ کوئی دوڑ بھاگ نہیں کرے گا تو اسے بھوک کا احساس نہیں ہوگا تو بچہ کھانے پینے سے دل چرائے گا نا۔“ نصیب نے ہادی کو جیس والا کپ پکڑاتے ہوئے کہا جو اس نے آرام سے تمام لیا تھا۔

”بیٹا! میں بڑھی جان ہوں اتنی بھاگ دو نہیں کر سکتی۔ میں نے طاہر سے سنی بار کہا کہ دوسری شادی کرو ہادی کو ایک ماں کی ضرورت ہے تو وہ کہتا ہے کہ اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ دوسری بیوی اس کو ایک ماں کی طرح چاہے گی۔ اس کے لیے تو بوجھ ہی ہوگا اس لیے میں نہیں چاہتا میرا بیٹا ماں کی محبت کے ساتھ ساتھ باپ کی محبت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔“ ہاجرہ نے بے دلی کے پیچھولے پھوڑے۔

”آئی! آپ ایسا کریں ہادی کو اکثر ادھر لے آیا کریں۔“ اس نے مشورہ دیا جس پر ہاجرہ بیگم نے سوچ بچار کے بعد عمل کرنا شروع کر دیا تھا اور اکثر ہادی کو ادھر لائے لگی تھیں۔

☆.....☆

”نہیں اپنے ابو کے لیے روٹیاں بنا لو۔“ امی نے اسے آواز دی۔

وہ ماہین کو اپنی کمر پر بٹکائے اندر آئی اور اس کو ہما بھی کی تو میں ڈال کر بچن میں چلی گئی لیکن ماہین سکون سے اپنی ماں کی گود میں بیٹھنے کی بجائے اپو پاش (پچھولے پاس) اپو پاش کہتی ہوئی اس کے پیچھے بچن میں چلی آئی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ اس نے اسے اٹھا کر اس کے چہرے کو چوما اور اسے سلیب پر بٹھا کر روٹیاں بناتے لگی۔ ماہین اسے روٹی بناتے اور توڑے پر ڈالتے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

”اپو میں بھی؟“ اس نے چھوٹا سا بیڑا بنا کر ماہین کو دیا تو وہ خوشی سے قہقہے لگانے لگی۔

کام مکمل کر کے اس نے نہنگ پر ہاتھ دھوئے پھر ماہین کو اٹھا کر اس کے ہاتھ دھوائے اور اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ اس نے چٹائی بٹھا کر ماہین کو اس پر بٹھایا اور تصویروں والی کتابیں لے کر اس کے پاس آ بیٹھی۔ اسی دوران ہاجرہ بیگم ہادی کو لے کر چلی آئیں۔ نہنگ نے ان کو سلام کیا اور ہادی کو

اٹھا کر پیار کیا۔ پھر اسے ماہین کے ساتھ ہی بٹھا کر تصویریں دکھانے لگی۔ ماہین نے اس بات کا بہت برا بتایا۔

”اپو یہ میری گپش (بکس) ہیں میں نہیں۔“ ماہین نے اس کے ہاتھ سے کتاب چھیننے ہوئے ہلی میں سر ہلایا اور ہادی کو بڑی کینہ توڑ نظروں سے دیکھا۔

”بیٹا! ہادی آپ کا بھائی ہے نا اپنی بکس اس کو دکھاؤ۔“ اس کے چیکار نے پر ماہین نے اپنی بکس تھوڑی دیر میں ہادی کو پکڑا دیں۔

وہ دونوں کو تصویریں دکھاتے ہوئے بچوں کی زبان میں ان سے باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔ اس کی باتیں سن کر ہادی اور ماہین دونوں غصہ کھلانے لگے۔

”بھئی نہنگ میرا پوتا تو تمہارا دیوانہ ہو گیا ہے۔ آج پہلے آئی پاش چلیں کی ضد کر کے یہاں لایا ہے۔“ ہاجرہ بیگم نے ہادی کی بیٹھنے کی آواز سن کر اس سے کہا۔ ہادی اور آئی پاش کو واپس چلے گئے۔

ہاجرہ بیگم اب اس مسئلے کا مستقل حل چاہتیں تھیں۔ کافی دنوں سے وہ اس مسئلے پر سوچ بچار کر رہی تھیں۔

☆.....☆

”میرے لیے اب ہادی کو سنبھالنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ یہ عام بچوں کی طرح اکیٹھو ہے اور نہ ہی ان کی طرح پڑا تھا اور اس کی جودہ جو مجھے سمجھ میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ کیا کیا ہے۔ اس کو ساتھیوں کی ضرورت ہے۔ میں نے دیکھا ہے نہنگ کے گھر جا کر بہت خوش ہوتا ہے اور ماہین کے ساتھ خوشی خوشی کھیلتا ہے۔ نہنگ بھی اس کا بہت خیال رکھتی ہے۔ وہ تو خیر ہے ہی بہت اچھی بیٹی۔ بچوں سے پیار کرنے والی۔ خیر میں چاہتی ہوں آپ طاہر کو سمجھائیں کہ وہ دوسری شادی کر لے۔“ ہاجرہ بیگم

نے رات کو اسلم صاحب (طاہر کے ابو) سے بات کی۔

”ہاجرہ بیگم! اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آئے والی ہمارے ہادی کا ماں کی طرح خیال رکھے گی۔“ اسلم صاحب نے بھی طاہر کی طرح اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”یہ نہنگ تو ہمیں لینا ہی ہوگا۔ ویسے ہم یہ کوشش تو کر سکتے ہیں کہ طاہر کے لیے ہم جو بھی لڑکی پسند کریں وہ ہادی کو دل سے قبول کرے۔“ ہاجرہ بیگم نے اپنی رائے دی۔

”لیکن ایسی لڑکی لاؤ گی کہاں سے ہاجرہ؟“ انہوں نے اس لا حاصل بحث سے اکتاتے ہوئے کہا۔

”لڑکی تو ہے میری نظر میں اگر آپ اور طاہر راضی ہوں تو میں بات آگے بڑھاؤں۔“ ہاجرہ بیگم کی اس بات پر اسلم صاحب نے انہیں چونک کر دیکھا۔

”کس کی بات کر رہی ہو؟“ انہوں نے ابرو اچکائی۔

”اپنی نہنگ کی۔“ ہاجرہ بیگم نے اطمینان سے جواب دیا۔

”ہاجرہ! مجھے تم سے ایسی خود غرضی کی امید ہرگز نہیں تھی نہنگ غیر شادی شدہ ہے اور اپنے طاہر کی یہ دوسری شادی ہوگی۔ مجھے یقین ہے وہ اپنے والدین پر اتنی بھاری نہیں ہوگی کہ وہ اسے طاہر سے بیاہ دیں۔“ اسلم صاحب نے قدرے رونا گوازی سے کہا۔

”اس میں خود غرضی کی کیا بات ہے طاہر ماشاء اللہ بڑھا لکھا ہے اچھی پوسٹ پر کام کر رہا ہے۔ بس قسمت میں چلی بیوی کا ساتھ نہیں لکھا تھا اور رہی نہنگ کی بات تو یہ میں اس لیے سوچ رہی ہوں کہ اس بیٹی کا دل بہت کھلا ہے اور بچوں سے وہ بہت

پیار کرتی ہے کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ وہ تو لوگوں کے بچوں کو گودوں میں اٹھائے پھرتی ہے۔ مجھے یقین ہے اگر طاہر کی شادی اس سے ہو جاتی ہے تو وہ ہمارے ہادی کے لیے بہترین ماں ثابت ہوگی۔“ ہاجرہ بیگم نے یقین میں۔

”تو تم اس بیٹی کی اچھی فطرت کو ایک پلاٹ کرنا چاہتی ہو؟“ اسلم صاحب کے خیال میں یہ شادی نہنگ کے ساتھ سراسر زیادتی تھی۔

چند روز بعد ہاجرہ بیگم نے طاہر سے نہنگ کے بارے میں بات کی تو اس نے حسب سابق تجھے سے اکڑنے کے بجائے سوچنے کے لیے وقت مانگا۔ ہاجرہ بیگم کو یہ تبدیلی بہت مثبت لگی۔ اس نے سوچنے کے لیے اس لیے وقت مانگا کہ لاکھ وہ انکار کرتا لیکن یہ حقیقت تھی اس کا بچہ دینی اور جسمانی طور پر اپنے ہم عمر بچوں سے پیچھے تھا۔ اس کے بچے کو بھی اگر ماں کی محبت اور کیئر مل جاتی تو وہ بھی ٹارٹل بچوں کی طرح خوش باش ہوسکتا تھا۔ وہ نہنگ کی نیک فطرت سے پوری طرح واقف تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بچوں کے حوالے سے وہ بہت زیادہ کیئرنگ اور حساس ہے۔ وہ جب بھی ان کے گھر جاتا تو وہ ہادی کے بارے میں ضرور پوچھتی تھی۔ اسی لیے اس نے سوچنے کے لیے وقت مانگا تھا کہ اپنی ماں کی طرح اس کے اندر بھی کہیں یقین موجود تھا کہ وہ ہادی کو ماں کا پیار دے سکتی ہے اور اب طاہر کو بھی تنہائی کا احساس ہونے لگا تھا اور ایک سماجی کی خواہش اس کے اندر بھی جاگنے لگی تھی۔ چند روز کی سوچ بچار کے بعد اس نے ہاجرہ بیگم سے کہا کہ وہ نہنگ کے والدین سے بات کر کے دیکھ لیں۔ رات کو اسلم صاحب سے بات کی تو وہ خاموش ہو گئے۔ ان کا خیال بھی یہی تھا کہ اس کے والدین ہرگز نہیں مانیں گے۔

ہاجرہ بیگم نے جب نضب کی ای سے اپنی خواہش بیان کی تو وہ چپ ہو گئیں بلکہ دل میں انہیں بہت نامواری ہوئی لیکن انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال کر بڑے گل سے جواب دیا۔

”بہن میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں نضب کے باپ اور بھائی سے بات کروں گی ان کی رائے آپ تک پہنچا دوں گی۔“ کچھ دنوں بعد نضب کی ای نے اس کے ابو اور بھائی بھابھی کی موجودگی میں ہاجرہ بیگم کی خواہش بیان کی تو اس کے ابو کچھ سوچے لگے۔

”ظاہر اچھا اور دیکھا بھالا لڑکا ہے۔ اچھے عہدے پر کام کر رہا ہے۔ ٹیک فطرت بچہ ہے ہماری نضب کے لیے بہت مناسب رہے گا۔“ انہوں نے اپنی رائے دی اسد بھائی نے بھی ابو کی رائے سے اتفاق کیا۔

”لیکن آپ لوگ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ لوگ کیا کہیں گے کہ میں نے اپنی بیٹی کو ایک بیچے کے باپ سے بیاہ دیا۔“ نضب کی ای نے غصے کا اظہار کیا اسد اور ابو دونوں خاموش تھے۔

”ای ٹھیک کہہ رہی ہیں لوگ تو لوگ اپنے رشتے دار کتنی باتیں کریں گے کہ بیٹی اتنی بھاری ہے کہ ایک بیچے کے باپ سے بیاہ دی۔“ بھابھی نے بھی ای کی طرف داری کی۔

”رشتے داروں کو اپنے لڑکوں کی خاندان میں اور خاندان سے باہر شادیاں کرتے وقت ہماری نضب کا خیال نہیں آیا تھا تو اب ہم اس بارے میں ایک اچھا فیصلہ کرتے وقت ان کی باتوں کے بارے میں سوچ کر کیوں پریشان ہوں۔“ نضب کے ابو نے ای اور بھابھی کو سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ دونوں بھی چپ کر گئیں کہ بہر حال جو بھی تھا ظاہر ہر لحاظ سے بہترین تھا۔

”دیکھیے میں جانتی ہوں نضب کو بچوں سے کوئی

مسئلہ نہیں ہوتا لیکن پھر بھی یہ اس کی پوری زندگی کا معاملہ ہے اور میں جانتی ہوں کہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اس کی رائے ضرور لی جائے۔“ ای نے اپنی پریشانی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

وہ سب کے لیے چائے لے کر آئی تھی۔ اس نے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر ساری بات چیت سن لی تھی۔ وہ خاموشی سے اندر آئی اور چائے کی ٹرے میز پر رکھ کر واپس مڑنے لگی جیسے اس نے کچھ بھی نہ سنا ہو۔

”اے اللہ! اگر تو نے میری قسمت میں یہ غلطی لکھی ہے کہ میں بن ماں کے بیچے کو ایک ماں بن کر پالوں تو پروردگار میری مدد فرما اور میرے لیے یہ راستہ ہموار کر دے۔“ وہ اس نے ہر وہ کام کرنے کی کوشش کی ہے جس تو راضی ہو۔ ”رات کو اس نے عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ دعا مانگنے کے بعد وہ سکون ہوئی تھی۔

کچھ روز بعد ای ابو کے کہنے پر بھابھی نے ساری بات اسے بتا کر اس کی رائے جانچ لی۔

”بھابھی! مجھے ای ابو کا ہر فیصلہ منظور ہوگا۔“ اس کے ای ابو نے اس رشتے کے لیے رشتہ مندی ظاہر کر دی۔ مثبت جواب ملنے پر ہاجرہ بیگم اور اسلم صاحب آکر بات کی کر گئے۔ اس روز ہاجرہ بیگم نے نضب کو گلے لگا کر خوب پیار کیا اور دعا نہیں دیں۔ ظاہر کی ای یہ کام جلد از جلد کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے کسی بھی قسم کے تھکے کے لیے رخ کر دیا اور دو ماہ بعد کی تاریخ طے کر لی۔ ہاجرہ بیگم شادی کی تیاریوں میں کسی بھی قسم کی کسر نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔ ان کے بٹے کی بے شک یہ دوسری شادی تھی مگر نضب کی تو پہلی شادی تھی نا۔

شادی سے دو مہینے پہلے کی بات ہے کہ ظاہر کی کال آئی نضب نے ریسیون کر لی۔

”السلام علیکم نضب!“ اس نے اس پر سلامتی

کہی۔ ”وعلیکم السلام“ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

”نضب میں یہ کفرم کرنا چاہ رہا تھا کہ یہ شادی فیصلہ تمہاری رضامندی سے ہوا ہے؟“ ظاہر نے اپنے فون کرنے کا مقصد بیان کیا۔

اس کا دل چاہا کہہ دے آپ کو بہت جلدی خیال نہیں آ گیا۔

”اگر میں کہوں نہیں تو؟“ اس نے کچھ لمحوں بعد اس کے سوال کا جواب ادھر سے سوال کی صورت میں دیا۔ اس پر ادھر ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔

”تو میں یہ سلسلہ میں ختم کر دوں گا کیونکہ میں جبر کا قائل نہیں ہوں تم میرے یقین رکھو۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دی۔

”آپ بے فکر رہیے ای ابو نے میری رضامندی لی ہے۔“ نضب نے پُرسکون ہوتے ہوئے کہا۔ اس سے بات کرنے کے بعد ظاہر مطمئن ہو گیا۔

☆

پھر دو مہینے بعد ہاجرہ بیگم بڑے چاقو سے نضب کو بیاہ کر لے آئیں۔ اس شادی میں ظاہر کی صرف ایک بہن شریک ہو سکی تھی۔ نضب پر دلہن بن کر بہت روپ آیا تھا۔ رات کو سب رسموں کے بعد اسے ظاہر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ہادی بھی اس کے ساتھ ہی چلا آیا۔ اس نے اپنے ساتھ بیڈ پر ہی اس کو بٹھالیا۔ دو دن بنی نضب کو بہت پُرشوق نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”آنٹی (آنٹی) آپ میرے بابا کی ڈولن (دلہن) ہو؟“ ہادی کا سوال سن کر اس کا دل عجیب سے اعزاز میں دھڑکا۔ اس نے مسکرا کر ہادی کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

”جی بیٹا میں آپ کے بابا کی دلہن اور آپ کی

ماما ہوں۔“

”لیکن آپ تو نضب آنٹی ہو۔“ ہادی نے جیسے اس کو سمجھایا تھا۔

”پہلے میں نضب آنٹی تھی اب آپ کی ماما ہوں ٹھیک۔“ ہادی نے خوشی سے سر ہلایا۔

وہ تھک چکا تھا اب اسے نیند آرہی تھی۔ نضب نے اس کا سر تھپکے پر رکھا اور ہولے ہولے تھپکنے لگی۔ ہادی سوئی جا لی کیفیت میں تھا۔ جب ظاہر کمرے میں آیا۔ وہ دروازہ بند کر کے مڑا تو اس نے اٹھی ہونٹوں پر رکھ کر اس کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس وقت اپنا دلہنپا بھلائے ہادی کو سلاتے میں مگن تھی۔ ہادی سامنے صوفے پر بیٹھ گیا اور غیر ارادی طور پر اس کا جائزہ لینے لگا۔ ہادی کے سو جانے کے بعد وہ سیدھی ہوئی تو اس کی نظر اپنی طرف غور سے دیکھتے ہوئے ظاہر پر پڑی اسے یکدم اپنی موجودہ حیثیت کا احساس ہوا اور وہ بے اختیار سر جھکا گئی۔

وہ خاموشی سے اٹھا اور ہادی کو کندھے سے لگا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ کمرے میں آیا اور دروازہ لاک کر کے اس کے پاس آن بیٹھا۔ وہ اپنے اچھل پھل دل کو سنبھالنے لگی۔

”نضب! اتم یہ جانتی ہو نا میں نے یہ شادی کیوں کی ہے؟ میں جانتا ہوں کہ تمہارے دل میں بھی ہر لڑکی کی طرح شادی کو لے کر کچھ ارمان ہوں گے۔ تم اپنے دل سے سارے دوسرے ختم کر دو میں تمہارے حقوق کی ادائیگی میں بھی کوتاہی نہیں کروں گا اور بدلے میں صرف یہ چاہوں گا کہ تم میرے ہادی کو ایک ماں کا پیار دو۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے اپنے سامنے بیٹھے ظاہر کو دیکھا۔

”یہ سب قبل از وقت بات ہوگی لیکن آپ اطمینان رکھیے میں بھی ہادی کو ماں کی محسوس نہیں ہونے دوں گی۔“ نضب نے اپنا لڑتا ہوا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔ طاہر اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔

”ہوں تم ہادی کو ایک ماں کی طرح پیار کرو گی تو کیا مجھے ایک بیوی کی طرح پیار کرو گی اور بھی بھی بیوی کی محسوس نہیں ہونے دوں گی نا؟“ اس نے دونوں ہاتھ تمام لیے۔

اس نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں ناچنی شرارت کو دیکھ کر مسکرا دی تھی۔

☆.....☆

وہ واش روم سے باہر آئی تو طاہر سو بائل کان سے لگائے کسی سے بات کر رہا تھا اسے باہر آنا دیکھا تو کہنے لگا۔

”لو اسد، نضب سے بات کرلو۔“ اس نے موبائل اس کی طرف بڑھایا۔ نضب نے موبائل کان سے لگا کر اسد کو سلام کیا۔

”وٹیکم السلام! لو بھی نضب مایین سے بات کرو۔ اس نے صبح سے رو رو کر خود اور ہم سب کو بلکان کر دیا ہے۔ کل تمہاری رخصتی کے بعد یہ سوچی تھی اب اٹھی ہے تمہیں ڈھونڈ رہی ہے اور اپو پاش میری اپو پاش جانا ہے“ کہہ کر روئے جا رہی ہے۔“ اسد نے مایین کے کان سے فون لگایا تو وہ اسے پکارنے لگی۔

”مایین میرا بچہ کا (کیا) ہوا؟ کیوں رو رہا ہے میرا بیٹا۔ ہاں جانو ابھی بابا کے ساتھ آ جاؤ میرا گڈا بس اب چپ کرو میرا بیٹا۔“ پھر اس نے اسد بھائی سے کہا کہ وہ ناشتہ لے کر آئیں تو مایین کو بھی اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ اس کے بات کرنے کے دوران طاہر اسے بہت غور سے سن رہا تھا۔ نضب نے فون بند کیا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے

بھری ہوئی تھیں۔ اس نے کب مایین کو یوں دیکھا تھا۔ وہ اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔

دس بجے اسد بھائی بھابھی اور بڑی آپا بھائی لے کر آئے۔ نضب اپنے کمرے میں سوئے بیٹھی ہوئی تھی۔ ہادی اس کی گود میں چڑھا بیٹھا تھا وہ اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کر رہی تھی۔ سب سے ملوانے کے بعد طاہر ان کو اپنے کمرے میں لے آئے۔ مایین دوڑتی ہوئی ”اے میری اپو“ کہتی ہوئی اس کی طرف پہلی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے بھی اپنی گود میں بٹھالیا اور اس کے گالوں پر پیار کرنے لگی۔ مایین فوراً اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ وہ اپنے گود میں ہونے کی وجہ سے وہ اٹھ کر کسی سے ملنے لگی۔ اسد بھائی نے اس سر پر پیار سے ہاتھ چھڑا۔ بھابھی اور بڑی آپا اس کے پیٹھے پیٹنے لگیں۔ طاہر نے ہادی کی طرف دیکھا وہ نضب کی گود میں بہت سی سرور نظر آ رہا تھا۔ اس کے لیے دونوں بچوں کو گود میں بٹھانا مشکل ہو رہا تھا اس نے آگے بڑھ کر ہادی کو نضب کی گود سے لینا چاہا۔

”نضب بابا ہے (پد) میری ماما ہے۔“ ہادی نے اس کے ساتھ لپکتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سے کمرے میں موجود تمام بچوں کے چہروں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ہادی کی بات سن کر مایین نضب سے لپٹ کر بولی۔

”نا میں (نکلیں) ہے (یہ) میری اپو ہیں میری اپو کی گود سے اٹھو۔“ مایین نے ہادی کو اپنے ہاتھ سے پے دھکیلا۔

”چلو جی میں ہادی کی ماما اور مایین کی پیمپ ہوں ٹھیک ہے اب۔“ اس نے دونوں کی لڑائی ختم کراتے ہوئے کہا تو مایین اور ہادی نے ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے سر ہلا دیا۔

طاہر نے بچوں میں مگن نضب کو تشکر بھری نظروں سے دیکھا جس نے اس کے بچے کو ماں کی بہت کا احساس دلانا شروع کر دیا تھا۔

☆.....☆

نضب بہت نیک فطرت لڑکی تھی۔ اس نے ہادی سمیت طاہر کے سب گھر والوں کو بہت محبت سے اپنا لیا تھا۔ مایین شروع شروع میں بہت استغراب رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ سیٹ ہو گئی۔ کسی دیک انڈر وہ اپنے ماما پاپا، دادا دادی کے ساتھ نضب سے ملنے چلی جاتی۔ مایین سے اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس نے ہادی کو خصوصی توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ وہ اس کے کھانے پینے کا خصوصی خیال رکھتی تھی۔ اس کی محبت اور توجہ پا کر ہادی چار ماہ میں کافی کانفیڈنس اور صحت مند ہو گیا تھا۔ طاہر اس کو پا کر اللہ کا بہت شکر گزار تھا۔ وہ ہادی کے کپڑے لینے کمرے میں آئی۔ طاہر بیڈ پر دراز تھا۔ اسے دیکھ کر وہ اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا۔

”یار ماما کہ تم ہادی میں بہت معروف رہتی ہو لیکن کبھی بھی ہادی کے پاپا کی طرف بھی توجہ دے دیا کرو۔“ طاہر نے اسے اپنے ساتھ بیڈ پر بٹھالیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

”بس ابھی آتی ہوں ہادی کو پہنچ کر دادوں۔“ نضب نے اسے گویا تسلی دی تھی۔ اسے میں وہ اسے پکارتا ہوا کمرے میں چلا آیا۔

”بابا یہ میری ماما ہیں آپ پیچھے ہٹو۔“ ہادی نے اس کا ہاتھ نضب کے ہاتھ سے چمڑا کے خود پکڑ لیا۔ اس کی بے بسی دیکھ کر نضب نے توجہ لگایا۔

”اچھا بچو! یہ تمہاری ماما ہے تو میری بیوی بھی ہے میں تو پکڑوں گا اس کا ہاتھ۔“ اس نے ہادی کو ہلاتے ہوئے نضب کا ہاتھ دوبارہ پکڑ لیا۔

”کی نہیں آپ میری ماما کا ہاتھ چھوڑو۔“ وہ

خمسے میں آ گیا۔

”نکلیں چھوڑوں گا۔“ طاہر نے اسے حریف چڑایا۔

”میں دادا کو بتاتا ہوں آپ میری ماما کا ہاتھ پکڑتے ہو۔“ اس نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے دھمکی دی۔

”ارے میرے باپ! یہ لے پکڑ سنبھال اپنی ماما کو۔“ اس نے ایک ہی جھٹ میں اسے گود میں پکڑ کے نضب کی گود میں بٹھا دیا۔ اسے بہت خوشی ہو رہی تھی اس کا بچہ بچوٹن کے مطابق اعتماد سے بات کرنے لگا ہے۔ اس نے نضب کے کندھوں پر بازو پھلکا کے ”شکریہ نضب“ کہا۔

”پلیز آپ مجھے بار بار شرمندہ نہیں کیا کریں۔“ اس نے التجائی لہجے میں کہا۔

نضب کے پاس صرف کھانے پکانے اور ہادی کو سنبھالنے کی ذمہ داری ہی تھی۔ باقی سب کاموں کے لیے ملازمین آتی اور شام کو چلی جاتی تھی۔ ہاجرہ نیگم اس سے اپنی عمرانی میں کام کر داتی تھیں۔ لہذا نضب کا زیادہ تر وقت ہادی کے ساتھ گزرتا تھا۔

بہکی ہوئی جدی کہ وہ اس سے بہت زیادہ مانج ہو گیا تھا۔ وہ ہر وقت اس کا ہاڈی گاڑ بٹا رہتا تھا۔ وہ دونوں ہادی کے سامنے بہت احتیاط سے رہتا تھے لیکن کبھی کوئی بے احتیاطی ہو جاتی تو ہادی صاحب فوراً ٹوک دیتے تھے۔ جیسے اس روز ہوا تھا کہ رات کھانے کے بعد طاہر اور نضب اپنے کمرے میں تھے۔ طاہر

نضب کی گود میں سر رکھے لیٹا ہوا تھا۔ وہ ہولے ہولے اس کا سر دبا رہی تھی۔ ہادی اپنے دادا دادی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اسے خند آنے لگی تو وہ اپنے کمرے میں چلا گیا کیونکہ وہ نضب کے ساتھ سونے کا عادی ہو چکا تھا۔

”ماما! خند آتی ہے سونا ہے۔“ ہادی نے بیڈ پر چڑھ کر اپنے مخصوص اعزاز میں کہا۔ طاہر ابھی تک

10 PROBLEMS SOLUTION

MEDICAM

MEDICAM

میدی کیمریشن کریم جیسے۔۔۔ دانتوں کی لالچ نامہ انشورنس۔



دیسے ہی لیتا ہوا تھا۔
 ”پاپا! آپ انھیں میری ماما ہیں۔ آپ اپنی ماما
 کا ہم دس شوٹیں (سوٹیں)۔“ اس نے اس کے سر
 کو تھپکتے ہوئے کہا۔
 ”کیجئے جناب! آپ سو جائیں اپنی ماما کی گود
 میں۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تو ہادی فوراً ماما کی گود میں
 گھس کر بیٹھ گیا۔
 اسلم صاحب اور ہاجرہ نضب سے بہت خوش
 تھے۔ اس نے نام صرف ہادی بلکہ پورے گھر کو بہت
 اچھی طرح سے سنجال لیا تھا۔ وہ ہادی کے بہت لاڈ
 اٹھاتی لیکن اس کی تربیت کے معاملے میں کوئی
 سمجھوتہ نہیں کرتی تھی۔ اس کی غلطیوں پر اسے چار
 سے سبھائی تھی لیکن ضرورت محسوس ہوتے ہی وہ
 اسے لٹکا سا ڈانٹ بھی دیتی تھی۔ نضب سے خود سے
 کوئی غلطی ہو جاتی تو وہ ہادی سے سوری کہتی تھی اور
 اس نے ہادی کو بھی غلطی پر سوری کرنا سکھایا تھا۔
 طاہر کے اسی ابو ہر وقت گھر پر ہوتے تھے۔ نضب
 اور ہادی سارا وقت ان کے سامنے ہوتے تھے۔
 ابھی تک انہیں اس کی کوئی ایسی بات یا کام نظر نہیں
 آیا تھا جو قابلِ گرفت ہوتا۔ بلکہ وہ مطمئن تھے کہ
 ہادی اب کیئرنگ ہاتھوں میں ہے۔
 ☆۔۔۔☆

طاہر اپنے آفس میں بیٹھا کوئی ضروری فائل
 دیکھ رہا تھا۔ جب اس کے پی اے نے اسے اطلاع
 دی کہ عمر کریم نام کا کوئی شخص اس سے ملنا چاہتا
 ہے۔ طاہر نے اسے فوراً اندر بھیجے کو کہا۔ عمر کریم
 طاہر کا بچہ دوستی قبیلہ تھا۔ وہ کینیڈا میں ہوتا تھا۔ آج
 کل پاکستان آیا ہوا تھا۔ لہذا آج طاہر سے ملنے چلا
 آیا تھا۔ عمر کریم اندر آیا تو طاہر پر جوش انداز میں
 اس سے ملا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد طاہر نے
 چائے منگوائی۔ آدھے گھنٹے بعد طاہر کا بیچ ٹائم ہوا تو
 وہ عمر کریم کو لے کر ”پزا ہاٹ“ چلا آیا۔ آرڈر دیکھنے

کے بعد دونوں ہاتھ کرنے لگے۔
 ”یار طاہر! ہے تو تمہارا ذاتی معاملہ لیکن تم
 دوسری شادی کر کے ہادی کے ساتھ بہت زیادتی
 کی ہے۔“ عمر کریم نے کچھ جھجک کر کہا۔
 ”وہ کیسے؟“ طاہر نے حیرانی سے پوچھا۔
 ”کیسے کا کیا سوال یار میری ایک بات ذہن
 میں رکھنا کہ وہ عورت تمہاری بیوی تو ہو سکتی ہے لیکن
 ہادی کی وہ صرف سوتیلی ماں ہوگی۔ یہ لفظ سوچ
 اپنے اندر کتنا زہر رکھتا ہے تم شاید سوچ بھی نہ کر
 لیکن میں نے اس زہر کو قطرہ قطرہ پیا ہے اور دیکھو
 کیسی عجیب بات ہے کہ اس زہر سے انسان جسمانی
 طور پر بچ بھی جائے تو اس کی روح مر جاتی ہے۔
 عمر کریم کے لہجے میں بہت دکھ تھا۔
 ”عمر! نضب بہت اچھی ہے اس میں سوتیلی
 ماں والی کوئی جگہ نہیں ہے وہ سکی ماں سے بڑھ کر
 ہادی کا خیال رکھتی ہے۔“ طاہر نے نضب کا بغیر
 پور وقار کیا۔
 ”طاہر! تم تو جانتے ہو میرے ابو نے میری اسی
 کے انتقال کے بعد دوسری شادی کی تھی لیکن تم یہ نہیں
 جانتے کہ اس سوتیلی ماں کے ہاتھوں میں کیا جش
 ہوا تھا۔ طاہر میں شاید یہ سب تم سے سیکھ کر نہ کر
 لیکن اب ضرورت تم سے سیکھ کروں گا کہ تم ہادی کے
 حوالے سے کسی غفلت کا شکار نہ ہو جاؤ۔“ عمر کریم
 ایک لمبے کے لیے رکا تو طاہر نے نا اطمینانی کے عالم
 میں اس کی طرف دیکھا۔
 ”شروع میں سب کچھ ٹھیک تھا میری سوتیلی ماں
 مجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔ جب اس نے میرے
 ابو کی غفروں میں اپنا مقام بنالیا تو اور ان کا اعتبار
 حاصل کر لیا تو پھر میرے ساتھ اس کا سلوک بدلنے
 لگا۔ وہ ابوی غیر موجودگی میں مجھے ڈانٹنے اور مارنے
 بھی لگیں۔ وہ مجھے سختی سے منع کرتی کہ اگر میں نے
 یہ سب کچھ ابو کو بتایا تو وہ مجھے گھر سے نکال دیں گی

اور میں بے گھر ہونے کے خوف سے ابو کو کچھ نہ بتاتا۔ ابو کے سامنے وہ اب بھی مجھ سے بہت پیار جتاتی تھی۔ ابو میرے لیے کوئی چیز لے کر آتے تو بعد میں وہ چیز چھین کر مجھے دھکی دیتی کہ اگر آئندہ ابو سے کوئی زیادتی کی تو وہ مجھے بہت مارے گی۔ میں خوف کے مارے ان کی ساری ہدایت پر عمل کرتا چلا گیا۔ اس چیز نے مجھے ابو کی نظروں میں بدترین اور نا فرمان بنا دیا۔ ابو مجھ سے پیار کرتے تو میں ان سے دور ہونے کی کوشش کرتا۔ وہ میرے لیے کوئی چیز لاتے تو میں اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے نہ بڑھاتا۔ پہلے تو ابو میری حرکتیں برداشت کرتے رہے پھر وہ بھی رفتہ رفتہ مجھ سے ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگے۔ میں اندر ہی اندر حریف خوف کا اور تنہائی کا شکار ہوتا گیا۔ میں ماں کے ساتھ باپ کے پیار سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ ”عمر کریم نے اپنی آنکھوں میں آنی کی کوٹھو پیچے سے صاف کیا۔ اس کے لیے اپنے ماضی کو یاد کرنا آسان نہیں رہا تھا۔

”پھر جب وہ خود ماں بننے لگی تو اس کی کوشش یہ تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح مجھے اپنے راستے سے ہٹا دے تاکہ میرے ابو کی جائیداد کے مالک اس کے سگے بیٹے ہوں۔ جائیداد کے لیے شاید وہ مجھے جان سے بھی مارنے سے گریز نہ کرتی کہ قدرت کو میری حالت پر رحم آ گیا۔ انہی دنوں میری دادی اماں خانوال سے لاہور آئیں۔ انہیں اپنے کچھ میڈیکل ٹیسٹوں کے سلسلے میں کچھ دن ہمارے ہاں ٹھہرنا تھا۔ انہی دو دنوں میں انہیں میری سوتیلی ماں کے سلوک کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ میری عمرانی کرنے لگیں تو ان پر جو انکشاف ہوا اس نے انہیں ہلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے فوراً مجھے اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

”میں اس چاہتی ہوں عمر کو اپنے ساتھ خانوال

لے جاؤں۔ وہاں میں اور تمہارے ابو اکٹیلے ہوتے ہیں یہ ہمارے لیے روتی بن جائے گا۔“ دادی اماں نے ابو سے بہت سمجھداری سے بات کی۔ میری سوتیلی ماں کی گویا مراد برآئی۔ میرے ابو کچھ چپکچاپٹ کا شکار تھے لیکن دادی اماں نے اپنی بات منوا کر ہی دم لیا۔ پھر میں اپنی دادی کے ساتھ خانوال چلا گیا۔

بہت عرصہ جذباتی طور پر ڈسٹرب رہا۔ مجھے سال کی عمر میں میں نے کیا کچھ نہیں سہ لیا تھا۔ دادی دادی نے مل کر میرا رشتوں پر سے ہٹا ہوا اعتبار آہستہ آہستہ بحال کیا۔ آج میں جو کچھ ہوں ان کی وجہ سے ہوں۔ میں تعلیم کی غرض سے لاہور آیا تو یہاں اپنا گھر ہوتے ہوئے بھی میں ہاسٹل میں رہتا تھا۔ کیونکہ سوتیلی ماں اپنے بچوں پر میرا سایہ بھی نہیں پڑنے دینا چاہتی تھی اور ابو تو مجھے دادا دادی کے حوالے کر کے یہ بھی بھول گئے تھے کہ ان کا کوئی بیٹا بھی ہے۔ آج میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے اچھی تعلیم اچھی ملازمت پر غلوں اور خیال رکھنے والی شریک حیات، نیکی جیسی رحمت اور بیٹے جیسی نعمت سب کچھ ہے میرے پاس لیکن اپنی زندگی کے اس تاریک وقت کو بھلانے کی کوشش بھی کروں تو ناکام ہو جاتا ہوں اور میں اللہ سے ہمیشہ یہ دعا کرتا ہوں اللہ پاک کسی بچے کو بھی اس کی ماں سے محروم نہ کرے۔ کیونکہ ماں مر جائے تو باپ کی شفقت بھی کہیں کھو جاتی ہے۔ کم از کم میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے۔ ”عمر کریم اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوا تو اس کی آنکھوں میں پھر نمی چمک رہی تھی۔

عمر کریم کی رواداد سن کر طاہر عجیب سی بے چینی کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کے سامان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہر پل مسکرانے والا عمر اتنا زخمی ہوگا۔ طاہر نے بے ساختہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی

دی۔ اتنے میں ویرنے آؤ روبرو کر دیا تو وہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی کھانے کو انجوائے نہیں کیا تھا دونوں ہی کسی گہری سوچ میں گم تھے۔

☆ ☆

نہ چاہتے ہوئے بھی عمر کریم کی باتیں ہر وقت وہم بن کر اس کے ساتھ رہنے لگی تھیں۔ وہ بہت باریک بینی سے نضب کا جائزہ لینے لگا تھا۔ اب اسے اس کی بہت سی باتیں قابل گرفت لگنے لگی تھیں۔ پہلے وہ جن باتوں کو نظر انداز کیا کرتا تھا اب وہ بھی اسے بری طرح ٹھکنے لگی تھیں۔ نضب کی روشنی میں کہ جیسے ہی طاہر دفتر سے گھر آتا تو وہ ہادی کو اپنے پاس ہی رکھتی تھی۔ جب تک وہ فریض ہو کر چائے نہ پی لے۔ آج بھی اس کے آنے کے بعد وہ ہادی کو کمرے سے باہر لے جانے لگی تو طاہر نے ٹوک دیا۔

”میرے آتے ہی ہادی کو ادھر ادھر کیوں لے جاتی ہو اسے میرے پاس ہی رہنے دیا کرو۔“ طاہر کا لہجہ بہت خشک تھا۔ نضب اس کے لہجے پر بری طرح چبکی لگی۔

”آپ آفس سے تھکے ہوئے آئے ہیں یہاں آپ کو تنگ کرے گا۔“ نضب نے اپنے لہجے کو جچی الامکان ٹارٹل رکھا تھا۔

”میرا بیٹا ہے مجھے تنگ نہیں کرے گا تو کسے کرے گا۔“ انہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اسے میرے پاس چھوڑ جاؤ۔“ اس نے بے رخی سے کہا۔

نضب نے نا بھگی کے عالم میں طاہر کو دیکھا اور ہادی کو بیڈ پر بٹھا کر چلی گئی۔ وہ ہادی کو لے کر اسے پیار کرنے لگا۔

وہ کافی دنوں سے طاہر کا بدلہ سا انداز نوٹ کر رہی تھی لیکن کچھ نہیں پار رہی تھی کہ وہ ایسا کیوں

کر رہا ہے۔ رات ہادی دودھ نہ پینے کی شد کر رہا تھا تو وہ بچہ اسے بہلا پھسلا کر دودھ پلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ٹھیک ہے مت پیو صبح میں آپ کو کارٹون بھی نہیں دیکھنے دوں گی۔“ جب وہ کسی طور نہ مانا تو نضب نے اسے پیار بھری دھمکی دی۔

”شوری (سوری) اماں۔“ ہادی نے جھٹ اس کے گلے میں بانٹیں ڈال دیں۔

”چلو پھر دودھ پیو شاہاش۔“ نضب نے اس کے بازو گلے سے لٹا لٹے ہوئے کہا تو وہ دودھ پینے لگا۔

”تم ہادی کو میرے سامنے اتنا دھمکیا ہو تو بعد میں کیا کرتی ہوگی۔“ طاہر نے یہ ساری کارروائی دیکھ کر کئی سے کہا۔

”اس بات سے آپ کا کیا مطلب ہے؟“ وہ اس کی بات کو کچھ کر بھی نہ سمجھتا چاہ رہی تھی۔

”مطلب یہ کہ تمہیں کوئی حق نہیں میرے بیٹے کو ڈرا دھمکا کر کوئی کام کرواؤ۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”طاہر میں نے کب ڈرا یا ہے ہادی کو میں تو بس دودھ پلانے کے لیے یہ سب کر رہی تھی۔“ وہ روہا ہوتی تھی۔

”بس مجھے زیادہ لچھر مت دو اور آئندہ میرے بیٹے کو ڈرا یا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ اس نے دھمکی دی۔

”طاہر! کیا میرا بیٹا میرا بیٹا لگا رہی ہے ہادی میرا بھی تو بیٹا ہے۔“ نضب نے جیسے اس سے زیادہ خود کو یقین دلایا تھا۔ وہ اس پر عجیب سی نظر ڈال کر باہر چلا گیا۔ اگلے ہی روز وہ اس کے کلب و لہجے پر کڑھتی رہی۔ اسے بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کے کس عمل نے اس کو اس سے بدگمان کر دیا ہے۔ وہ اس کے بل بل پلٹتے رویے کے بارے میں جتنا سوچ رہی تھی اتنا ہی الجھتی جا رہی تھی۔

نصیب کو باغبانی کا بہت شوق تھا شادی سے پہلے وہ اپنے گھر کے چھوٹے سے لان پر بہت محنت کرتی تھی اور اس کی یہ محنت لان کو دیکھ کر نظر آتی تھی۔ یہاں آ کر بھی اس نے اجڑے ہوئے لان اور گھلوں کو بھر پور توجہ دی تھی اور اب اس کی محنت سے لان اور گھلے سرسبز و شاداب تھے۔ اس نے اپنے بالوں کو پچھر میں پکڑ رکھا تھا اور دو پندہ لمبوں کے پودے پر لٹکایا ہوا تھا۔ وہ ہادی کو ساتھ لگائے گھلوں کی صفائی کر رہی تھی۔ وہ اس کام کو بڑے شوق سے کرتا تھا اور نصیب کو دیکھ کر وہ بھی اپنی طرف سے پودوں کا پورا خیال رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

”ہادی یہ کیا کر رہے ہو چھوڑو یہ گندی مٹی اور فوراً اٹھو یہاں سے۔“ طاہر نے ایک دم اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔

”نانی (نہیں) بابا میں ماما کے ساتھ کام کروں گا۔“ اس نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا۔
”چلو نصیب تم بھی اٹھو اور یہ فضول کام چھوڑو اور اسے بھی یہاں سے ہٹاؤ تمہیں ذرا خیال نہیں اس طرح مٹی سے کھیل کر یہ بیمار بھی ہو سکتا ہے۔“ طاہر نے اسے لڑا۔

”طاہر! ہم ماں بیٹا اکثر یہ کام کرتے ہیں۔ آج آپ کو اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے؟“ اس نے طاہر کے لیے کئی کئی کرکٹ بگلا چھلکا اعدا کر پٹایا۔

”تم ایک بات ذہن میں بنالو تم نہ اس کی ماں ہوتے یہ تمہارا بیٹا ہے سمجھیں؟“ وہ یکدم دباڑا اور پلٹ کر اندر چلا گیا۔

نصیب دم بخود کی کھڑی رہ گئی اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ اس نے باقی کام وہیں چھوڑا لمبوں کے پودے سے اپنا دوپٹہ کھینچا اور ہادی کو ساتھ لے کر اس کے پیچھے چلی گئی۔ رات کو دیر تک

اسے نیند نہیں آئی وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ وہ اس کے بدلے ہوئے روئے کا عطرک جمان سکے۔ لیکن فی الحال کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ جو وہ ایکدم انہیں اور سرور حجاز ہو گیا ہے۔ یاد کرنے پر بھی اسے اپنی کوتاہی کوئی غلطی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ اس گھر کو بھٹانا چاہتی تھی جو اس کے دل میں پڑ چکی تھی لیکن کیسے یہ سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔

پہلے اب میری سانس ہی حفاظت رکھ لے شاید اس طرح میں بن جاؤں تیرے اعتبار کے قابل ہو۔

کچھ دنوں سے نصیب کو اپنی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ آج سارے کاموں سے فارغ ہو کر وہ باہرہ عینک کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد اسے یہ خوشخبری سنائی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ وہ تو پہلے ہی متا کے جذبے سے سرشار تھی یہ خبر سن کر اسے ایسا لگا گویا اس کے اندر متا کے خشنے پھوٹ پڑے ہوں۔ وہ بہت خوش تھی۔ مگر آ کر اس نے ہادی کو خوب سمجھنے سمجھنے کر پیار کیا پھر دو ٹکڑے شکرانے کے پڑے کر اپنے پروردگار کا شکر ادا کیا۔ طاہر کے اسی لیے بھی اس خبر سے بہت خوش تھے۔ شام کو وہ دفتر سے آ کر فریش ہونے کے بعد امی ابو کے ساتھ چائے پینے لگے تو اس نے دیکھا کہ وہ دونوں ہی آج بہت خوش نظر آ رہے ہیں لیکن انہوں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔

رات کھانے سے قارغ ہو کر نصیب نے کچن سمیٹا۔ امی ابو کو ان کے کمرے میں دودھ دے کر اس نے طاہر ہادی اور اپنے لیے دودھ کے گلاس ڈالے میں رکھے اور کمرے میں چلی آئی۔ طاہر ہادی کو اسٹوری بک سے کہانی سنارہا تھا۔ اس نے طاہر کو دودھ کا گلاس پکڑ لیا اور ہادی کا گلاس اپنے

ہاتھ میں پکڑ کر اپنا گلاس ڈالے سمیت میز پر رکھ دیا۔
”ہادی اپنے اپنا دودھ لیو۔“ نصیب نے ہادی کو بہت پیار سے مخاطب کیا تھا۔

”چلو بیٹا دودھ پی کر سو جاؤ اسٹوری ختم باقی کل پڑھیں گے۔“ طاہر نے کتاب سائڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس نے ہادی کو گود میں لے کر دودھ پلایا اور اسے بیڈ پر اس کی جگہ پر لٹا دیا۔ پھر خود دودھ پی کر ہادی کے پاس لیٹ کر اسے سلاتے لگی۔ طاہر کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

ہادی سو گیا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
”میرے پاس آپ کے لیے ایک خوشخبری ہے۔“ اس نے طاہر کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

اس نے اسے استہمامیہ اعاز سے دیکھا۔ نصیب کے چہرے پر خوشی اور شرم کے ملے جلے تاثرات تھے جیسے اتنا خوبصورت بنا رہے تھے کہ وہ بے خود سا اسے دیکھ گیا۔ عمر کریم کی باتوں کے بعد نصیب کے ساتھ اس کے تعلقات میں سرد مہری سی آ گئی تھی۔ آج بہت دنوں کے بعد اس نے اسے غور سے دیکھا تھا۔

”میں آج ڈاکٹر کے پاس گئی تھی اللہ نے۔۔۔۔۔ ہمیں بچہ کر دیا ہے۔“ اس نے شرمیلے سے اعاز میں جھپٹتے ہوئے بات مکمل کی اور سر جھٹک لیا۔ وہ اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ چند لمحوں تک جب دوسری طرف سے رسپانس نہیں آیا تو اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کیا ہوا طاہر؟ آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟“ اس نے قدرے پریشان ہو کر پوچھا۔

ہاں! کچھ نہیں مجھے نیند آ رہی ہے تم بھی سو جاؤ۔“ وہ سپاٹ سے اعزاز میں کہہ کر لیٹ گیا۔ طاہر کے اس رویے سے نصیب کے دل کو دکھا سا لگا تھا وہ چپ چاپ اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دوسری طرف کروٹ

لیے طاہر یہ سوچ رہا تھا اب اسے پہلے سے بھی زیادہ ہادی کا خیال رکھنا ہوگا۔

☆.....☆

کبھی حیات کی ضامن کبھی وسیلہ موت نگاہ یار اتیرا بھی کوئی اعتبار نہیں ابھی نصیب طاہر کے اس عجیب و غریب رویے کے بارے میں اپنی ساسی سر سے بات کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ یہ حادثہ پیش آ گیا۔ اس کی ٹانگوں سے گویا جان نکل گئی تھی۔ وہ بے دم ہو کر وہیں بیڑیوں پر بیٹھ کر رونے لگی۔ یہ آنسو ہادی کی تکلیف پر بھی بہہ رہے تھے اور اپنے اوپر لگنے والے الزام پر بھی۔ اس نے ہادی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سونپی گئی ذمہ داری سمجھ کر اپنا پٹا تھا اور اس کی ماں بننے کی پوری کوشش کی تھی۔ وہ شاید یہ نہیں جانتی تھی کہ ماں کے ساتھ لگنے والے لفظ ”سو تیلی“ اس کی ساری چاشنی ختم کر دیتا ہے۔ اس کے دل و دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا جانے وہ وہاں کتنی دیر بیٹھی رہی۔ طاہر ہادی کو اسپتال سے لے کر گھر آیا تو وہ وہیں بیٹھی تھی۔ ہادی سو چکا تھا وہ اس کے پاس سے گزر کر کمرے میں چلا گیا۔ اس نے ہادی کو بیڈ پر لٹایا اور خود بھی اس کے ساتھ لیٹ گیا۔

وہ بدلت تمام وہاں سے اٹھی اور لاؤنج میں آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ ایسے بیٹھی تھی جیسے اس کی ساری ذمہ داری کی پوٹھی لٹ گئی ہو۔ اس کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں تھی اب اس کا لی بی بہت لو تھا۔ اتنے میں ہادی کے رونے کی آواز آئی۔ وہ جاگ گیا تھا اور طاہر اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر اس کے رونے کی آواز سنی رہی پھر جب اس سے برداشت نہ ہوا تو وہ اٹھی اور کمرے میں گئی۔ اس نے بیڈ پر بیٹھ کر ہادی کو گلے سے لگایا اور خود بھی رونے لگی۔

ہادی اس کے رونے پر ہنس کر خاموش ہو گیا۔
”میرے بچے کو کیسے چوٹ لگ گئی؟ میں صدے جاؤں میرا بچہ کیسے گر گیا؟“ ماما گندی ہیں ہادی کا خیال نہیں رکھیں۔“ اس نے ہادی کو چوم کر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”نائیں ماما آپ ابھی ہو میری بال گر گئی تھی میں اسے پکڑنے لگا تو گر گیا۔“ ہادی نے بھاری آواز میں کہا۔

ظاہر اب اپنی جلد ہادی پر پشیمان ہو رہا تھا کیونکہ ڈاکٹر کے پوچھنے پر بھی ہادی نے یہی بیان دیا تھا۔

”ہادی کو اس وقت کوئی میڈیسن دینی ہے؟“

وہ بیڈ کے سر پانے پر دو اینٹی کے شاہر کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ اس نے خاموشی سے دوائی کی ایک بوتل نکال کر نضب کو پکڑا دی۔ اس کی اتنی جلی

کی اور الزام تراشیوں کے باوجود وہ اس کے بیٹے کے رونے کی آواز سن کر کمرے میں آئی تھی بلکہ اب نہ چاہے ہوئے بھی اس سے صرف اس لیے

مخاطب تھی کہ ہادی کی دوائیوں کے بارے میں جان سکے۔ نضب کی اس اعلیٰ ظرفی پر ظاہر کے ضمیر

نے اسے ملامت کرنا شروع کر دیا تھا۔

نضب ہادی کو کمرے سے باہر لے گئی۔ اس نے اسے دودھ پلا کر دوائی پلائی اور اسے لے کر لاؤنج

میں آگئی۔ ہادی اب بہتر محسوس کر رہا تھا وہ اپنے کھلونوں سے کھیلنے لگا۔ وہ غائب دہائی سے اسے

دیکھ رہی تھی۔ شام رات میں بدل رہی تھی لیکن اس کو نہ خود کچھ کھانے کا ہوش تھا اور نہ ہی اس نے

ظاہر اور اسلم صاحب سے کھانے کے بارے میں پوچھا تھا۔ سالن تو وہ دوپہر میں بنا چکی تھی۔ ظاہر کو

بھوک لگی تو وہ اٹھ کر باہر آیا اس کی نظر نضب پر پڑی۔ چند لمحوں میں اس کا چہرہ بالکل زرد ہو گیا

تھا اور اب بھی وہ ہادی کو دیکھ رہی تھی جبکہ اس کی

آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔ وہ باہر سے روٹیاں لایا۔ سالن گرم کر کے ابو کا کھانا لے کر ان کے کمرے میں گیا تو انہوں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کھانے سے انکار کر دیا۔ وہ خاموشی سے باہر آ گیا۔

اس نے اپنا اور نضب کا کھانا ٹرے میں رکھا اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔ شاید اس طرح وہ اپنے الفاظ

کی معافی کو کم کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کا ضمیر اسے بے چین کر رہا تھا۔ وہ عمر کریم کی باتوں کے زیر اثر اس

پر شک کر رہا تھا لیکن اب اندر سے بہت پریشان تھا جیسے کہیں کچھ بہت غلط ہو گیا ہو۔

”نضب کھانا کھا لو۔“ اس نے اس کا کندھا ہلا کر کہا تو وہ ایک دم چونکی۔

”ہاں!“ پھر اس نے غائب دہائی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کھانا کھا لو“ اس نے اپنی بات

دہرائی تو وہ لٹی میں سر ہلا کر پھوٹ کر رو دی۔ اس کے رونے کی آواز سن کر ہادی فوراً اس

کے پاس آیا اور اس کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔

”ماما! آپ کون (کیوں) رو رہی ہو۔ بابا گندے ہیں ڈانٹتے ہیں۔“ ہادی نے روہانے ہو کر

باپ کی طرف دیکھا تو وہ حریف شرمندہ ہو گیا لیکن تیر تو کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر اس

کا سلوک ہادی کے ساتھ اچھا نہ ہوتا تو وہ اس کے رونے پر یوں بے چین نہ ہوتا۔ نضب نے ہادی کو

گود میں بھر لیا تھا اور وہ مارے شرمندگی کے نظر نہیں اٹھا سکا۔

چار گھنٹے بعد نضب نے ہادی کو سالن کھلا کر دوبارہ دوائی پلائی اور سونے کے لیے لٹا دیا۔ وہ اس

کی افسردگی کو شدت سے نوٹ کر رہا تھا اور اپنی طرف سے تلاشی کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ اب بھی

وہ اس کا منہ چومنے لگا تھا۔ ہادی کے ہر لاڈ پر اس

کی آنکھوں کی نمی حریف پھیل رہی تھی۔ وہ یہ سب دیکھ رہا تھا لیکن وہ خود میں کچھ بھی کہنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ نضب بھی ہادی کے ساتھ لٹ گئی۔ اگلی صبح فجر کی اذان کے ساتھ ہی اس کی آنکھ لٹ گئی۔ اس کا سر درد سے چٹا جا رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھی اور دوشو کے جائے نماز پر کھڑی ہو گئی۔ نماز پڑھنے کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اس کی

آنکھیں بھر آئیں۔ کافی دیر وہ ہاتھ اٹھائے خالی ذہن لیے صرف روٹی رہی۔

”یا اللہ! تو میری نیت جانتا ہے۔ پروردگار! میں کسی کاربائیں چاہتی۔ ہادی کا تو بالکل بھی نہیں یہ

بچہ مجھے بہت پیارا ہو گیا ہے۔ میرے مولا! مجھے اتنی بہت عطا کر کہ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی ہادی کے

لیجے میرے پیار میں کوئی کی کوئی کھوٹ نہ آئے۔ یا اللہ! مجھ گناہ گار پر رحم فرما میرے مولا۔“ دعا مانگتے

کے بعد اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرے اور اپنے دوپٹے کو کھول کر اپنے آنسو صاف کیے۔ بستر میں

لیٹے ہوئے بظاہر سوئے ہوئے ظاہر نے اس کی یہ دعا حرف بہ حرف سنی تھی اور سوچا تھا کہ اپنے اللہ

سے بھی کوئی جھوٹ بول سکتا ہے؟ کیا نضب اس کے بیٹے کے ساتھ کچھ برا کر سکتی ہے؟ اس کے اندر

سے آنے والا جواب نفی میں تھا۔ وہ ہولے سے بیڈ کے قریب آئی اور آہستہ الٹری پڑھ کر ہادی پر پھونگی

اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆

ناشتے کی میز پر ظاہر اور ابو دونوں ہی موجود تھے۔ نضب نے معمول کے مطابق دونوں کو ناشتہ بنا

کر دیا۔ اس کی دونوں آنکھیں سوجنی ہوئی تھیں اور وہ بہت بھیجی ہوئی لگ رہی تھی۔ روز والی تازگی اور

مسکراہٹ اس کے چہرے سے مفقود تھی۔ ظاہر آفس چلا گیا اور اسلم صاحب اپنے کمرے میں۔

آج پہلی بار اس نے دونوں سے بات نہیں کی۔

اسے اس بات کا بھی دکھ تھا کہ ابو خاموش تماشائی کیوں بنے کھڑے رہے۔ انہیں اس کے حق میں بولنا چاہیے تھا۔ آخر وہ سارا دن گھر میں ہوتے تھے اور جانتے تھے کہ ہادی کے ساتھ وہ کس طرح پیش

آتی ہے۔ وہ ابھی ہادی کو ناشتہ کر رہی تھی جب داخلی دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس کے اٹھنے سے پہلے

ہی اسلم صاحب دروازہ کھول چکے تھے۔ ان کے ساتھ باجرہ بیگم تھیں وہ حیران ہوئی کیونکہ وہ صبح اپنی

بہن کے گھر گئی تھیں انہیں وہاں دودن رکنا تھا۔ باجرہ بیگم نضب کی سامنے والی کرسی پر آ بیٹھیں اور

اس کے متے ہوئے چہرے کو بغور دیکھنے لگیں۔ وہ نظریں چرا کر ہادی کو ناشتہ کرانے لگی۔ اسلم صاحب

بھی وہیں آ گئے۔

”نضب بیٹا! میں جانتا ہوں تم مجھ سے ناراض ہو۔ بیٹا! مجھ سے بدگمان نہ ہونا۔ میں نے کبھی غلط

کچھ نہیں دیا لیکن میرا طریقہ کار ذرا مختلف ہے۔ اس کا ثبوت آج ہی تمہیں مل جائے گا۔“ انہوں نے

اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پلٹ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اس ہمدردی پر نضب کے پھر آنسو آ گئے۔ ہادی اس کی طرف بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

”ڈاڈو! (دادو) بابا نے ماما کو بوت (بہت) ڈاڈا (ڈاڈا)۔“ اس نے دادی سے شکایت کی۔

باجرہ بیگم نے سر ہلایا۔

”میں سب جانتی ہوں آج آ لینے دو ظاہر کو اس کی خوب خبر لیتی ہوں۔“ پھر وہ اس کی طرف متوجہ

ہوئیں۔

”تم اپنے آپ کو تھامت سمجھتا۔ میں اور ظاہر کے ابو تمہارے ساتھ ہیں تم ان سے بدگمان ہوئی ہو

ان کی شروع سے عادت ہے کہ بچوں کی کسی بھی غلطی پر انہیں سزا دینا اس وقت تک نہیں کرتے جب تک مجھ سے بات نہ کر لیں۔ پھر میری موجودگی میں

انہیں مردہ دفن کرتے ہیں تاکہ انہیں یہ احساس ہو کہ انہوں نے واقعی کوئی گنہگار کی ہے اور ماں باپ دونوں ہی ان کی گنہگاری سے نالاں ہیں۔ ہم دونوں کی اس حکمت عملی سے یہ فائدہ ہوا کہ ایک دفعہ کے بعد بیچے دوبارہ بھی وہ غلطی نہیں کرتے۔ عموماً باپ بچوں کو کچھ کہتا ہے تو ماں بچوں کا ساتھ دیتی ہے اور ماں کچھ کہتی ہے تو باپ ان کا ساتھ دیتے ہیں جس سے بچوں کو شل جانی ہے اس لیے ہم لوگوں نے بھی ایسے نہیں کیا خیر تم اطمینان رکھو۔ انہوں نے تسلی دی۔

اس کی حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی تھیں۔ ایک ہی رات میں وہ مرسوں کا پھول بن گئی تھی۔ ”تم پریشان نہ ہو جاؤ شاہد شل لے کر آؤ“ میں تمہارے سر میں مائل کر دیتی ہوں تمہیں اس سے کافی سکون ملے گا اس کے بعد تم نماز کر فرمائیں ہو جاؤ۔ انہوں نے اس کی توجہ ثنائی چاہی۔

”ای! طاہر کی اس بات نے مجھے اندر سے کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ خدا گواہ ہے اگر بھی میں نے ہادی کو کوئی تکلیف پہنچانے کو سوچا بھی ہو۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنی صفائی دینی چاہی۔ ”نہیں تمہیں صفائی دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں سارا دن گھر پر ہی ہوتی ہوں۔ رہی بات طاہر کی وہ آئندہ بھی ایسی بات نہیں کرے گا جس سے تمہیں تکلیف ہو۔“ ہاجرہ بیگم نے یقین دہانی کروائی تھی۔

☆.....☆

آفس سے آکر بھی اس کا دل بہت بے چین تھا۔ نہ تب کا رویا ہوا چارہ رہ کر اس کے سامنے آ رہا تھا۔ اب اسے اپنی جلد بازی اور شدید رد عمل پر غصہ آ رہا تھا۔ لاکھ اس نے کام میں اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کی مگر بے سود اس پر جھجھلاہٹ طاری ہونے لگی۔ صبح سے دوبار اپنے

آفس پرانے کو بلا وجہ ڈانٹ چکا تھا۔ اس کا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ اسے جب کسی طور چین نہ آیا تو آفس سے جلدی اٹھ گیا۔ وہ جب گھر پہنچا تو اسی ابو ڈانگ ٹھیل پر بیٹھے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ نہ تب ہادی کو لیے کارپٹ پر بیٹھی تھی۔ اس نے کارپٹ پر اخیار بچھا رکھا تھا جس کے اوپر کھانے کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ہادی کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھانا سکھائی تھی اور وہ خوش خوش اس کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔ اس نے سب کو مشترکہ سلام کیا اور ڈانگ ٹھیل کی ایک کرسی تھپت کر وہیں بیٹھ گیا۔ اس کی آواز سن کر ہادی فوراً اٹھا اور باپ کی گود میں چڑھ گیا۔ اس نے اپنا کھانا ختم کیا اخبار اور برتن اٹھا کر کچن میں رکھے۔

”آپ کھانا کھائیں گے؟“ اس نے طاہر کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا۔ ”نہیں بس ایک کپ چائے دے دو۔“ طاہر نے اس کی طرح دیکھ کر کہا۔

اس وقت صبح کے مقابلے میں کافی ہنر نگ رہی تھی لیکن اس کا چہرہ ابھی تک سنا ہوا تھا اس نے چائے کا کپ لا کر خاموشی سے اس کے سامنے رکھ دیا اور ٹھیل سے برتن اٹھانے لگی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ آرام سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ حالانکہ آج سے پہلے جب تک طاہر فریض ہونے کے بعد چائے نہ پی لیتا وہ ہادی کو ادھر ادھر پھیلانے رکھتی تھی لیکن آج وہ اطمینان سے بیٹھ گئی تھی۔ ہادی ابھی تک طاہر کی گود میں تھا۔ اسے ہادی کو گود میں بٹھا کر چائے پینے میں مشکل ہو رہی تھی۔

”جاؤ ہادی ماما پاس۔“ اس نے ہادی کو اپنی گود سے اتارا۔

وہ نہ تب کے پاس آ گیا۔ وہ اسے انگلی سے لگا کر باہر نکل گئی۔ وہ اسی ابو کے کمرے میں چلا

آیا۔ ابو نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”نہ خوردارا تم نے جو کل حرکت کی ہے اس سے ہمارے سر شرم سے جھک گئے ہیں۔ کل زعمی میں پہلی بار میرا دل چاہا کہ میں تمہارے منہ پر پتھر دے ماروں لیکن یہ میرے اصولوں کے خلاف تھا۔ اس لیے میں نے فون کر کے تمہاری ماں کو بھی بلالیا تھا تاکہ تم سے اس حرکت کی وجہ جان سکیں۔ تمہیں اعزاز ہے کہ تمہاری اس حرکت کی وجہ سے نہ تب کتنا ہرٹ ہو گئی ہے۔ بلکہ وہ تو مجھ سے بھی بدگمان ہو گئی ہے۔“ اسلم صاحب نے سخت لہجے میں اسے لڑاؤ تھا۔ طاہر خاموش رہا اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”تمہاری یہ واڈیلا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ تم تو آفس چلے جاتے ہو۔ ہم دونوں دیکھتے ہیں کیسے وہ کسی ماں سے بڑھ کر ہادی کے لاڈ اٹھاتی ہے اور نہ صرف لاڈ اٹھاتی ہے بلکہ اس کی تربیت پر بھی پورا دھیان دیتی ہے۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا تمہارے بچہ کتنا صحت مند اور کتنا اطمینان و گواہ ہے اور یہ سب اس کی محنت ہے۔ یہ سب چیزیں تو تمہیں نظر نہیں آئیں اسے ڈراما سیوٹ لگ گئی تو اس کا مسو جلا پن تمہیں نظر آ گیا اور تم نے بغیر سوچے سمجھے اس پر الزام لگا دیا۔ ارے سلی ماؤں سے بھی تو بچوں کو جوت لگ جاتی ہے۔ تو اس کا کیا مطلب ہے ان کو اپنے جوت سے محبت نہیں ہوتی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہادی نے مجھ سے تمہاری شکایت کی ہے کہ تم نے نہ تب کو ڈانٹا ہے۔ وہ بچہ ہو کر نہ تب کے غلوں اور محبت کو سمجھ گیا اسے اپنی تکلیف کے باوجود تمہارا نہ تب کو ڈانٹنا یاد رہا ہے۔ طاہر اس تو تمہاری ناشکری پر حیران ہوں اس نے جس طرح بد اعتراف کر کے ہادی کو اپنایا ہے اور لوگوں کے منہ بند کروائے ہیں تمہیں تو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے لیکن تم تو اس بات پر جھک کر رہے ہو۔ ارے تمہیں تو

اللہ کے حضور سجدہ ریز ہونا چاہیے اس نے تمہیں اپنی سمجھ اور محبت کرنے والی اور یاد دہانی عطا کی ہے۔ لیکن تم کیوں شکر ادا کرو گے ہاں اگر تمہیں واقعی ایسی بیوی ملتی جو ہادی سے سوتیلوں والا سلوک کرتی تو تم اللہ سے شکوہ کرنا بھی نہ بھولتے۔“ ہاجرہ بیگم نے کافی طویل پتھر دیا تھا۔

طاہر کا ضمیر پہلے ہی اسے چٹن لینے نہیں دے رہا تھا اور اب اسی ابو کی باتیں اسے کوڑوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے ان کے کمرے سے نکل گیا۔

☆.....☆

کئی دن گزر گئے لیکن وہ اب بھی جیسے طاہر کے لگائے گئے الزامات کی وجہ سے شاک میں تھی۔ اسے یہ بات چٹن ہی نہیں لینے دے رہی تھی کہ اس کی نسبت پر شک کیا گیا ہے۔ یہ بات اسے پہلی پہلی مارتی تھی کہ اس کی اتنی احتیاط کے باوجود اس پر سوتیل کا ٹھیل لگ گیا۔ یہ ساری باتیں اس کی صحت پر بری طرح اثر اعزاز ہو رہی تھیں لیکن وہ جیسے ہر بات سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اس روز اسد بھائی اور بھابی کو لیے چلے آئے۔ نہ تب سے ہادی خوش تھا۔

”مامی آؤ میں آپ کو کھلونے دکھاؤں۔“ اس نے سب کو نظر انداز کر کے مامی کا ہاتھ پکڑا۔ وہ مامی کو مامی کہتا تھا۔

”ارے شہزادے ہم بھی یہاں موجود ہیں۔“ اسد بھائی نے آواز دی تو ”ابھی آیا ماموں۔“ مامی کا ہاتھ تھامے ڈرانگ روم سے باہر نکل گیا۔ سب اس کے اس اعزاز پر ہنس پڑے تھے۔

نہ تب ان کی تواضع کے لیے کچن میں آئی تو بھابی اور ہاجرہ بیگم بھی اٹھ کر لاؤنج میں آ گئی تھیں۔ وہ سب کو چائے سرو کر کے اپنا کپ اٹھائے لاؤنج میں ہی آ گئی۔

مہینہ سی کے ہمارے صورت
نت نئے اور پرکشش ڈیزائن!



پاکستان میں پہلی بار کورین ٹیکنالوجی کا شاہکار



الشيخ محمد بن عبد الله بن محمد

Ultra Hydrating Cream

Source: *Journal of the American Medical Association*, 1997, 277:1033-1037.

卷之四

Figure 2

لا اله الا الله

... ..

— *Journal of the American Medical Association*

35833929-35833930 34977970-34977972

36636824-36636825 4730-48 36707479-36707480 4730

Website: www.roseparlour.com

روز بیونی پاریس

میں کوئی کی نہیں آئی تھی۔ وہ اس کی طرف سے ذرا غافل نہیں ہوئی تھی۔

اس کے باوجود ہادی کے حوالے سے اس میں ایک ایسی تبدیلی آچکی تھی جسے کسی نے محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن طاہر نے پوری شدت سے محسوس کیا تھا۔ وہ جب تک گھر میں موجود رہتا تھا نہ ب کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ ہادی باپ کے قریب ہے۔ وہ ہادی کو اس کے پاس چھوڑ کر کسی کام کے بہانے منتر سے ہٹ جاتی تھی۔ اگر وہ بھی ضد کرتا تو وہ خود بھی اس کے ساتھ وہیں بیٹھ جاتی اور اسے کسی کام یا کھیل میں مصروف کر کے ادھر ہی چھوڑ جاتی۔ اب بھی وہ اسے طاہر کے پاس چھوڑنے آئی تھی لیکن وہ یہاں بیٹھنا نہیں چاہ رہا تھا۔

”ماما! اٹھا لو مجھے میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔“ ہادی نے شہد کی۔
”بیٹا ایسے نہیں کرتے تاہم بات ہوتی ہے آپ بابا کے پاس بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔“ اس نے اسے پکارا۔

اس دوران اس نے طاہر کو یوں نظر انداز کیا جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔ اس نے نینب کو ایک نظر دیکھا۔ وہ کچھ کپڑوں میں بلبوس تھی۔ چہرے کے ارد گرد بالوں کی بے ترتیب لٹیں بکھری ہوئی تھیں اور اس کا گلہابی رنگ قدرے زردی مائل ہو رہا تھا۔ اس کی مردانہ انا اسے نینب سے براہ راست معافی مانگنے سے روک رہی تھی۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ وہ سب کچھ بھلا کر پھر پہلے جیسی ہو جائے۔ اس کی خاموشی اس کے احساس جرم کو اور بڑھا رہی تھی۔

”نصیب یہ سب کیوں کر رہی ہو؟ ہادی تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہے تو لے جاؤ اسے۔“ اس نے اس کے روئے کے محرک سے قصداً چشم پوشی کی۔ اس

”نصیب کیا بات ہے بہت کمزور لگ رہی ہوں اپنا خیال رکھا کرو اس حالت میں بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔“ بھابھی نے پیار سے سرزنش کی تو وہ ہنسنے لگی۔

”آئی آپ اسے ڈانٹا کریں یہ بہت لاپرواہی کر رہی ہے۔“ بھابھی نے باجرہ بیگم سے کہا۔ اب وہ اسے کیا بتائی کہ وہ کیوں کمزور ہوئی ہے۔ وہ اس کی منہوں میں کہ اس نے اپنے کمر والوں کو طاہر کے رویے سے بے خبر رکھا تھا۔

”نصیب بیٹا! جو کچھ ہوا اسے بھولنے کی کوشش کرو میرا بیٹا۔ تم تو بہت طرف والی ہو۔ میں یہ نہیں کہتی کہ تم طاہر کو معاف کر دو لیکن یہ ضرور کہوں گی اپنی محنت پر دھیان دو تم پر اب ایک اور جان کی ذمہ داری بھی ہے۔“ اسد بھائی اور شاہ بھابھی کے جانے کے بعد باجرہ بیگم نے نصیب کو سچا بھایا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا کر ان کی تسلی کروائی تھی۔

☆ ☆

آتی سردیوں کے اداس دین تھے۔ ایک تو بے
ہی جہیز پر اداس چھائی ہوئی تھی۔ دوسرے ہادی کو
پوٹ لگ جانے والے واقعے سے حزیہ بورت
پھیلی ہوئی تھی۔ نمنب نے طاہر سے بات کرنا تو
نہیں چھوڑی تھی۔ وہ کسی اشد ضرورت کے تحت
اسے مخاطب کرتی تھی اور اس کی پوچھی گئی باتوں کا
جواب بھی دیتی تھی لیکن وہ بات کرتے ہوئے نہ تو
اس کی طرف دیکھتی تھی اور نہ ہی اس کے چہرے پر
کوئی تاثر ہوتا تھا۔ عجیب سا سیات اہماز ہو گیا
حالاں کا۔ حالانکہ پہلے وہ بہت خوش المکین اور
فریش دکھائی دیتی تھی۔ اب اس کی آنکھوں میں
اداسیوں نے ڈیرے ڈال لیے تھے اس نے اپنے
لباس بنناؤ سنگھار کرنے کی طرف دھیان دینا بھی
تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ البتہ ہادی سے اس کے بار

کی اس بات سے نضب کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے۔

”آپ کو نہیں پتہ میں یہ سب کیوں کر رہی ہوں؟“ اس نے طنز کیا۔

”تم ماں ہو اس کی۔“ طاہر نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے صبح جو انداز اپنایا۔ اس کے تو گویا نکوؤں سے لگی سر پر بھی تھی۔

”ماں کے ساتھ سو تلی بھی لگائے سو تلی ماں ہوں میں ہادی کی۔ یہ سب آپ کا بیٹا ہے۔ میں پاگل بھی جو خود کو اس کی ماں سمجھتی رہی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ آپ جیسے لوگ ماں جیسے رشتے کو بھی سکے اور سو تلی رشتوں پر جانتے ہو۔ مجھے تو بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ میں اس کی سو تلی ماں ہوں لیکن آپ تو شاید روز اول سے یہ خدشہ دل میں بسائے بیٹھے تھے۔ اسی لیے آپ نے میرے اندر سو تلی ماں کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ آپ اس حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کرنا چاہتے تھے کہ کوئی عورت کسی بن ماں کے بیٹے کو ماں بن کر پال سکتی ہے۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب ہادی کو اپنے سے زیادہ قریب نہیں آنے دوں گی۔ پر میں کیا کر لوں؟ جب وہ مجھے ماما کہہ کر پکارتا ہے تو میں پھر سے اس کی ماں بن جاتی ہوں۔“ نضب کے چہرے پر بے بسی کے تاثرات بہت واضح تھے۔

”لیکن اب میں یہ کوشش ضرور کرتی ہوں کہ جب آپ موجود ہوں تو یہ زیادہ سے زیادہ وقت آپ کے سامنے رہے تاکہ اگر اب دوبارہ ایسی کوئی بات ہو تو اس کا الزام اس کی ”سو تلی ماں“ پر نہ لگے۔“ اس نے سو تلی پر زور دے کر کہا۔

آج کئی روز کا غبار لگا تھا۔ طاہر کے پاس خاموشی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کی اوپنی آواز اور خفیہ انداز نے ہادی کو ہادیا تھا۔ اس نے ہلکا بھلکا اس کا یہ انداز دیکھا تھا وہ تو اس کی محبت اور

لاڈ کا عادی تھا۔ وہ اس کی طرف بازو اٹھائے سکتے لگا۔ اس کی آواز سن کر اس نے لمحوں میں خود پر قابو پایا اور ساتھ لیے کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆ ☆ ☆
وہ اپنی کسی ڈاکومنٹ کی تلاش میں کتابوں والی الماری کھولے کھڑا تھا۔ جب اچانک اس کی نظر اپنی اور قاخرہ کی شادی کی تصویروں والے البم پر پڑی۔ اس نے بے ساختہ وہ البم اٹھالیا اور کرسی پر بیٹھ کر وہ البم دیکھنے لگا۔ ہر تصویر اس پر ماضی کی کئی یادوں کے درپے کھول رہی تھی۔ اسے قاخرہ بے طرح یاد آتی وہ ارد گرد سے بے شمار سا بیٹھا تصویریں دیکھتا رہا۔

”بابا! کا (کیا) کر رہے ہو آپ؟“ ہادی کی آواز پر وہ غنڈی سانس بھر کر حال میں واپس لوٹا تھا۔ اس نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اسے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھالیا۔

”بابا ہے (یہ) قاخرہ ماما کی شوہر (تصویر) ہے؟“ ہادی نے حائل ہوئے البم سے جھانکتی ہوئی ایک تصویر پر انگلی رکھ کر کہا۔

طاہر ہادی کے منہ سے قاخرہ کا نام سن کر ہلکا ہو گیا۔ اس کے جواب نہ دینے پر اس نے اپنی بات دہرائی تو طاہر نے ”ہوں“ کہہ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”بیٹا! آپ کو کسے پتہ یہ قاخرہ ماما ہیں؟“ اس نے ہادی کا رخ اپنی طرف کیا۔

”ماما نے بتایا تھا بے (یہ) ماما اللہ میاں پاش چلی گئی ہیں تب بے (یہ) ماما میرے پاس آ گئی۔“ ہادی نے کمرے میں داخل ہوئی نضب کی طرف اشارہ کیا۔

نضب نے ہادی کے حائل کے صرف آخری لفظ سنے تھے لیکن طاہر کے سامنے کھلے البم کو دیکھ کر کچھ گئی کہ دونوں ماں بیٹے میں کیا بات ہو رہی ہے وہ اکثر

ہادی کو اس البم سے سب کی خاص طور پر قاخرہ کی تصویر ضرور دکھائی تھی۔

”چلو ہادی! ہاتھ لینا ہے۔“ اس نے ہادی کا ہاتھ پکڑا۔ وہ خود بھی نہا کر آئی تھی اس کے کیلے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور اس نے بالوں کے نیچے کندھوں پر تولیہ پھیلا یا ہوا تھا۔

”اس بات پر کسی ملاحظہ نہیں ہوئے گا۔ ہادی کو یہ سب بتانا بہت ضروری ہے کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ جب یہ بڑا ہو تو اس کے قانون میں سو تلی بیٹے یا سو تلی ماں کا ہر اثر پایا جائے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اسے شروع سے ساری حقیقت معلوم ہوتا کہ وہ لوگوں کو بتائے کہ قاخرہ بھی اس کی ماں تھی اور میں بھی اس کی ماں ہوں۔“ اس نے وضاحت دی۔

طاہر سوچنے لگا کہ وہ جو ہادی کے حوالے سے اتنی حساس ہے کیا وہ بھی اس پر کوئی ظلم کر سکتی ہے؟ اس کے دل نے ہمیشہ کی طرح ”نہیں“ میں جواب دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہادی کو چوٹ لگے دو ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا تھا۔ وہ اب بالکل ٹھیک تھا کہ نضب ابھی بھی وہیں پر کھڑی تھی۔ طاہر اپنی طرف سے صفائی کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے الفاظ نے نضب کے دل پر جو زخم لگایا تھا وہ ابھی بھی رستا تھا۔ شدید غنڈہ تھی۔ وہ بری طرح نزلے زکام کی لپیٹ میں آ چکی تھی۔ وہ صبح سے چھینک چھینک کر بے سال ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے باجرہ تیکہ اسے جوشا عود ملا کر گئی تھی۔ کچھ دیر آرام رہنے کے بعد دوبارہ سے چھینکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ کبل میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہادی طاہر کے پاس تھا۔ دوپہر کے وقت وہ ہادی کو لے کر کمرے میں آیا تو وہ چھینک رہی تھی۔

”اٹھو نضب! ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ وہ صبح سے اس کے حالات دیکھ رہا تھا اس سے رہا نہ گیا۔“ نہیں میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے سول سول کرتے ہوئے انکار کیا۔

ہادی بیڈ پر چڑھ کر اس کے پاس بیٹھ چکا تھا۔ طاہر بھی بیڈ کے کنارے پر بیٹھ چکا تھا۔ دیکھو ماما کہ تم مجھ سے ناراض ہو لیکن اپنی صحت سے دشمنی نہ کرو۔“ اس نے جیسے منت کی گئی وہ خاموش رہی۔

”نضب! میں اپنی سوچ پر شرمندہ ہوں میں نے تمہارا دل دکھایا ہے لیکن میں کیا کرتا میں ان دونوں عمر کریم کی باتوں کے زیر اثر تھا۔ عمر کریم میرا دوست ہے۔ وہ سو تلی ماں کے ظلم کا شکار ہوا تھا۔ نہ جانے اس کی باتیں کیوں میرے اندر وہم بن کر بیٹھ گئی تھیں۔ اس نے کہا تھا 98 فی صد سو تلی مائیں ظالم ہوتی ہیں تو میں نے ان 98 فی صد میں کھڑا کر کے تمہارے ظلم تلاش کرنے شروع کر دیے۔ لیکن تم نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تم ان عورتوں میں سے ہو جو صرف ”ماں“ ہوتی ہیں۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔“ اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر اسے دیکھا۔

”طاہر! آپ بہت برے ہیں آپ نہیں جانتے کہ آپ نے مجھے کتنا ہرٹ کیا ہے۔“ اس کے آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”پلیز نضب! رونا نہیں۔ میں پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہوں۔ میں مانتا ہوں میں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا ہے۔ لیکن میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ پلیز اس دفعہ مجھے معاف کر دو تاکہ میرا بچہ تادہ ختم ہو سکے جو مجھے کسی کروٹ بچن نہیں لینے دیتا۔ بلکہ یہ دیکھو میں ہاتھ جوڑ کر تم سے معافی مانگتا ہوں۔“ طاہر نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے۔

”ایسے مت کریں پلیز۔“ نعت نے اس کے ہاتھ کھول دیے۔
ہادی دونوں کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔
”بابا (یہ) آپ کیا کر رہے ہو؟“ ہادی نے سوال کیا۔

”بیٹا! اما ناراض ہیں ان کو منارہا ہوں۔“ طاہر نے ہادی کے گال کو چھو کر کہا۔

”تو بابا! آپ اما کو جہاں (یہاں) پاری (پیار) کر کے شادی (سودی) کرلو۔“ ہادی نے حرسے سے نعت کے گال پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ یہ اس کا آزمایا ہوا طریقہ تھا۔

”واہ میرے ہیرو واہ! کیا مشورہ دیا ہے پیارے۔“ اس نے جانور قبضہ لگایا نعت بری طرح جھینپ گئی۔

”کیوں کیا خیال ہے پھر ہادی پر عمل کر لیا جائے۔ ویسے بہت دن ہو گئے آپ تو ہمیں لٹ ہی نہیں کروا رہے ہیں۔“ وہ اس کی جانب جھکا۔
”کیا کرتے ہیں ہادی بیٹھا ہوا ہے کچھ تو خیال کریں۔“ وہ گھبرا کر چیخے ہوئی۔

طاہر اس کے اعزاز پر مسکرایا تو وہ بھی مسکرائی اور آج بہت دنوں بعد اس کی آنکھوں نے اس کی مسکراہٹ کا پورا پورا ساتھ دیا۔

☆.....☆

پھر وقت نے دکھایا کہ نعت نے ”سوتیلے پن“ کے مل صراط کو کامیابی سے پار کر لیا تو انعام اس کا مقدور ٹھہرا۔ نعت نے اپنے مل سے یہ ثابت کیا کہ صرف پیدا کرنے والی ماں نہیں ہوتی بلکہ ممتا ایک کردار کا نام ہے جس میں گئے سوتیلے کی کوئی تقسیم نہیں ہوتی اور جو عورت اس کردار کے سانچے میں ڈھل جائے وہ ختم نہ ہونے والے تو ماں کے رجبے پر قائم ہو جاتی ہے۔ اس کے ہاں ایک بیٹا علی اور ایک بیٹی رباب پیدا ہوئے۔ لیکن ہادی کی حیثیت

اس کے نزدیک ہمیشہ پہلوئی کی اولاد کی رہی۔ آج چوبیس بجیں سال گزرنے کے بعد بھی ہادی کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ علی اور رباب کا بڑا بھائی تھا۔ بیٹیوں بہن بھائیوں میں بہت محبت تھی۔ ہادی اپنے بہن بھائی کی نسبت زینت سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی وہ یہ حقیقت جانتا تھا کہ نعت نے اسے ختم نہیں دیا۔ لیکن اس کی بے لوث اور ممتا بھری محبت نے اسے بھی کسی محرومی کا شکار نہیں ہونے دیا تھا۔ اس لیے اس کے دل میں نعت کے لیے محبت کے ساتھ ساتھ بہت عقیدت بھی تھی۔ گزرتے وقت میں بھی کسی نے بھی نعت کے خلاف اس کے کان بھرنے کی کوشش کی وہ اس کی حمایت میں اس طرح ڈٹ کر کھڑا ہو جاتا کہ کہنے والا اپنا منہ لے کر رہ جاتا۔

نعت کو اچھی طرح یاد ہے کہ ہادی کی عمر کوئی پندرہ سولہ سال تھی۔ طاہر کی پھوپھی زاد بہن اس کے یہاں آئی ہوئی تھی۔ روینہ کی اپنی چرب زبان کی وجہ سے اکثر ناپسند کی جاتی تھیں۔ نعت ان کے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست کرتے تھے۔ طاہر اور ہادی ان کے پاس بیٹھے ہوتے تھے۔

”ہادی! نعت تمہارا خیال تو رکھتی ہے نا؟“ طاہر کے پیچھے ڈانٹتی یا مارتی تو نہیں؟“ انہوں نے آنکھیں گھما گھما کر ہادی سے پوچھا۔

”آہ! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟“ وہ پھر ہادی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”ارے تم چپ رہو مجھے بچے سے پوچھنے دو۔“ وہ پھر ہادی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”پچھو! آپ اپنے بچوں سے کتنا پیار کرتی ہیں؟“ ہادی نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

”بھئی میرے بچے ہیں پیار تو کروں گی میں ان سے۔“ روینہ نے کچھ الجھ کر جواب دیا۔
”اور کوئی غلطی کرنے پر آپ انہیں ڈانٹتی یا مارتی

ہیں یا نہیں؟“ ہادی نے پھر سوال کیا۔
”ارے ہاں کیوں نہیں بچوں کی تربیت کرنے کے لیے بعض اوقات سختی بھی کرنی پڑتی ہے؟“ انہوں نے فخر سے بتایا۔ طاہر دونوں کی طرف متوجہ تھا۔

”اچھا تو وہ جب اچھا کام کرتے ہوں گے تو آپ ان کی تعریف بھی کرتی ہوں گی۔“

”طاہر ہے میں ماں ہوں ان کی۔“ روینہ کو اس کے سوالوں کی منطق سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

”پچھو! مجھے ایک بات سمجھائیں میری نعت ماں تو یہی سارے کام کرتی ہیں۔ پھر لوگ مجھ سے خاص طور پر یہی سوال کیوں کرتے ہیں کہ ان کا میرے ساتھ سلوک کیسا ہے۔“ ہادی نے روینہ کی بولی بند کرادی۔

”وہ تمہاری سوتیلی ماں ہے۔“ انہوں نے طنز کیا۔

”لیکن کام تو سارے وہ ہی ماؤں جیسے کرتی ہیں جیسے کہ آپ تو کیا مطلب ہے؟“ ہادی نے مصحوبیت کی انتہا کر دی۔

”دیکھا کیسے بڑوں کے سامنے زبان چلا رہا ہے اور تم اسے دیکھ کر مسکرا رہے ہو۔ کہیں تو تربیت میں کمی رہ گئی ہے نا۔“ انہوں نے طاہر کو مسکراتے دیکھا تو اپنی توپوں کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

اس نے نعت سے کہا کہ لے کر آگئی۔ ہادی اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کی طرف ایک مسکراہٹ اچھال کر باہر نکل گیا۔ روینہ نے بڑے خراب موڈ میں چائے پی اور فوراً جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ نعت کو حیرانی ہوئی کیونکہ روینہ کبھی بھی اتنی جلدی وہاں نہیں جاتی تھیں۔

”آج روینہ آ پا کر کیا ہوا اتنی جلدی کیوں چلی گئیں۔“ اس نے طاہر کے پاس بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

”آج تمہارے سپوت نے تمہاری حمایت میں ڈٹ کر ان کے احساس برتری کو چوٹ لگائی ہے محترمہ۔“ اس نے ہلکے چٹکے اعزاز میں کہا۔
”کیا مطلب؟“ اس نے ناگہی سے پوچھا تو طاہر نے ساری بات اس کے گوش گزار کر دی۔

ساری بات سن کر اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور ساتھ ہی اس کے دل میں ہادی کے لیے اور پیار بڑھ گیا۔ جواب اس کی ڈھال بننے کے قابل ہو گیا تھا اور آج کا دن روینہ نے پھر بھی ہادی سے براہ راست اس طرح کا کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

ان گزرے سالوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ نعت کے میکے میں اس کی امی حیات تھیں لیکن ابوفوت ہو گئے تھے۔ ماہین کے بعد اسد بھائی اور ثناء بھابھی کے دو بیٹے اور تھے۔ دونوں گھروں کے بچوں کا ایک دوسرے کی طرف آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ہادی ایم پی اے بیکنگ اور فنانس کرنے کے بعد ایک بینک میں اسٹنٹ مینجیر کے عہدے پر فائز تھا اور ماہین ایم اے لٹریچر کرنے کے بعد ایک پرائیویٹ کالج میں پڑھاتے بھی اور ساتھ ہی ای ایل ٹی میں ایم فل کر رہی تھی۔ نعت کے ساس سرفوت ہو گئے تھے۔ اس کی دونوں نندیں پانچ چھ سال بعد پاکستان کا چکر لگاتی تھیں۔ وہ دونوں اس کی بہت عزت کرتی تھیں کہ اس نے نہ صرف اس کے بھائی کے گھر کو بسایا تھا بلکہ اس نے حقیقی معنوں میں ہادی کی ماں ہونا ثابت کیا ہے۔ ہادی نعت کی ممتا کے اعتراف میں ہر سال مدد رڈ سے اس کے لیے کارڈ اور پھول لے کر آتا اور اپنی پوری محبتوں اور خلوص سے نعت کے ہاتھ چوم کر یہ چیزیں اس کی نذر کرتا۔ رباب اور علی یہ دن بھول بھی جاتے مگر ہادی اس دن کو بھی نہیں بھولتا تھا۔

آج بھی مدد رڈ پر وہ دونوں چیزیں لے کر آیا تھا اور اس نے بڑی محبت اور عقیدت سے اپنی ماں

کے ہاتھ تمام کر یہ شعر پڑھے مجھے۔
 اس ظلم کی دنیا میں قتل پیار ہے میری ماں
 ہے میرے لیے سایہ دار دیوار میری ماں
 نفرت کے جزیروں سے محبت کی سرحدوں تک
 بس پیار ہے بس پیار میری ماں
 محبت، محبت چاہت کا رشتہ ہے میری ماں
 بشر کے روپ میں جیسے فرشتہ ہے میری ماں
 نصب نے کارڈ نکال کر پڑھا جو اس دعا سے
 سچا تھا:
 ”یا اللہ! میری ماں کا سایا تاحیات میرے وجود
 کو اس طرح روشن کرتا رہے جس طرح ”تو“ اپنی
 رمتوں کے سائے تلے دنیا کو روشن کرتا ہے۔
 آمین۔“ نصب نے اٹھ کر ہادی کو گلے لگا کر اس کی
 پیشانی چومی۔ نا جانے کیوں دونوں ماں بیٹوں کی
 آنکھیں بجھنے لگی تھیں۔ علی اور رباب ہر دڑے کا
 گیت گاتے ہوئے ان دونوں سے لپٹ گئے۔
 ☆.....☆

نصب لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی
 تھی۔ ہادی آیا اور اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ
 گیا۔ اس کے پیچھے مایین علی اور رباب بھی چلے
 آئے۔
 ”پچھو ہادی سے کہیں مجھے گھر چھوڑ آئے۔“
 مایین دوسری طرف سے آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔
 ”میں نہیں جاؤں گا تم آج ادھر ہی رہ جاؤ۔“
 ہادی نے اطمینان سے جواب دیا۔
 ”ہادی پلیز چھوڑ آؤ بھائی نہیں ہو۔“ اس نے
 منت کی۔
 ”نہیں ہوں بھائی تمہارا تو بالکل نہیں میری بہن
 تو یہ ہے رباب۔“ ہادی نے نصب کی گود سے سر اٹھا
 کر رباب کی طرف بازو پھیلا دیا تو وہ جھٹ اس کے
 بازو سے آن لگی۔
 ”پچھو ایہ دیکھ رہی ہیں اس ہادی کے بیچے

کو۔“ مایین نے شکایت کی۔
 ”ہادی کیوں تنگ کر رہے ہو اسے جاؤ مایین کو
 چھوڑ کر آؤ۔“ نصب نے ہادی کے سر پر چپت
 لگائی۔
 ”میں بالکل نہیں جاؤں گا آپ علی سے کہیں یہ
 چھوڑ آئے۔“ ہادی اپنی ہٹ دھرمی پر قائم تھا۔
 ”جاؤ علی بیٹا! مایین آتی کو چھوڑ آؤ۔“ اس نے
 علی سے کہا تو وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ مایین بھی اٹھ کھڑی
 ہوئی دونوں آگے پیچھے دروازے کی طرف بڑھے۔
 ”ماہی (مایین) کے چرنے کے باوجود ہادی
 اسے مایہ کہہ کر پکارتا تھا! اب کب آؤ گی۔“ ہادی
 نے پیچھے سے بانگ لگائی۔
 ”مجھی بھی نہیں خود غرض انسان۔“ مایین نے
 جل کر کہا۔ اس کے اس انداز پر ہادی اور نصب کے
 ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھرنی۔
 ”ماہی! یہ تو بے جاؤ۔“ ہادی نے ایک پیکٹ لہرا
 کر کہا۔
 وہ فوراً وہیں چلی تو اس کے ہاتھ میں اسٹینٹ
 والا پیکٹ تھا۔ اسی وجہ سے اس نے آج سارا دن
 یہیں گزارا تھا۔ اور ہادی کی مدد سے اسے کھل گیا
 تھا۔ کیونکہ اسے کیپیوٹر چلانے میں بہت زیادہ
 مہارت نہیں تھی۔ مایین نے لفافہ اس کے ہاتھ سے
 چھینا اور بغیر شکر سیرا دیکھے واپس مڑ گئی۔
 ”ماہی! میرا شکریہ تو ادا کر دو اتنی محنت سے تمہارا
 کام کھل کر کے دیا ہے۔“ ہادی نے پھر اس کو بانگ
 لگائی مگر مایین اس کو ٹھیکہ دکھا کر باہر نکل گئی۔
 لاؤنج میں صرف ہادی اور نصب رہ گئے تو ہادی
 نے اس کے کندھوں پر بازو پھیلا دیا۔
 ”اما! آپ مایین کو ہمیشہ کے لیے یہاں روک
 لیں نا۔“ ہادی نے لاؤ سے کہا۔
 وہ مایین سے اس کی پسندیدگی سے واقف تھیں۔
 ”پاکل ہو گئے ہو کیسے روک لوں؟“ اس نے

تجامل حارقات سے کام لیا۔
 ”میرا مطلب ہے اما! آپ کو اپنا ستائیں
 اٹھائیں سال کا بیٹا نظر نہیں آتا۔“ ہادی نے اپنی
 طرف اشارہ کیا۔
 ”پاکل نظر آتا ہے۔ اللہ میرے بیٹے کو نظر بد
 سے بچائے لیکن تمہارا مایین سے کیا تعلق؟“ نصب
 نے اسے زنج لگایا۔
 ”اچھا صاف صاف بتاؤ کیا چاہتے ہو؟“ وہ
 اس کی مرونی صورت دیکھ کر اپنی ہنسی ہونٹوں میں
 دبائیں۔
 ”اما! میں چاہتا ہوں آپ اپنی بیٹی کو اپنی بہن
 بنالیں۔“ اس نے جلدی سے اپنی بات مکمل کی۔
 ”میں کیسے اپنی بہن بنالوں علی تو مایین سے چھوٹا
 ہے۔“ اس نے شرارت سے کہا۔
 ”اما!۔“ وہ احتجاجا چیخا۔ پھر اس کے چہرے پر
 شرارت دیکھ کر مسکرا دیا۔
 ”اوی حسرت! مایین تو علی کی بہن ہے۔ میں اپنی
 بات کر رہا ہوں۔ پلیز ملکہ عالیہ! میری شادی مایین
 سے کروادیں۔“ ہادی نے اس کے سامنے دو زانو
 ہو کر اس سے التجا کی۔
 نصب نے اس کے انداز پر قبضہ لگایا اور اس کا
 سراپا گود میں رکھ کر چوما۔
 ”میرا بچہ میں تمہارے بابا سے بات کرتی
 ہوں۔“ اس نے اسے تسلی دی۔
 ”تم کیا بات کرو گی نصب بیگم! مجھے تو پہلے ہی
 شک تھا کہ مال میں کچھ کالا ہے۔“ طاہر کی روشنی
 سی آواز سن کر دونوں چمکے۔ وہ ان کی باتیں
 سن چکا تھا۔
 ”یہ ایسے ہی شروع سے۔“ مایہ مایہ کہتے
 مایین کے پیچھے نہیں پھرتا تھا۔ تم دونوں کان کھول کر
 سن لو ہادی کی شادی میں اپنی پسند کی کسی لڑکی سے
 کروں گا۔“ اس کے خشک لہجے پر سب کو ساہم

سو گئے گی۔
 ”اپنے بیٹے کی زندگی کا فیصلہ میں خود کروں
 گا۔“ آج برسوں بعد طاہر نے ہادی کو اپنا بیٹا
 کہا تھا۔
 نصب اس کی بات سن کر اترے ہوئے چہرے
 کے ساتھ صوفے پر بیٹھی رہ گئی اور ہادی غصے سے
 پاؤں پیچ کر لاؤنج سے باہر جانے لگا۔
 اور تم دونوں میری بات اپنے ذہن میں بٹھالو
 کہ میری پسند کی ہوئی لڑکی اور کوئی نہیں مایین ہی
 ہے۔“ اس نے کڑک کر اپنی بات مکمل کی۔ دونوں
 نے یکدم اسے دیکھا جس کے چہرے پر مسکراہٹ
 تھی۔
 ”کیسا؟ تم دونوں کو ڈرا دیا نا۔“ ہادی جھٹ
 باپ کے گلے جالگا۔ اور نصب نے طاہر کو مصروفی
 غصے سے گھورا۔
 ”میں چاہتا ہوں تمہاری بیٹی میرے بیٹے کے
 دل پر ویسے ہی راج کرے جیسے تم میرے دل پر
 کر رہی ہو۔“ وہ نصب کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا
 اور اس کی جانب جھکا۔ باپ کے انداز پر ہادی
 کا تہقید بے ساختہ تھا۔
 ”شرم کریں آپ! جبران بچوں کے ماں باپ
 ہیں ہم۔“ وہ صوفے سے اٹھ گئی۔
 ”اب تم کہاں جا رہی ہو ابھی سی چائے پلادو
 اتنی اچھی اینکنگ کی ہے میں نے۔“ اس نے
 بانگ لگائی۔
 ”چائے بعد میں پلادتی ہوں پہلے بھابھی کو فون
 کروں کہ ہم اس اتوار کو مایین کو ان سے مانگتے
 آرہے ہیں۔“ اس نے فون کی طرف بڑھتے
 ہوئے کہا۔ ہادی کے چہرے پر بھینسی خوشی کو دیکھ کر
 طاہر نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ جس نے نصب
 کے وجود کو ان کے لیے روشنی بنا کر بھیجا تھا۔
 ☆.....☆

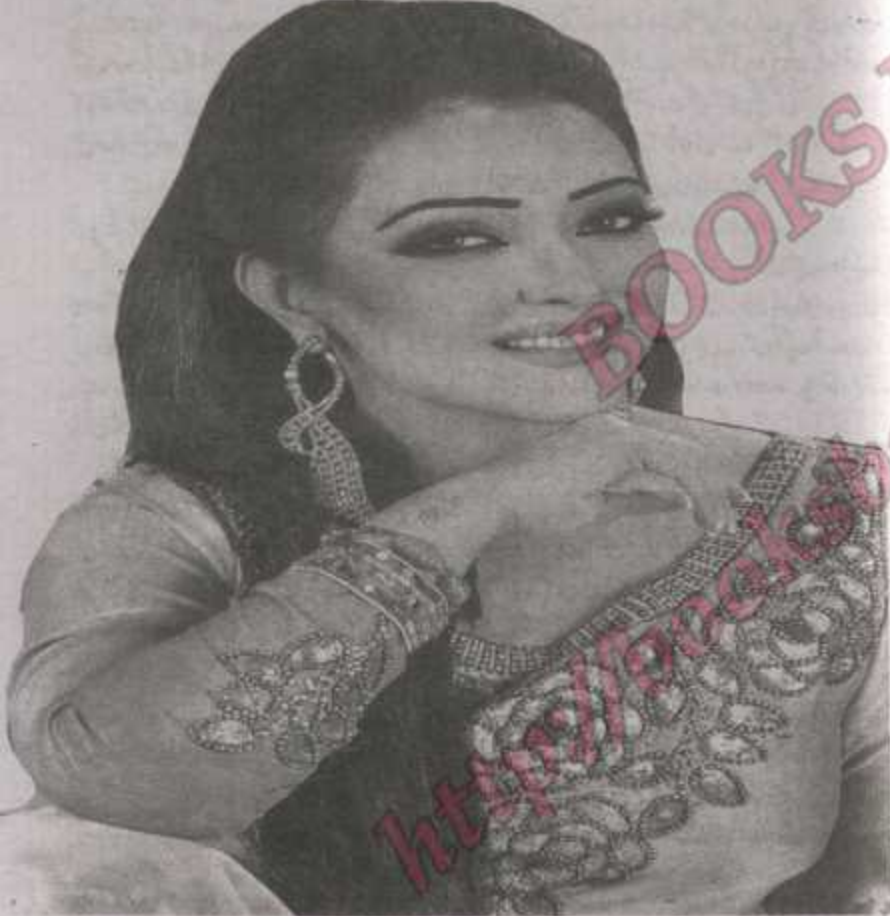
ہرے زرد و گہری لکڑی

”ای پلیز! مان جائیں نا“ دیکھیں آپ مجھے
صرف ایک بار چاہئے دیکھیں میں پھر بھی ضد
نہیں کروں گا۔“
اس نے ایک بار پھر سے اصرار کیا تو اچانک بیگم
اسے صرف دیکھ کر رہ گئیں پھر بے بسی سے بولیں۔
”عائش بیٹا! آپ پلیز مجھے مجھے کی کوشش کریں



میں کیسے آپ کے بغیر پورے 15 دن رہوں گی۔“
وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اچانک بیگم اس
کے بغیر ایک مہینے تک رہ سکتی تھی مگر اس بار وہ خود
بھی مجبور تھا اس نے کانچ ٹوڑ کر جانے کے لئے کانچ
میں حامی بھری تھی اور اب پچھلے کچھ گھنٹوں سے اسی کو
متانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر ذرا سنبھلتا ہو کر بولا۔
”ای پلیز! پلیز ای مجھے جانے دیں۔ کیا آپ
کی خواہش میری خواہش سے زیادہ آپ کے لئے
اہمیت رکھتی ہے۔“
اور وہ اسے کیسے بتائیں کہ اس کی ساری خواہش
خواب ان کے لئے اپنی زندگی سے بھی زیادہ اہم تھے

وہی تو تھا ان کا سب کچھ وہ مرنے سے بولیں۔
”ٹھیک ہے چلے جاؤ مگر مجھے فون کر کے اطلاع
ضرور کرتے رہنا۔“
آخر میں وہ تنہیہ انداز میں بولیں تو عائش بے
ساختہ ان کے گلے لگ گیا۔
”او ٹھیک یو ای! ٹھیک یو سوچ ایڈ آئی یو یو
ویری ویری گج۔“
”آئی یو یو یو مائی سن! اچھا اب جا کر سو جاؤ رات
بہت ہو گئی ہے۔“
وہ محبت سے پھر لہجے میں بولیں تو وہ مسکرا کر گڈ
نائٹ کہتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جبکہ وہ



اور اس دل کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی آئیں۔

☆.....☆

یہ زندگی نے کیسا موڑ لیا تھا کہ اس کے اپنے مصیبت میں تھے اور وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی اسے آج شدت سے خود سے بھی نفرت محسوس ہوئی تھی۔ اس نے بے بسی سے اپنی ماں کو دیکھا وہ کہے لکھوں میں بوجھ ہوئی تھی مارے بے بسی کے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے پھر دوسرے جھک کر ایک سے عزم سے ساتھ کراپنی ماں کے پاس چلی آئی۔

"امی! آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ خدا ہمیشہ اپنے پیارے بندوں کو ہی دکھ دیتا ہے پھر یہ طے ہے کہ ہمارے رونے سے دکھ کم نہیں ہوگا بلکہ بڑھے گا اور برا لگے گا پھر اسی ہمت کریں۔" وہ فرزانہ تنہم کا ہاتھ تمام کمرزئی سے بولی تو انہوں نے حیرت سے اپنی صاحبزادی کو دیکھا پھر فرماں آواز میں بولیں۔

"کیسے سب ٹھیک ہوگا اتنا ہمتی کوئی نہیں ہے اور تم پانچ جوان بھتیجے ہو چلو ایک کی شادی ہو چکی ہوئی جب بھی کچھ حوصلہ ہوتا مگر یہاں تو..... اور تمہارے ابو وہ بھی بیمار ہو کر ہسپتال میں پڑے ہیں۔ جو کپڑوں کی دکان بھی وہ تو بیل کر رکھ ہوئی۔ اب کھر کا خرچا کیسے چلے گا۔ تمہارے ابو کا علاج" بجلی کا بیل کھر کا راشن میں تو سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤں گی۔"

آخر میں انہوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تمام لیا تو بہت روکنے کے باوجود بھی ایک آنسو نکل کر اس کے رخسار پر پھیلتا چلا گیا۔ پھر وہ بولی تو کچھ کر دکھانے کا عزم تھا اس کی آواز میں۔

"امی! ضروری تو نہیں ایک بیٹا ہی کھر کی ذمہ داریاں اٹھائے۔ بیٹیاں بھی تو اٹھا سکتی ہیں آپ فکر نہ کریں میں کہیں جاب کی کوشش کروں گی، آپ کپڑے میں لگے رہیں بچوں کو نوٹیشن پڑھائے گی، امی! ہم سب مل کر اس کھر کو سنبھالیں گے دیے اللہ ایک در بند کرتا ہے تو سو در کھول دیتا ہے مگر ہم انسان

بہت نا اُمیدی سے اس بند رو کو دیکھتے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے باقی کھلے در بھی بند ہو جاتے ہیں اور ہم نا اُمید ماں اس رو کو دیکھتے رہ جاتے ہیں۔" بھی رانیہ کمرے میں داخل ہو کر فرزانہ تنہم سے بولیں تو انہوں نے مسکرا کر فر سے اپنی بیٹیوں کو دیکھا تھا ایک اُمید سے مان سے۔

☆.....☆

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف بڑے بڑے درخت تھے۔ جنہیں مسلسل گرتی ہوائ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف گھر بھی تھے۔ جو کہ آہستہ آہستہ چل کر سڑک پر بہتی جا رہی تھی اس نے ایک نظر اپنے ساتھ چلتی روشنی کو دیکھا تھا وہ اسے اس وقت اس منظر سے بھی حسین لگتی تھی۔

آگئی کیسی ہیں؟ انہوں نے نہیں آنے کی اجازت دے دی۔ "اس کی بات پر عائش کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی پھر وہ فری سے بولا۔

"یو تو میری امی مجھ سے کتنا پیار کرتی ہیں وہ ایک بیل بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ دن میں نہانے کی بار مجھے فون کر کے پوچھتی ہیں۔ میں ٹھیک تو ہوں، میں نے کھانا کھایا ہے۔ رات کو دو دوہ بیا تھا، نیند آگئی تھی کہیں مجھے بخار تو نہیں ہو گیا۔"

اس کی بات پر روشنی بھی مسکرا دی پھر بولی۔ "ابو یاد کر رہے تھے ہمیں کافی دن سے جو تم نے نہیں آئے نا۔" "صرف اٹکل نے مجھے یاد کیا یا پھر کسی اور نے بھی؟" اس کی بات پر عائش شرارت سے بولا تو روشنی نے شرما کر سر جھکا لیا پھر شرارت سے بولی۔

"کیوں تم کوئی گفنام ہو جو کوئی تمہیں یاد کرتا۔" "گفنام شہزادہ تو نہیں ہوں لیکن کسی روشنی نام کی لڑکی کے دل کا شہزادہ ضرور ہوں۔" عائش آنکھ دبا کر بولا تو روشنی ایک دم پزل ہو گئی پھر بولی۔

"تم کیا چاہتے ہو میں یہاں سے چلی جاؤں۔"

اس کی بات پر عائش سنجیدگی سے بولا۔ "تم چلی گئی نا تو مجھے ایسا لگے جیسے میرے جسم سے روح نکل گئی ہو۔" "بذخیر۔" وہ اپنی فحش دور کرنے کو بولی تو عائش کا ہاتھ بے ساختہ تھا۔

☆.....☆

نجانے اسے کتنی دیر ہو گئی تھی بیٹھے بیٹھے مگر لگتا تھا آج وقت نے نہ گزرنے کی قسم کھائی ہو۔ اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے نہ جانے اس نے کتنی سوچیں پڑھی تھیں کتنی دعائیں کیں تھیں مگر آخر کار وہ نا اُمید لوٹ آئی۔ ایک اخبار میں سے دیکھ کر وہ اتار دیوینے لگی تھی مگر نا کام لوتی۔ دل ایک دم دکھ سے بھر گیا سر جھٹک کر اس نے اپنے آنسوؤں کو اپنے سے روکا تھا مگر نا کام رہی وہ بیٹھی ہی تھی کہ ماں چلی آئی۔ جب اس نے ماں کو اپنی پر اطمینان بتائی تو وہ فری سے بولی۔

"امی! میں ابو سے بات کروں گی شاید تمہارے لیے کوئی جاب نکل آئے پھر تمہیں فون کر دوں گی تم پریشان مت ہو پھر۔" امی نے فکر بھری نظروں سے اپنی اکلوتی دوست کو دیکھا۔ بھی فرزانہ تنہم چلی آئیں۔ "ارے! ماں آئی ہے بڑے دنوں بعد آئی ہے سب ٹھیک تھا نا۔"

"جی آئی! میں اپنے ماموں کے کمر لاء ہو رہی ہوں تھی۔ مجھے اٹکل کے بارے میں ابھی پتہ چلا بہت آنسوؤں ہوا اللہ اٹکل کو صحت اور یہی زندگی عطا کرے آمین۔"

"بس بیٹا ہم کی کر سکتے ہیں جیسے مالک کی رضا۔" ان کی بات پر ماں مسکرا کر رہ گئی۔

ماں اور امی چیمپن کی دو سیکن تھیں دونوں ایک دوسرے کی ہر بات جانتی تھیں۔ ایک جان دو کالب والی مثال ایسی کوئی جھوٹ بھی نہ تھی۔ ماں کے ابو کا اپنا بزنس تھا اس کے دو بھائی اور وہ اکلوتی بہن تھی۔ پھر کچھ دنوں بعد ماں خود ہی چلی آئی۔

"میں نے ابو سے بات کی تھی مگر ابو کے پاس کوئی جاب نہیں لیکن ان کے ایک دوست ہیں باقر لودھی صاحب انہیں ایک سیکرٹری کی ضرورت ہے لیکن۔"

"لیکن کیا۔" امی جلدی سے بولی تو ماں بولی۔

"وہ انہیں صرف دو مہینوں کے لیے سیکرٹری کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان کی جو سیکرٹری ہے وہ دو مہینوں کے لیے چھٹیوں پر لگتی ہوئی ہے۔ تم ایسا کرو یہاں دو مہینے کے لیے نوکری کر لو ساتھ ہی ساتھ کوئی اور جاب بھی ڈھونڈ لیں رہتا۔ جب دوسری جگہ نوکری ملے تو یہاں سے ریٹائر ہو جانا۔ یہ لو کارڈ صبح آٹھ بجے پہنچ جانا۔" امی نے فکر سے ماں کے ہاتھ تمام لیے پھر فرماں آواز میں بولی۔

"تمہیں پوچھنا تم میری بہت اچھی دوست ہو۔" "مجھے پتہ ہے، اچھا اب جلدی سے اٹھو اور مجھے اچھی سی چائے دو صحت میں دوہے مروت لڑکی چائے تک نہیں پوچھی تم نے۔" ماں معصومی شکل سے بولی تو اسے احساس ہوا اپنی پریشانی میں اس نے ماں سے چائے کا بھی نہیں کہا۔ وہ خود کو کوئی بچن میں چلی آئی۔ جبکہ فرزانہ تنہم اٹکل ادا کرنے چل دیں۔

☆.....☆

وہ جیسے ہی کھر میں داخل ہوا تو جان تنہم دوڑ کر اس کے پاس آئیں اور اس کے گلے لگ گئیں تو عائش مسکرا کر رہ گیا۔

"کتنے دنوں کے بعد آئے ہو جانتے بھی ہو ایک بیل بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی مگر تمہیں احساس ہے جاؤ میں بات نہیں کرتی۔" وہ غم آواز میں کہہ کر عائش سے الگ ہو کر صوفے پر بیٹھ گئیں تو وہ ان کی محبت پر مسکراتا ہوا ان کے سامنے بیٹھ گیا پھر شرارت سے بولا۔

"امی! میری شادی اگر کسی ایسی لڑکی سے ہو گئی جو مجھے آپ سے الگ کر دے تو۔"

"اللہ نہ کرے میں ایسی لڑکی کو اپنی بہو بھی نہیں

بناؤں کی۔ "وہ غریب کرپولیس تو عائش کھوئے سے انداز میں بولا۔

"وہی روشنی ایسی لڑکی نہیں امی! وہ تو مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔" بھی عائش کی نظروں پر پڑی تو وہ گڑبڑ کر چپ ہو گیا جبکہ وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"اچھا تو تم اتنے بڑے ہو گئے کہ لڑکی بھی پسند کر لی اور مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"ارے امی وہ۔۔۔" عائش ہنسا تھا جبکہ ایمان بیگم مسکرا کر بولیں۔

"چلو اٹھو نہ ہاتھ دھو لو کھانا کھاتے ہیں پھر کبھی تمہاری اس روشنی کے بارے میں بات کریں گے ٹھیک ہے۔" وہ آخر میں شرارت سے بولیں تو عائش مسکرا کر اٹھ گیا۔ جبکہ ایمان بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جو پیار آج انہوں نے عائش کی آنکھوں میں

روشنی کے لیے دیکھا تھا تو دو گہری آنکھیں انہیں شدت سے یاد آئیں نہیں۔

☆.....☆

دوسرے ہی دن وہ باقر لودھی کے آفس میں بیٹھی تھی۔ باقر لودھی خاصے خورد و اور اچھے انسان تھے۔

اسے انہوں نے نوکری پر رکھ لیا تو سارے راستے ایسی روتی ہوئی گھر واپس آئی تھی۔ آخر وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے جا رہی تھی اور اسے اتنی اچھی نوکری ملی تھی۔

وہ جتنا شکر ادا کرتی کم تھا وہ دیئے آرام سے آتی جاتی رہی تھی مگر مسئلہ جب ہوا جب باقر لودھی صاحب کی جگہ ان کے بیٹے شہود لودھی آ گئے۔

نجانے کیوں ایسی کو وہ ہمیشہ بڑا عجیب لگا تھا۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ کوئی پیغام دیتی تھیں۔ شہود لودھی تھا بھی بہت خوبصورت ساری لڑکیاں اس کے آگے چھپے گھومتی تھیں مگر وہ صرف ایسی کا مطلب گار تھا۔ ایسی اس سے

ٹھگ آچکی تھی جب کے ساتھ اس نے کئی جگہ انٹرویو دیئے تھے مگر کام۔ ان دنوں وہ سخت پریشان تھی ایک تو فیصل شوکت (یعنی اس کے ابو) کو ہارٹ ایک ہوا

تھا اور دو ہار مسلسل وقفے وقفے سے ایک ہوئے تھے اور ان کے آپریشن کے لیے ہسپتال کے بل کے لیے اس کے پاس پیسے نہ تھے۔ دوسرا یہ کہ کوئی لڑکا مسلسل ٹھگ کر رہا تھا۔ ایک بار اسے شہود لودھی نے بھی بھایا تھا۔ رانیہ رانیہ اور رانیہ بہت ڈر گئی تھیں۔ شہود لودھی ہسپتال میں بھی نجانے کتنی بار فیصل شوکت کو پوچھ گئے تھے۔ ان دنوں وہ سخت پریشان تھی اس کی نوکری کے دو مہینے ختم ہونے والے تھے اور کہیں اور بھی نوکری نہیں ملے تھی۔ گھر میں مسلسل پریشانیوں کی وجہ سے رانیہ بیمار ہو گئی تھی۔

اس کا کام میں دل نہیں لگ رہا تھا تو شہود لودھی نے اسے سرزنش کی بس اسے تو یہی چاہیے تھا دل کا

بوجھ ہٹانے کو پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

شہود لودھی جو ایک قاتل لینے اس کے کہیں میں آئے تھے اسے دیکھ کر ہونٹ چٹخ کر وہ گئے کافی دیر رونے کے بعد اس کے دل کا بوجھ ہٹا ہوا تو شہود لودھی نے اسے پانی دیا۔ وہ ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر گئی وہ زنی سے بولے۔

"مس ایملی! اگر آپ برآمدہ میں تو میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دیتا ہوں۔ کیونکہ میں ابھی وہی طرف جا رہا ہوں۔ ویسے آپ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے تو۔" کوئی اور وقت ہوتا تو وہ انکار کر دیتی مگر اس وقت اس میں ہمت نہیں تھی اس لیے چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

وہ اپنی سوچوں میں گم تھی جب شہود لودھی زنی سے بولا۔

"مس ایملی! میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے چپک کر اسے دیکھا تھا جبکہ وہ سامنے دیکھ کر بولے۔

"مجھے نہیں ہے محبت کسے کہتے ہیں ہو جاتی ہے یا کی جاتی ہے۔ میں تو نہیں جانتا مجھے بس اتنا ہے کہ آپ مجھے اچھی لگتی ہیں آپ سے باتیں کر کے مجھے

خوشی ملتی ہے۔ جب آپ روتی ہیں تو میرا دل کرتا ہے آپ کے سارے آنسو میں لے لوں میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے نہیں پتہ کہ آپ میرے بارے میں کیا سوچتی ہیں۔ مجھے صرف اتنی خبر ہے کہ میں اپنی زندگی آپ کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔ یہ نہیں ہے آپ نہ میں تو میں مر جاؤں گا یا پھر جی نہیں پاؤں گا لیکن اتنا ہے کہ آپ میری زندگی میں شامل ہو گئیں تو مجھ سے زیادہ خوش قسمت کوئی نہیں ہوگا اور ہاں مجھ سے شادی کے بعد آپ کی سسر زکی شادیاں میرے ذمے آپ کے ابو کا علاج بھی میں کراؤں گا پکا پراس۔" ایسی سادگی سی بیٹھی تھی تو وہ بولا۔

"آپ سوچ سمجھ کر جواب دینا میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں۔ آپ کا گھر آ گیا۔" ایسی حیران پریشان کی گاڑی سے اتری۔ جبکہ گاڑی زن سے ہٹا کر گیا۔

وہ عائش دماغی سے گھر میں داخل ہوئی۔ یہ نہیں قسمت کو کیا منظور تھا مگر اتنا ضرور تھا اس کی ہاں کی صورت میں حالات بدل ضرور سکتے تھے۔

☆.....☆

"امی کیا ہو رہا ہے؟" وہ کچن میں داخل ہوتے ہوئے بولا تو ایمان بیگم نے محبت سے اسے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولیں۔

"بس کچھ نہیں میں تمہارے لیے چٹ پٹا چمپورہ بنا رہی ہوں ساتھ میں رانیہ، آلو مسالے والے اور چائیز آٹلیٹ۔"

"واہ امی! آؤ سرکيوٹ۔" وہ لاڈ سے ان کے گلے میں بازو ڈال کر بولا تو وہ مسکرا کر رہ گئیں۔

اچانک وہ دھڑک دھڑک کر بولا۔

"لوٹ امی! خالہ کا فون آیا ہوا ہے وہ بولڈ پر ہیں آپ جائیں۔" وہ مسکرا کر باہر چلی آئیں۔

"ہیلو السلام! علیکم رانیہ کیسی ہو؟"

"وہ بیگم اسلام! میں ٹھیک ہوں کب سے فون کیا

ہوا ہے مگر عائش بیٹے کی تو باتیں ہی ختم ہونے میں نہیں آتیں آف کتا بولتا ہے یہ لڑکا۔"

"خیر دار جو میرے جگر کے گھڑے کو کچھ کہا تو۔"

ایمان بیگم مصنوعی ہنسی سے بولیں تو رانیہ ایک دم سنجیدگی سے بولیں۔

"آئی ایک بات کہوں؟"

"ہاں کہو کیا بات ہے۔"

"آئی! جب عائش بیٹا پڑھنے چلا جاتا ہے تو آپ تنہا کیسے رہتی ہیں ایک تو میں اتنی دور بھی ہوں آ بھی نہیں سکتی آپ تو بور ہو جاتی ہوں گی۔"

"بوریت کیسی رانی! یونہی ہم کبھی بھی تنہا ہو کے بھی تنہا نہیں ہوتے کسی کی یاد کسی کی باتیں میں تنہا ہونے نہیں دیتیں۔ ہمیشہ ہمارے ساتھ ایک دوست کی طرح رہتی ہیں جو کبھی نہیں ہنساتی ہیں کبھی رلاتی ہیں۔ تو بھی ہمیں دنیا سے بہت دور یادوں کے جنگل میں تنہا چھوڑ دیتی ہیں۔ یہ یادیں بھی نا پوی خالم ہوتی ہیں کبھی آپ کے دل کا خیال نہیں کرتیں اور مرتے دم تک سائے کی طرح ساتھ رہتیں ہیں لیکن

سایہ تو اندھیرے میں ساتھ چھوڑ دیتا ہے مگر یہ ہمارا ساتھ بھی نہیں چھوڑتیں۔ بس آپ پر حاوی ہو جاتیں ہیں آپ چاہ کر بھی اس سے چپکا نہیں چھڑوا سکتے اور ویسے بھی جن کے ساتھ چاہیں ہوتیں ہیں وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے۔" آخر میں ان کی آواز میں کمی کھلنے لگی تو وہ خاموش ہو گئیں جبکہ پیشانی سے بولیں۔

"سوری آئی امیری بچہ سے آپ دگنی ہو گئیں۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ تم آسن کے بارے میں بتاؤ وہ کیسے ہیں بھائی صاحب۔" وہ خود پر قابو پا کر بولیں پھر کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے انہوں نے فون بند کر دیا اور سوچوں میں الجھی کچن کی طرف بڑھ گئیں جہاں عائش کھڑا تھا انہیں آواز میں دے رہا تھا مگر وہ تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔

☆.....☆

شفاف

پَرکشش آپ

Acne-Aid

- یہ دوا آپ کی جلد سے زائد ہونے والی جراثیم کو ہٹاتی ہے۔
- یہ دوا آپ کی جلد کو خشک نہیں کرتی۔
- یہ دوا آپ کی جلد کو لالہ نہیں کرتی۔



Acne-Aid is a registered trademark of Stiefel Laboratories, Inc. All other trademarks are the property of their respective owners. © 2015 Stiefel Laboratories, Inc. All rights reserved.

کچھ مہینے بعد ہی شہود لودمی ایسا گیا کہ کبھی مڑ کر نہ آیا۔
فرزانہ تنگ کو شوگر ہو گئی اور وہ کچھ عرصے بعد ہی انتقال کر گئیں جبکہ فیصل شوکت بھی بیوی کی جدائی نہ برداشت کر سکے اور ان کے پاس طے ہو گئے۔

تب ایقان تجارہ گئی اس نے پھر عائشہ کو جنم دیا کیونکہ جب شہود لودمی اسے چھوڑ کے گئے تو وہ پریشان تھی اس نے بہت ڈھونڈا شہود لودمی کو مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ بھی بھی اسے اپنا آپ برف زاروں کی اک جلی کی طرح لگتا تھا۔

برف زاروں کی اک جلی ایک مضمون نو جوان اسکی لڑکی اپنے دونوں بازوؤں کو منہ کی طرف سے لپیٹے برف زاروں میں جھپکی جھپکی پر ننگے پاؤں چل رہی تھی ایک جگہ سے کمزور برف ٹوٹ گئی اس مضمون لڑکی کا وجود پھر لچھر درخت بنی کی کہانی میں جا رہا تھا اس نے اپنی باتیں ایسے کھول دیں جیسے علی اپنے بڑوں کو کھول دیتی ہے اس کے دل میں قید تھے بھی آنسو تھے وہ سب جتنی موتی بن گئے اس کے وجود میں متعین سارے تم گلاب کے گلے ہوئے تازہ پھول بن گئے۔ اس کی ہمسفر سنہری یادیں رنگوں سے بھری تھیلیاں بن گئیں۔ برف زاروں کی اس سرد ترین قبر میں وہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہو چکی تھی۔

اس کی ساری باتیں باہر سیٹ ہو چکی تھیں کوئی نہیں تھا جسے وہ اپنے غم کہتی۔ عائشہ کو اس نے سب کچھ بچ بچ بتا دیا تھا آخر وہ کب تک اس سے چھپاتی ہے چاہے جیسا بھی ہو زیادہ عرصے تک چھپ نہیں سکتا ایک نہ ایک دن سامنے آ کر ہی رہتا ہے۔

نہ جانے کتنی دیر ہو چکی تھی انہیں روتے ہوئے کچھ خبر نہیں تھی یہ تھا تو صرف اتنا کہ شہود یاد آ رہا تھا۔
”امی! کیا ہوا آپ کیوں رورہی ہیں؟“
عائشہ جو ان کے کمرے میں انہیں گڈ نائٹ کہنے آیا تھا پریشان سا بیوی لاقو انہوں نے چونک کر اسے دیکھا پھر اپنے آنسو صاف کر کے پوچھیں۔

وہ کمر داخل ہوئے ہی چار پانی پر ڈسے گئی اسے ایسے محسوس ہوا تھا جیسے نہ جانے کتنی سال دور سے وہ پیدل چل کر آئی ہو دماغ میں صرف یہ ہی الفاظ گونج رہے تھے۔
”مجھ سے شادی کے بعد آپ کی سسر زنی شادی میرے ڈسے اور آپ کے ابو کا علاج بھی میں کرواؤں گا پاپا پراس۔“

فرزانہ تنگ نے دکھ سے اپنی ذمہ داری کو دیکھا وہ جانتی تھیں کہ اس کی نوکری ختم ہونے والی ہے اور وہ آجکل اسی وجہ سے پریشان ہے بھی تری سے پوچھیں۔
”امی پتر اتور پریشان نہ ہوا انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ امی اپنی بات بھی مکمل نہ کر پانی میں کہ دانہ گھرائی ہوئی کمر میں داخل ہوئی اور آتے ہی فرزانہ تنگ کے گلے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی تو امی نے پریشانی سے بہن کو دیکھا۔ دانیہ کمر میں ٹیوشن دیتی تھی۔

”امی امی وہ لاڑکے آج پھر۔۔۔ امی میں اب باہر نہیں جاؤں گی۔“ وہ بری طرح روتے ہوئے بول رہی تھی جبکہ امی پر سکون ہوئی پھر بولی۔
”ٹھیک ہے دانیہ! انہیں اب کمر سے نکلنے کی ضرورت نہیں ہے اب تم اپنی شادی کے خواب دیکھو۔“

وہ ایک دم فیصلہ کر کے ہلکی پھلکی ہو گئی تھی پھر اس نے فرزانہ تنگ کو شہود لودمی کے پرنسزل کے بارے میں بتایا تو انہوں نے خوشی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اس کے صرف پچھتے بعد ہی وہ ایقان فیصل سے ایقان شہود لودمی بن گئی۔ وقت کچھ اس قدر تیزی سے گزرا کہ وہ خود بھی حیران رہ گئی۔ شہود لودمی نے جیسا کہا تھا ویسا کر دکھایا۔ اس نے ابو کا علاج کروایا۔ تینوں کی شادیاں کروائیں پھر ایقان شہود کے ساتھ لاہور سے کراچی چلی آئی۔ اس کے ساتھ امی اور ابو بھی تھے۔ ابو اب مکمل مستحیاب ہو چکے تھے۔ ایقان اور شہود کی شادی کی خبر لودمی دلا میں کسی کو نہیں تھی۔ امی نے بھی شہود سے نہیں پوچھا تھا ان کی شادی کے

UHU® stic glue stick

The exclusive
screw cap
prevents
the glue
from drying.

UHU®
stic
glue stick
lapiz
adhesivo

solvent
free
sin
disolven-
tes

UHU The World of Adhesives

میری کزن بانو سے جب میں نے شادی سے انکار کیا تو اب بہت غصے ہوئے کہ انہوں نے بانو کے کہنے پر زبان دی ہے میں نے ابو سے کہا بھی کہ بانو کی شادی شام بھائی سے کرویں وہ نہیں مانے پھر پتہ نہیں چلے انہیں پتہ چل گیا کہ میں شادی کر چکا ہوں۔ آخر انہوں نے کہا کہ وہ میری بیوی یعنی تمہیں مارویں گے بس اسی لیے میں تمہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ کیونکہ مجھے تم سے اپنی جان سے بھی بڑھ کر محبت ہے۔ ابو مجھے کہتے رہے کہ میں بانو سے شادی کر لوں مگر میں نے یہ کہہ کر جب کرا دیا کہ اگر آپ نے مجھ سے زبردستی کرنے کی کوشش کی تو میں خودکشی کر لوں گا کچھ عرصے پہلے ہی ابو کا انتقال ہوا ہے۔ میں نے نہیں بہت ڈھونڈا مگر مجھے نہیں ملیں تم کہاں ملیں گے۔

”میں کہیں نہیں گئی شہود! آپ عائش سے ملے۔ یہ آپ کا بیٹا ہے۔“

”شہود! عائش کی بے قراری آواز کمرے میں گونجی۔ شہود لودھی نے آگے بڑھ کر اپنے بیٹے کو گلے سے لگایا اور غم لہجے میں بولے۔

”میرا بیٹا میرا بیٹا رہا عائش۔“

”لیکن تم لوگ یہاں کہاں؟“ شہود لودھی نے الجھن سے اسے دیکھا شام لودھی مسکرا کر بولے۔

”تمہارے بیٹے اور میری بیٹی کی شادی کے لیے۔“ شام صاحب پیچھے سے بولے۔

”ارے دادا! تو بہت اچھی بات ہے۔ دیکھو شام تم مانو یا مانو روٹی آج سے میری بہو ہے میرے عائش کی بیوی۔“ وہ شرارت سے بولے اور پھر ٹھٹھا کر بیٹھ پڑے۔ جبکہ شام لودھی نے تہانے کتنے سال بعد اپنے بھائی کو ہنسنے ہوئے دیکھا تھا اور ان کے لیے ڈھیروں دعائیں کر ڈالیں تھیں۔

آخر وہ ختم ہو گئے تھے اور خوشیوں کی پر یوں نے سب کو اپنے پروں میں چھاپا تھا۔

☆

”مگر نہیں میری جان! ایسے ہی تمہارے۔“

”ابو یاد آ رہے تھے۔“

وہ بول رہی تھیں تو وہ ان کی بات کاٹ کر بولا تو انہوں نے بے اختیار نظریں چرائی تھیں۔ وہ ایک دم بات بدل کر بولا۔

”امی! روشنی کے گھر کب ملیں گے قسم سے اب اور۔۔۔“

”ہاں ہاں مجھے پتہ ہے تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ اب جاؤ سو جاؤ۔“

وہ اس کی بات کاٹ کر بولیں تو وہ جلدی سے بولا۔

”لیکن امی! روشنی کے گھر۔۔۔“

”ٹھیک ہے کل میں جا کر روشنی کا ہاتھ لائیں گی بس اب خوش۔“

”لیکن امی! وہ لوگ روشنی سے بہت پیار کرتے ہیں دیں گے تو پوری روشنی دیں گے ہاتھ نہیں دیں گے۔“ وہ شرارت سے بولا تو ایمان بیگم بے ساختہ مسکرا دیں۔

☆

اس سے اگلے دن وہ اور عائش روشنی کے لاؤنج میں بیٹھی تھیں ایمان بیگم روشنی کی امی اور ابو سے بات کر رہی تھیں جو شخصیت اندر داخل ہوئی اسے دیکھ کر وہ ساکت رہ گئیں۔ وہ آج بھی وہی تھیں جیسے آج سے 25 سال پہلے تھا۔ خوب روینڈم لیکن آج اس کی آنکھوں میں چمک کی جگہ حیرت بے یقینی محبت بے قراری مان تھا۔ شہود لودھی آگے بڑھے اور ایمان عرف امی کو گلے لگا کر رو پڑے۔ جبکہ برف ذراؤں کی تلی آج پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہاں پر موجود ہر کسی کی آنکھیں نم تھیں۔ پھر سب آہستہ آہستہ باہر چلے گئے تو شہود لودھی بے قراری سے بولے۔

”مجھے معاف کر دو امی! پلیز مجھے معاف کر دو مجھ سے لفظی ہو گئی جو تمہیں بتائے بغیر چلا گیا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ ابو ایسی اور کو یہ پتہ چلے کہ تم میری بیوی ہو۔ تم جانتی ہو میری بات سمجھن میں ہی غلطی

شکست

سردیوں کی نرم گرم دھوپ بڑی فرحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔ گاؤں کی عورتیں کن میں بھی رضائیوں کے ٹانگے بکے کر رہی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہاتھوں کا ٹھنڈی بھی جاری تھا۔ ایسے میں کوئی عورت کوئی بڑا ٹھنڈا پتھر تو سب ہی بھی کر کے لیتیں۔ اندر کمروں میں لڑکیوں کی محفل میں ڈھول پیٹنے اور گانے بجانے کی آواز نے پورے گھر میں دھماکے مچا دیے۔ لوگوں کے جمع ہونے نے خود بخود گھر میں محفل جھادی تھی۔ کہنے کو شادی میں ابھی دو ماہ باقی تھے۔ پر خالہ روزنی گاؤں کی عورتوں کو جمع کیے رکھی اور روز بھی بیٹیوں کے جینز کی نئی ٹوپی چھڑیں دیکھا کر خوب داد بھرتی۔ گاؤں کی عورتیں اس کی کراہتیں۔ گاؤں کے تقریباً ہر گھر سے ہی غربت چھٹی تھی کچھ عرصہ پہلے اس کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا تھا مگر جب سے آصف دینی گیا تھا ان کی تو گویا کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ وہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور سب ہی میں پڑھنے لکھنے میں بہت اچھا تھا جس کی وجہ سے تعلیم سے بے پناہ عشق تھا لیکن لبا کی موت نے اس کے ارمانوں پر اوس ڈال دی تھی۔ گھر کی بھاری ذمہ داری اس کے کندھوں پر آن گئی تھی۔ خالہ چاہتی تھی کہ وہ کسی کام کا پیر لگ جائے۔ دس جماعتیں تو پڑھ ہی لی تھیں اور اب بھی یہی مگر گزرتے دن کا ایک پہر پتی ایسا نہیں گزرتا تھا جب وہ اپنی تعلیم کے لیے افسردہ نہ ہوا ہو اس کا انجینئر بننے کا خواب خواب ہی رہ گیا تھا گھر پر فالتے ہوئے کی نوبت پر سب کچھ چھوڑ دینے پر اس نے



اور اس کی سہیلیاں ان کی بدلتی زندگی پر رشک کر کر کے نہ تھکتی ہیں اور اب خیر سے وہ دوستیوں کو بھی بیاہنے جاری رہی تھی۔ آخر میں چھوٹا احمد بچا تھا۔ جس کے لیے آصف نے سختی سے حکم صادر کیا تھا کہ وہ دل لگا کر پرہیزی پر محنت کرے پیسے کی کوئی فکر نہ کرے۔ اس بار خالدہ نے جیہز اور بھی عمدہ جمع کیا تھا۔ آئے روز گھر میں شادی کے بہانے مٹھل بج جاتی تھی اور راشن کا بل حد سے زیادہ تیار ہو کر جاتا۔ اس شادی کے خرچے کا رونا رو رو کر اس سے خوب پیسے مانگتا تھا۔ اماں کو لگتا تھا اس کے لیے پیسے بھیجتا ہوں یا کچھ کاٹتا ہوں۔ اور جس مشکل سے وہ بھیجتا تھا یہ وہی جانتا تھا۔ شادی کے لیے ایک بھاری رقم بھیجنے کے لیے اسے اور عام لگتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی صحت بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔ اس دفعہ خالدہ نے اسے سختی سے شادی میں آنے کا حکم دیا تھا۔ اسے دینی گئے پانچ سال ہونے والے تھے اور اس عرصے میں وہ ایک بار بھی نہ آیا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ پیسے بنانے کی مشین ہو کر اس بار اس کا بھی دل جا رہا تھا۔ آخر جانے کواں لیے اس نے ماں کی بات مان لی تھی۔

☆.....☆

سورج سر پر آن پہنچا تھا مگر ان کی باتوں کا مشغل ابھی بھی جاری تھا کیونکہ شہد بھی شہید تھی اس لیے سورج کی پیش بڑی بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ رضائیوں کے پائے کئے کرنے کے بعد اب وہ لوگ مونگ پھلیاں کھانے لگیں تھیں۔ ایک کے بعد ایک نکلنے موضوع نے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہونے دے دیا تھا۔

”اسے بھی خالدہ! بیٹیوں کے فرض سے تو سبکدوش ہوگئی ہو اب بیٹے کی شادی کے لٹو بک کھلا رہی ہو؟“ اچانک ایک عورت نے سوال اٹھایا تھا۔ خالدہ کے منہ میں جاتے مونگ پھلی کے دانے ختم گئے مگر جلد ہی اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔

”اتنی بھی جلدی کیا پڑتی ہے تم لوگوں کو میرا پتر پیلے

جیسے طریقے سے کھا تو لے۔“ اس نے چٹاٹ جھار دیا۔

”پھر بھی کوئی لڑکی تو دیکھ رکھی ہوگی۔ آخر وقت گزرنے کا پتہ لگتا ہے بھلا اس سے چھوٹیوں کو تو زیادہ تو نے۔“ ایک اور نے اسے آڑے ہاتھوں لیا اسے ہاتھیں آیا مگر ضبط کیے رکھا۔

”جب وقت آئے گا تب بیاہ دوں گی تم لوگ زیادہ فکر نہ کرو۔“ اس نے سختی سے کراہ سا جواب دے کر خاموش کرادیا۔ عورتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشعارہ کر کے طرے سے مسکرا رہی تھیں۔ وہ اس کی محبت سے بخوبی واقف ہوئی تھیں اور آنے والے وقت میں چار پل رہا تھا اس کے ارادے کیا تھے۔

☆.....☆

شادی سے دو دن پہلے آصف کی آمد ہوگئی تھی۔ خالدہ نے خوب ڈھیر دیاں پکائے اس نے منانت سے کہا بھی تھا کہ کوئی خاص انتظام نہ کیجئے گا مگر اس نے سنا ہی کہاں گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی اسے انھوں سے لدا چھندا دیکھ کر اور بھی چھوٹے لپٹن سا رہے تھے۔ ہر کوئی ایک سے ایک نیا تازہ قصہ شادیاں سن رہا تھا۔ وہ بھی خوشدلی سے مسکرا رہا تھا۔ اینٹوں کی چابوت اور دھن کی خوشبو بھلا دیار غیر میں کہاں میسر تھی۔ وہ بھی آج سالوں بعد جیسے بر سکون خند سو رہا تھا۔

☆.....☆

آج گھر میں مہندی تھی مگر مہمانوں سے بھر ہوا تھا۔ مشکل ہی تھا جو کوئی کونہ خالی تھا۔ مہمانوں اور شادی کی ساری ذمہ داری بھی اسی کے کندھوں پر تھیں جن میں وہ بری طرح چھٹا ہوا تھا۔ بات ہوئی تو تقریب کا بھی آغاز ہو گیا اور جب تک رسومات چلتیں تو وہ گھڑی کا آرام بھی اسے میسر آ گیا وہ سانس لینے کو یونہی ایک کونے میں پڑی کر رہی پر پچھ گیا تھا سانس ہی اس کی نظر کشادہ چھن سے ہوتی ہوئی رسومات کرتے ہوئے لوگوں پر پڑ رہی تھی گا پے بگا پے بہت بڑے رونق منظر تھا۔ سب خوش تھے

اور وہ بھی مطمئن تھا جو فیصلہ اس نے مشکل وقت میں کیا تھا۔ آج اس پر خوش تھا اگر وہ نہ کرتا یہ فیصلہ تو گھر میں شاید آج یہ خوشیاں اتنے جشن سے نہ منائی جاسکتی ہوتیں۔ بہنوں کی ایک بڑی ذمہ داری سے آج وہ سبکدوش ہو گیا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں تھا جب بے ساختہ اس کی نظر سامنے آنے کی طرف اٹھی تھی اور ٹھہر گئی تھی۔ وہ کوئی لورٹکس تھا مگر زندگی میں پہلی بار کوئی لڑکی اتنی اچھی لگی تھی کہ وہ ایک تک اسے دیکھنے گیا پہلے سادہ سے کان کے سوٹ میں ملیں ہر زینہ و آرائش سے پاک وہ بہت معصوم لگ رہی تھی۔ تنہید نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا ہوا تھا وہ جوان تھی پر بالی عمر کی کوئی شوقی نہ تھی۔ اگرچہ وہ بہت حسین نہیں تھی تو ایسی کم شکل و صورت کی بھی نہ تھی۔ کم از کم اس کی نگاہ میں تو بہت پرکشش لگی تھی۔ یکدم ایک خوشنما خیال سے اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور دل ایک جذبے سے جھڑکا تھا وہ جب تک ہنسا رہا اس پر نگاہ نہ ملے رہی اور جب کاموں میں لگ گیا تب بھی وقتا فوقتا اس پر نظر ڈالنا نہ بھولتا اس کی پوری اس سے بھی چھپی نہ رہی تھی۔ پہلے پہل وہ حیران ضرور ہوئی تھی پھر اس نے کوئی توجہ دیے اس کی جانب دیکھا اس میں مگر اس کی بے چین نگاہیں پوری شادی میں اس کا شہابی کرنی رہیں تھیں۔ اس نے معلوم کر دیا تھا کہ وہ کون تھی اور اس بات کی حیرت اور خوشی بھی ہوئی کہ وہ اس کے چاچا کی انوکھی بیٹی تھی۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا تب وہ تیرہ برس کی محسوس ہو گئی تھی اور اٹھارہ برس کی جوانی کے روپ نے اسے کھار دیا تھا اس نے سوچ لیا تھا شادی ختم ہوتے ہی وہ اماں سے بات کرے گا کہ جلد سے جلد وہ اس کا رشتہ کرے کہ اسے اور ابھی بھی اس نے بڑے ارمانوں سے ماں کے آنے والی کی خواہش رکھ دی تھی۔ اس کی بات سن کر خالدہ تو جیسے سے لگ کر نکلیں اور صاف صاف انکار کر دیا پر بہانہ کر کے اس کی چاچا سے بھی نہیں بتائی تو اس کی بیٹی کو کیسے برداشت

کرے گی وہ ماں کے پاؤں پر گیا یہ وہ نہ مانی اس کے ارمانوں پر تو جیسے اس پر پئی وہ جوں سا کھ کر چلا گیا۔

☆.....☆

وہ افسردہ رہنے لگا تھا۔ خالدہ سب بھانپ رہی تھیں مگر وہ انجان بنی رہیں۔ اسے تو اور بھی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ جواز کی ابھی آئی نہیں تھی اس کے لیے اس کا بیٹا بڑا بولا بھلا پھر رہا تھا اور اگر آجانی تو نچانے کیا ہوتا تھا۔ اس نے تو سوچ کر ہی اپنے خیال کو جھٹکا۔

اس سب مزید یہاں رہنا وہ بھرو گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ماں سے کسی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ جسے بے دردی سے بغیر کسی وجہ کے ٹھکرادیا تھا۔ اس نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جب خالدہ کو خبر ملی تو اس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ حتیٰ کہ اسے روکنا بھی کوارا نہیں کیا۔ اس کا جلد سے جلد چلے جانا ہی اسے بہتر لگا تھا۔ ورنہ یہی خوف ستاتا کہ وہ کوئی جذبہ پانی قدم نہ اٹھا لے اور پھر وہ جو گیا تو واپس نہ پلٹا۔ ماہ و سال گزر گئے غموں خوشیوں کے موسم گزر گئے۔ اول تو خالدہ کا اس کی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ غربت کے خوف کا سانس آج بھی اس سے چھنے ہوئے تھے۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے اس کی شادی کر دی تو اس کمائی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے اور اس کی اس سوچ کے ساتھ ہی وقت بیت گیا۔ یہاں تک کہ چندہ برس گزر گئے اور ان برس میں وہ پیرہنے کی مشین بنا رہا۔ اس نے ڈھیر دیاں ڈھیر گھر والوں کو پیسے دیے بہنوں کے بازوئے اٹھائے یہاں تک کہ ان کے سرسایوں کو بھی بھرا پر ایک مرتبہ بھی اس کے پاس میں کسی نے نہیں سوچا اور نہ اس نے شکوہ کیا۔ احمد تو اپنی پسند منوا کر اپنی کلاں فیلو سے شادی کر کے کامیاب ہو گیا۔ جس کا کسی نے اتنا لالچ بھی نہیں کیا۔ وہ چھوٹا تھا سب کا لاڈ تھا۔ اور اس جیسی کامیابی احمد کے پاس نہیں تھی۔ اس لیے گھر والوں کو کوئی فکر لاحق نہ تھی۔ پر اب احمد سراسر کرنے لگا تھا کہ وہ وہاں آجائے۔ وہ روز

اسے فون کر کے اسی بات پر زور دیتا تھا۔ لیکن وہ نہ مانا احمد کا اصرار بڑھتا رہا۔ اور وہ کس سے کس نہ ہوتا اور آج اس نے لکسی ونگس دی تھی کہ اس نے فوراً سامان باندھ لیا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اب وہ نہ آیا تو اب اس کا امر ماننے بھی نہ دیکھتے دے گا۔ وہ خود کو جتنا بھی لا تعلق کر لیتا لیکن وہ جس نہیں تھا اور یہ اس کی محبت کا تقاضہ تھا جو وہ دیا رہی تھی ان کے لیے مشتقیں برداشت کر رہا تھا پھر وہ کیسے تصور بن سکتا تھا۔

جب آخری مرتبہ وہ یہاں سے گیا تھا تو پچیس برس کا تھا اور آج چودہ برس گزرنے کے بعد پچیس برس کی عمر میں اس نے قدم رکھا۔ اس کی کن جینوں پر سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ اور آنکھوں کے گرد گہری جھریوں نے احاطہ کر لیا تھا۔ اس کا کسرتی بدن پہلے سے کافی کمزور ہو گیا تھا۔ محنتوں نے اسے عمر رسیدہ بنادیا تھا۔ وہ اپنے گاؤں کی مٹی کی خوشبو کو اپنے اندر اتار دیا تھا۔ اس کی جانب روانہ ہو گیا تھا۔ کھلے دروازے سے جب وہ اندر داخل ہوا تو سامنے ہی چارپائی پر پاں کو لپٹا پایا۔ اسے دیکھ کر وہ تیزی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور اسے فوراً اپنے ساتھ لپٹا لیا کتنی ہی دیر وہ اسے گلے لگاتے وہ آنسو بہاتی رہیں۔ ماں کے آنسوؤں نے اس کے دل کو مزید آسودہ کر دیا تھا۔ اپنوں سے جدائی کا اس نے محسوس حلقہ طے کیا تھا۔ اندر سے آتا احمد اسے دیکھ کر کھل اٹھا تھا کتنی ہی دیر وہ بھی ایک دوسرے کے گلے لگے پرانی یادوں کو تازہ کرتے رہے تھے۔ لمبے بھر میں رونق کا سامان بندھ گیا تھا۔ اس کے آنے کی اطلاع بہنوں کو بھی کر دی گئی تھی۔ مگر وہ اپنی بے انتہا مصروفیت کی بناء پر پہنچتی نہیں سکیں۔ اور اس نے ملال بھی نہ کیا ملال تو اب وہ کرتا بھی نہ تھا۔

کچھ دن کافی خوشگوار گزرے تھے جن میں وہ اپنے پرانے دوستوں اور شہنشاہ داروں سے مل کر تازہ ہو گیا

تھا۔ وہ چاہا کہ ہاں نہ گیا۔ اس کی بہت ہی نہ ہوتی۔ جب یہ معلوم ہوا کہ گنبدیہ ہو کر اپنے بارہ سالہ بیٹے کے ساتھ سینکے آن بیٹھی ہے۔ وہ گہرے تاسف میں گر گیا۔ حالانکہ اس نے کوئی وعدہ نہ کیے تھے اسے اس مگر پھر بھی اندر ایک ملال نے سیرا کر لیا تھا۔ وہ یہاں کیوں اتنے اصرار سے بلایا گیا تھا۔ یہ راز بھی چند دن میں فاش ہو گیا۔ جب احمد نے اسے صاف لفظوں میں کہا وہ اپنی بیوی کے ساتھ شہر شقت ہو رہا ہے۔ لہذا اماں کو لے جانا ممکن نہیں جس کی وجہ سے پچھلے دنوں وہ سخت پریشان رہا ہے آگے سے اس نے کوئی بات نہ کی۔ خالہ کی دوسری بیوی خوش اسلوبی سے لے کر اسے آزاد کر دیا ایک سچا شکرگزار ہے اس کے لیوں کا احاطہ کیا تھا۔ مگر پھر بھی نبھانے کیوں آئے ہوئے اس نے خوش فہمی باندھ لی تھی۔ شاید انہیں اس کی پادشاهی کی خوشبو بلانے پر اسرار کیا اور ایک مرتبہ پھر اس کا ٹوٹا اور کڑی کر رہی ہو کر بھر گیا۔

سرور کوں کے موسم کا آواز ہو گیا تھنڈی ٹھنڈی دھند زدہ شاموں نے ہر چیز کو لپیٹ میں لے لیا تھا مختصر دن اور طویل راتیں تیزی سے گزرنے لگیں۔ خالہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی تھی اب وہ ملال اس کی خدمت میں جتا تھا۔ اور وہ مولو سالا سے دھندلتی رہتی تھی اسے اب شادی کے لئے اصرار کرتی تھیں اور اس کے ساتھ وہ طنز یہ بھی فیس دیتا تھا خالہ کو آج بھی اپنی دیوانی سے یہ تھا اور گنبدیہ کو آج بھی وہ ہونا نہ کا نہ سوچتی تھیں خالہ سارا دن رشتہ داروں اور بچوں کو کوئی رہنمائی جو بقول ان کے سب نے انہیں بہت دکھ دیئے ہیں وہ چپ چاپ ہنستا رہتا۔ ایک روز وہ یونہی گاؤں کا پتھر لگانے لگا تھا کہ راستے میں چاہا کھراگئے ان کے محبت سے بھر پور انداز سے وہ شرمندہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ بھی اس کے گھر نہ آنے کا شکوہ نہ کیا تھا اہلیت اس لئے اپنے ساتھ اسے زبردستی کھلے گئے تھے وہ شرمندہ سالانہ کے ساتھ چل دیا۔ چاچا بھی اسے دیکھ کر

بہت خوش ہو گئے البتہ گنبدیہ آج بھی ویسی ہی خاموش اور سنجیدہ تھی اس نے اس پر سے اپنی نگاہیں پھیر لیں اس میں اتنی سکت تھی وہ اسے دیکھ کر پتا البتہ اس کا بارہ سالہ بیٹا بڑا خوش مزاج اور ذہین تھا۔ اس سے یوں بے تکلف ہو کر باتیں کرتا تھا جیسے برسوں کی جان پہچان ہو ان کے کچ بیٹھ کر اسے بڑا خوشگوار احساس ہوا تھا اور نہ آنے کا گھر ملال بھی۔

جس وقت وہ گھر لوٹا تو خالہ کو انتظار میں مگر منہ ساراپایا اس نے چھوٹے ہی اس کے در سے آنے کی وجہ دریافت کی تھی جسے وہ ہال گیا تھا پھر خالہ نے بھی توجہ نہ دی۔ ساری رات اس کی جاگ کے گزری کئی بار آنکھوں کے سامنے اس کے دل کے قریب اداس چہرہ آ جاتا تھا یہ حقیقت تھی وہ اسے بھول ہی نہ پایا تھا جس کی یاد میں اس نے زندگی کے کتنے ہی سال گزار دیئے تھے۔ وہ بھول جیسا چہرہ مر جھا گیا تھا۔ اور چاہا چاچا کے مگر منہ اداس چہرے اسے اور بھی پریشان کر گئے تھے۔ اسے خود پر بھی قسم آتی تھا مگر وہ ماضی میں اتنا کمزور نہ پڑا رشتوں کے آگے جن رشتوں کی وجہ سے چھوڑا تھا۔ آج ان میں سے کوئی بھی باقی نہ تھا۔ کیا اس نے اس دن کے لیے اتنی محنت کی تھی کہ اب آج تن تنہا خالی در و دیوار کو تنگ اس نے بہت کچھ کھوا دیا تھا۔ حالانکہ وقت بھی اس پر مہربان بھی ہوا وقت ہمیشہ مہربان نہیں رہتا۔ پر آج نبھانے کیوں ایسا لگ رہا تھا ایک موقع اسے جو اس نے کھوا دیا تو شاید پھر بھی نہ ملے۔ وہ بچوں کو کھانا کھاتا تھا اور اپنے خیالوں کو عملی جامہ پہنانے لگا تھا۔

بچوں کی سر دیوں کی چٹھیاں دیکھیں تو ساری بہنیں اپنے بچوں سمیت آئیں۔ خالہ انہیں دیکھ کر خوش سے نہال ہو گئیں۔ وہ جو سارا دن انہیں برا بھلا کہہ کر شکوے کرتی تھیں۔ اب شکوے ایک طرف تھیں۔ دیے تھے اور انہیں مت سے لپٹا لیا۔ خالہ نے فوراً

ڈھیروں ڈھیر کھانے پینے کا سامان منگوایا۔ کھانا کھاتے ہوئے خوش گیلیاں بھی چل رہی تھیں۔ "اماں! بھائی نظر نہیں آ رہا۔" سب سے بڑی والی کو کھولے سے یاد آ گیا تو باقیوں کو بھی جیسے ہوش آیا۔ "ہاں اماں! جب سے ہم آئے ہیں بھائی کو نہیں دیکھا۔" باقی بھی بولیں۔

"ارے گیا ہوگا اپنے کسی سے کام سے آ جائے گا۔" خالہ لا پرواہی سے بولیں۔ "ویسے اماں! تو نے بھائی کی شادی کا کچھ سوچا۔" بڑی والی نے ایک نیا شوہر چھوڑا تو باقی فیس دیں۔

"پاگل ہو گئی ہے بھائی اس عمر میں سہرا سجاتے اچھا۔" گنگے کا بھلا۔ "بھائی والی نے فہمی دہائی اتنے میں دروازہ کھولا تو موضوع وہ ہیں وہ تو لڑ گیا۔ سب باہر کی جانب متوجہ ہو گئیں۔ دروازے کے کھلنے ہی آصف اندر داخل ہوا تھا اور محاسب کی ہوائیاں اڑ گئی تھیں ساتھ سرخ جوڑے میں ملیں گنبدیہ اور اس کے بیٹے کو دیکھ کر ان لوگوں کو ساری صورت حال سمجھنے میں صرف چند لمحوں گئے تھے۔

"اماں! میں نے گنبدیہ سے شادی کر لی ہے۔" ان کے خیال کو اس نے حقیقت کی مہر ثبت کر دی تھی۔ خالہ کے ہاتھ سے یکدم آئینل کا پانی بھر لگا اس چھوٹا تھا اور بیٹیوں نے حیرت سے ماں کو دیکھا تھا۔ جو اس وقت شکستہ دکھائی دے رہی تھیں۔ آصف ان دونوں کو لے کر اندر بڑھ گیا تھا اور وہ سب اسے ملال سے جاتا دیکھ کر رہ گئیں تھیں۔ وہ جو گنبدیہ کو جوانی میں قبول کرنے کو تیار نہ تھی اب تو بقول اس کے اس کی زندگی میں بیوہ کا جو دھبہ لگا تھا تو وہ کیسے قبول کر سکتیں۔ لیکن آج ان کے بیٹے نے ایک بیوہ کو بھی اپنایا تھا اور اس کے بیٹے کو بھی ان کا شکوہ وجود پر زور ہو گیا تھا سالوں بھر کی محنت پل بھر میں ضائع ہو گئی تھی۔



”چائلڈ لیبر از کرائم“ جانتے ہیں آپ یہ چھوٹے چھوٹے بچے کام کرنے کے لیے نہیں پڑھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ چنانچہ کب ختم ہوگی اس ملک سے جاہلیت۔“ سعدیہ ارسلان غصے سے بول رہی تھیں۔ وہ ایک سوشل ورکر تھیں اور این جی او چلائی تھیں۔ آج وہ اپنی بیٹی سیما کے ساتھ کھانا کھانے ایک چھوٹے مکان پر پہنچے ہوئے تھیں کہ کھانے کا جوڑا یہاں ہوتا تھا وہ بڑے بڑے فائبر اسٹار ہوٹل میں بھی نہیں ہوتا۔ یہاں دو چار چھوٹے بچوں کو کام کرتا دیکھ کر انہیں خوب غصہ آیا تھا۔ وہ واقعی اپنے ملک کے حالات بدلانا چاہتی تھیں۔ پروہ اس قوم کے لوگوں کو کیسے سمجھائیں۔ ”کیا کریں بیگم صاحبہ! پیٹ پالنے کے لیے ماں باپ کمانے کے لیے بھیج دیتے ہیں۔“ ہوٹل کے ایک ورکر نے کہا وہ بھی غریب سا تھا۔



”پھر عدول کی سختی ضروری ملتی ہے جنہیں؟“ سعدیہ ارسلان ان بچوں کی طرف مڑتے ہوئے گویا ہوئیں۔ ”20 روپے“ ایک بچے نے نہایت مصوہیت سے کہا۔

”ٹھیک ہے کل سے میرے اسکول آیا کرو تمہاری کتابوں، بیگ اور اسٹیشنری کے ساتھ 20 روپے بھی دے دیا کروں گی۔“ سعدیہ ارسلان شیرینی بھرے لہجے میں بولیں۔

”اور اب مجھے یہاں کوئی بچہ کام کرتا نظر نہ آئے۔“ سعدیہ ارسلان ریسٹورنٹ کے مالک کو سمجھ کر تے ہوئے جانے کے لیے نکل گئیں۔

☆ ☆

”اوتے سارے برتن تم دھوؤ گی تمہاری امی کیوں نہیں آئی؟“ سیما نے حیرانی سے اس معصوم بچی کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ کل ان کے گھر مہمان آئے تھے اور آج ڈھیر برتن تھے اور کام والی ماسی نے خود آنے کے بجائے چھوٹی سی بچی کو بھیج دیا تو سیما سر ہلایا حیرت بنی کھڑی تھی۔

”تم نے کہا کو کھانا؟“ سیما نے اس بچی سے پوچھا۔ ”جی ہوا ابھی آئی تھیں اور کہہ کر گئیں ہیں کہ برتن دھو لو۔“ اس بچی نے آہستہ آواز میں کہا۔

”واٹ؟“ ممانے جنہیں کام کرتے دیکھا اور کچھ نہیں کہا۔ ”سیما خوب حیران ہو رہی تھی، ابھی کچھ دن پہلے کی ہی تو بات تھی اس کی ماما چائلڈ لیبر پر لڑ کر آئی تھیں۔ اسے بہت زیادہ حیرانی ہو رہی تھی وہ جانتی تھی کہ ایسے سوشل ورکر زیادہ تر وہ نکلے ہوتے ہیں۔ پر اپنی ماں سے اس کی کوئی امید نہ تھی۔ پھر اس نے تاسف سے سر ہلایا اور اس بچی کی جانب متوجہ ہوئی۔

”چلو میں دھواؤں تمہارے ساتھ برتن۔“ سیما نے قمیض کے بازو اوپر کرتے ہوئے کہا اور برتنوں پر صابن لگانا شروع کر دیا۔

”سیما بیٹا! آپ کیوں دھو رہی ہیں برتن؟“ سعدیہ

ارسلان حیرانی سے گویا ہوئیں۔

”ماما چائلڈ لیبر از کرائم، بچے پڑھنے کے لیے ہوتے ہیں کمانے کے لیے نہیں۔ یہی سب کہا تھا آپ نے اس روز ریسٹورنٹ میں تو یہ بچی جو کام کر رہی ہے یہ جرم نہیں ہے کیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بچے ہوٹل میں برتن دھونے پر مجبور ہیں اور یہ بچی گھروں میں، جب آپ کے نزدیک ان بچوں کو پڑھنے کا حق ہے تو اس کو کیوں نہیں یہ کام کیوں کرے؟“ سیما نے دکھ سے سوال کیا۔

”اے اس کی ماں نے بھیجا ہے۔“ سعدیہ بیگم رعب سے بولیں۔

”تو ان بچوں کو بھی ان کے ماں باپ نے ہی بھیجا تھا۔ آپ نے اس روز کہا تھا کہ چنانچہ کب ختم ہوگی اس ملک سے جاہلیت تو ماما اس ملک سے جاہلیت تب ختم ہوگی جب ہم لوگ اپنے باپ کو سنوارنے کے ساتھ ساتھ اندر کو بھی سنواریں گے۔“ سیما خاموش ہو گئی پھر کچھ دیر بعد بولی۔

”ماما! چائلڈ لیبر از کرائم ہے جرم جرم ہی ہوتا ہے چاہے وہ اندر ہو یا باہر چھپ کر ہو یا سامنے اور کی کوئیں پتا تو کیا اللہ تو دیکھ رہا ہے۔“

”سچ کہہ رہی ہو بیٹا! تم سوری بیٹا تم کل سے اسکول آیا کرو۔ کام کرنے کے لیے نہیں ہو تم، تم کو تو بڑی ہو کر اس ملک کا نام روشن کرنا ہے۔“ سعدیہ ارسلان بچی کا گال چھوتے ہوئے بولیں پھر سیما کی جانب متوجہ ہوئیں۔

”شکریہ سیما! تم نے مجھ سے بڑے گناہ سے بچا لیا۔“ سیما حد تک بات سن کر مسکراتے ہوئے سعدیہ کی کھلی ہاتھوں میں مل گئی۔ سعدیہ ارسلان کے ذہن میں ایک ہی بات گردش کر رہی تھی تبدیلی کبھی تم سے نہیں آیا کرتی یہ بیش میں سے آیا کرتی ہے۔ انہوں نے اپنا آپ بدل لیا تھا دنیا وہ ملک کو بھی ضرور بدل سکیں گی۔

☆ ☆

قمر و شہک

پاس کھڑی ڈالے ہے آواز آنسوؤں سے رو رہی تھی۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ہوا کیا ہے اس لیے وہ ڈالے کے پاس آئی تھیں۔



”ڈالے بیٹا! کیا بات ہے تم دو کیوں رہی ہو اور یہ زمریل کیوں اس قدر غصہ کر رہے ہیں رضا کو کیا ہوا ہے وہ کیوں رو رہا ہے؟“ آسیہ نے ایک ساتھ ہی اتنے سوالات کرتے ہوئے نہ چپ ہونے والے رضا کو پہلے زمریل کی گود سے لیا اور خود میں بچھائی لیا تھا۔

”بھئی! اپنی بہو صاحبہ سے کہہ دیں اگر اس نے آج کے بعد رضا پر ہاتھ اٹھایا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔“ نہایت گڑبڑ میں کہتے ہوئے اس نے ڈالے کو پیٹی سے گھورنا تھا۔

اسی اثناء میں اس شور پکار کو سن کر وہاں حرا بھی اندر داخل ہوئی تھی۔ ڈالے کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ رو بھی رہی تھی۔ زمریل اسے نہایت غصے سے کھانچا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ آسیہ روتے ہوئے رضا کو چپ کمدار ہی تھیں۔ وہ سارا ماجرا سمجھ گئی تھی مگر اسے زمریل کا یہ رویہ ڈالے کے ساتھ بہت برا لگا تھا۔ وہ زمریل کو مارا خشی سے دیکھتی ہوئی ڈالے کے پاس آئی تھی۔



”زریسل بھائی! بہت غلط بات ہے آپ اس طرح ڈالے سے بات مت کیا کریں۔“ وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی۔
زریسل نے حرا کو دیکھا۔

”نی الحال تو میرا ایک کام کرو کہ اس کو میری نظروں کے سامنے سے لے جاؤ ورنہ میں غصے میں کچھ بھی کر جاؤں گا۔“ حرا کو بالکل اچھا نہیں لگا زریسل کا یوں کہنا۔ اس لیے اس نے صرف خاموشی سے زریسل کو دیکھا اور ڈالے کا ہاتھ پکڑا تھا۔
”چلو ڈالے یہاں سے۔“

حرا ڈالے کو لے کر بھاگتا تھا وہاں سے گھسٹتی ہوئی اپنے بیڈروم میں لے آئی تھی۔ حرا کے بیڈروم میں آکر وہ اس کے گلے سے لگی ہتھکیوں سے رو دی تھی۔ ایک وہی تو اس کی بیٹ فریڈ بھی جس سے وہ ہر بات دل کی ہر راز شہز کرتی تھی، اس کا یوں زار و تھار و نا حرا سے برداشت نہیں ہوا اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
”ڈالے! اب بس کرو بار، دیکھو تو تم نے تو مجھے بھی رلا دیا ہے۔“ حرا نے ڈالے کو خود سے الگ کیا اور اس کے آنسو صاف کیے اور ٹیکل پر رکھے جگ میں سے ایک گلاس پانی نکال کر اس کو پلایا۔

”کیا کروں میں حرا! اب زریسل کا رویہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ آج ایک ماہ ہونے کو ہو گیا ہے اور ان کا ناروا سلوک پہلے دن سے آج تک روڈی ہے۔ وہ اتنے سخت دل ہو جائیں گے مجھ سے وہ مجھ سے بات نہیں کرتے۔ ایک ہی کمرے میں رہ کر میری طرف دیکھنا تک گناہ سمجھتے ہیں۔ میرے ہاتھ سے پانی لینا اپنی تو جہن سمجھتے ہیں ایک بے جان سا شیشی کے علاوہ کوئی معنی نہیں رکھتی میں ان کے لیے ان کی نظر میں میری کوئی وقعت کوئی حیثیت نہیں ہے، جیسے ان کے بیڈروم میں میری کہیں جگہ ہی نہیں ہے، میرا وجود ہی نہیں ہے بیڈ پر بھی وہ اس طرح رضا کو لے کر سوتے ہیں، جیسے کہہ رہے ہوں کہ میں ان کا بیڈ تک شہز نہ کروں۔ حرا وہ ایسے تو نہیں تھے اتنے پتھر دل بے رحم، میں نے بھی تو اپنی انا خود داری سب ماردی ان کے خاطر، تو کیا وہ میری ذرا سی غلطی معاف نہیں کر سکتے۔“

حرا نے بنور ڈالے کو سنا تھا اچھا تھا کہ وہ دل کی ہڑ اس نکال رہی تھی اپنا دل ہٹا کر رہی تھی، حرا نے نہایت چاہ سے اس کا آنسوؤں میں ہسکا چہرہ اوپر اٹھایا تھا۔

”تو میری جان! زریسل بھائی کے غصے کو بھی تو تم نے ہی ہوا دی ہے، تم جانتی ہوتاں۔ وہ تم سے کس قدر محبت کرتے ہیں پھر بھی تم نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔“ ڈالے نے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھا تھا تو کیا وہ اس پر طنز کر رہی تھی حرا نے اس کی سوچ بچھ لی تھی۔

”ڈالے! تم یہ مت سمجھنا کہ میں تم پر کسی قسم کا کوئی طر کر رہی ہوں یا تمہیں طعنہ مار رہی ہوں۔“
”تو کیا کرتی میں حرا! ارشد بھائی کا جیسے مان تو ڈرتی تم جانتی ہونا کہ انہوں نے میرے لیے کیا کیا ہے مگر تم نہیں سمجھو گی اور نہ ہی زریسل سمجھیں گے اگر ان کے دل میں میری کوئی وقعت و حیثیت نہیں ہے، کوئی محبت نہیں ہے تو میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ میں بھی اب نہیں رہوں گی ان کے ساتھ۔“ اس نے خود ہی بے دردی سے اپنے بچے آنسو صاف کیے تھے۔

”تمہیں نہیں لگتا کہ تم ایک بار پھر غلطی کرنے جا رہی ہو۔“
”تو اور کیا کروں کوئی بھی تو مجھے نہیں سمجھ رہا، یہاں تک کہ تم بھی مجھے نہیں سمجھ رہی ہو۔“ اس نے ناراضی سے رخ ہی موڑ لیا تھا۔

”اچھا نا مجھ سے کیوں ناراض ہوتی ہو۔“ حرا نے ناراض ناراض ہی ڈالے کا ہاتھ تھام کر اس کا رخ اپنی طرف موڑا تھا مگر ڈالے کی ہنر آنکھوں سے نمی پھر بھی صاف نہیں ہوئی تھی۔ حرا کا دل دکھا تھا۔ اس نے شاید نادانستی میں اس کا دل دکھا دیا تھا۔

”اچھا چلو چھوڑو تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں زریسل بھائی سے کیا شکایت ہے۔ یہ کہ وہ تم سے بات نہیں کرتے تمہاری طرف نہیں دیکھتے یا یہ کہ وہ تمہارے ساتھ اپنا بیڈ شہز نہیں کرتے۔“ وہ شرارت سے ڈالے کو دیکھ رہی تھی۔ ڈالے نے خاموشی سے حرا کو دیکھا تھا۔ تو اپنی بے ساختگی میں کبھی گئی بات یاد آ گئی، اس نے حرا کے بازو پر زور سے چٹکی بھری تھی حرا صرف ہی کر کے رہ گئی تھی۔

”تو یادہ بدتمیزی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ڈالے بری طرح جھینپ کر رہ گئی تھی، بلکہ سوچ کر ہی اس کے زخماں پر گال سا ٹھہرے لگا تھا۔ حرا کا بے ساختہ قہقہہ کمرے کی فضاؤں میں گونجا تھا۔

”اب کچھ میں آیا کہ زریسل بھائی تم پر ایک دم سے فریفتہ کیوں ہو گئے تھے۔ تمہارے حصول کے لیے اتنے کراسس سے کیوں گزر گئے، اتنی لطفیں کیوں اٹھالیں۔“
”کیا مطلب۔“ ڈالے نے نا بھیجی کے عالم میں اسے دیکھا تھا۔

”ایک منٹ۔“ اس نے اپنے بیڈ سائڈ دروازے سے ایک شیشہ نکالا اور اس کے چرے کے آگے کر دیا تھا۔
”اب اس آئینے میں اپنا خوب صورت گلابوں سے بھرا چہرہ دیکھو تو خود ہی کچھ جاؤ گی۔“ ڈالے نے حرا کو ایک نظر دیکھنے کے بعد آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تھا جو نہایت سرخ ہو رہا تھا۔ ڈالے نے حرا کو پھر دیکھا جو مستقل مسکرا رہی تھی۔

”حرا! اپنی دفعہ ہو جاؤ یہاں سے میں جا رہی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگی تو حرا نے اس کی کلائی تھام کر واپس اس کی جگہ پر بیٹھا دیا۔

”شرافت سے بھیجی رہو اتنے دنوں بعد تو ہاتھ لگی ہو۔ درشتا ہمسوس ہو رہا تھا کہ زندگی پھر زریسل بھائی کے بیڈروم سے نہیں نکلتا۔“ حرا کی بات پر اس کا چہرہ پھر سے مسکین واداس ہو گیا تھا۔ حرا نے اس کا بدلتا رنگ شدت سے محسوس کیا تھا۔

”ڈالے!“ حرا نے آہستہ سے پکارا تھا۔
”ہوں۔“ ڈالے نے جواب دیا۔

”ڈالے! تمہیں بہت صبر اور برداشت سے کام لینا ہوگا۔ زریسل بھائی کے رویہ کا ان کے غصے کا ہمت سے ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہوگا۔ تمہیں ان کی ساری کڑوی سیلی باتوں کو سہنا ہوگا۔ بولو کرو گی نا، ڈالے میں تمہیں بہت جانتی ہوں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ زریسل بھائی بھی تمہیں بہت جانتے ہیں وہ تمہارے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جس وہ تم سے تھوڑا ناراض ہیں تھوڑا غصے میں ہیں مگر یہ سب وقتی ہے کچھ دنوں کے لیے ہے مگر مجھے یہ کامل یقین ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ سب پہلے جیسے ہو جائے گا بس تھوڑا انتظار کرنا ہوگا ہمیں۔“ حرا نے نہایت نرمی سے اسے سمجھایا تھا وہ کچھ ٹھیک ٹھیک لے ڈالے پھر سے پارنے لگی تھی مگر وہ اسے ہارنا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔

”ڈالے! مانو گی نا میری بات میں تمہیں ہارنا ہوا نہیں دیکھ سکتی ڈالے۔“ حرا کے بہت سمجھانے پر ڈالے کے اندر ہمت پیدا ہوئی تھی۔ وہ ہارے کی نہیں۔ جیت جانے کی زریسل کی ساری بے رخیوں کو سکرا کے سمجھ گئی۔
”ٹھیک ہے حرا! میں ہاروں گی نہیں، میں زریسل کا انتظار کروں گی ہمت سے کام لوں گی۔“ ڈالے کی

بات پر حرا ہونے سے مسکرا دی تھی اور آگے بڑھ کر اسے پیار کیا تھا۔

”اچھا اب ساری فیشن کو دور کرو اور مجھے سب سے اہم بات یہ بتاؤ کہ تمہیں رومنا سب سے زیادہ کس بات پر آ رہا ہے۔“ حرا نے ماحول کی کشاف کو دور کرنے کے لیے پھر سے ڈالے کو پھینچا تھا۔ ڈالے اس کی پھینچ خانی اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔

”حرا کی بچی۔“ ڈالے نے بھی نہ آؤ دیکھا نہ آؤ اور اپنے پیچھے سے کٹن اٹھا کر خوب اس کی تواضع کی تھی پورے کمرے میں دونوں کی ہنسی گونجنے لگی تھی۔

☆.....☆

آج راجہ کے کسی جاننے والوں کے پاس مگنی کی تقریب تھی۔ ان کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ اس لیے انہوں نے عارفین اور مقوم کو کوبہ دیا کہ وہ جائیں گے۔ ”مقوم بیٹا تیار ہو گئی ہو۔“ راجہ کمرے میں داخل ہوئی تھیں مقوم وارڈ روم کے پاس کھڑی کپڑے دیکھ رہی تھی، سمجھ رہی تھیں آ رہا تھا کہ کیا اپنے آج مگنی کی تقریب میں بہن کے جانے کے لیے۔

”ای! آپ کی بہو صاحبہ سے ابھی تک کپڑوں کا سلیکشن ہی نہیں ہو رہا تو سوچے کہ تیار ہونے میں کتنا نام لگائے گی۔“ ڈیرینک روم سے نکلتے عارفین نے کہا تھا۔ بلکہ جھوٹے دھانی فی شرٹ جس کی ہاف فینلنگ کی سلیبس فینلنگ کی فیتی فی شرٹ میں اس کی پاؤں بلڈر شخصیت حرا لگائیں۔ لگ رہی تھی۔ اس کے کسرتی بازوؤں میں ایسا لگتا جیسے وہ ان مضبوط بازوؤں میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ وہ اسے سر دو گرم ہواؤں سے بچنے کے رکھے گا۔ ہلکی سی بھی آج نہیں آنے دے گا اس پر اتنا یقین ہو گیا تھا اسے عارفین پر، عارفین اس بل بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ مکمل مردانہ وجاہت حسن کا شاہکار مقوم نے کن اکھیوں سے اس کا پورا جائزہ لے لیا تھا۔

”یار اتمہاری ہی پر اپنی ہوں، یوں چپ چپ کر کیوں دیکھ رہی ہو۔ استحقاق سے دیکھو تمہیں تو پر منت حاصل ہے۔“ ششے سے اس نے مقوم کی چوری پکڑ لی تھی جس پر مقوم جھینپ کر لگاہ جھکا گئی تھی۔ اوپر سے عارفین کی آنکھ مار کر شرارت کرنا اسے حرا پریش کر گیا تھا۔

راجہ نے اسے وارڈ روم سے ہٹا کر خود اس کے لیے ایک سوٹ سلیکٹ کر لیا تھا۔

”یہ لو مقوم! اسے پکڑو اور جاؤ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“

”یہ.....!“ مقوم کی آنکھیں حیرت سے وہ دنگر دیکھنے لگی تھیں جس میں اسٹری شدہ ساڑھی وینک ہوئی تھی۔ بلکہ گہری جارحیت کی ساڑھی جس کے پارڈر پر چوڑی سی حسین ترین فینسی لیس لگی ہوئی تھی اور یہی تھیں اس کے بلاؤز کی آستین پر خوب بہار دیکھا رہی تھی۔ جب کہ گلے پر نازکی کڑھائی ہوئی تھی۔

”ہاں یہ..... کیوں اچھی نہیں ہے؟“ راجہ نے مقوم کو سکرا کے دیکھا تھا۔

”نہیں امی! بہت خوب صورت ہے مگر امی میں نے بھی یہی ڈریس نہیں پہنا۔“ کس قدر مصوویت تھی اس کے اعزاز میں کہ سامنے بیٹھا عارفین ہونے سے ہنس دیا تھا۔

”کوئی بات نہیں جان! میں ساڑھی باندھنا سیکھا دوں گی تم ایک کام کرو پہلے میرے ساتھ ڈیرینک روم میں چلو میں تمہیں تیار کر دیتی ہوں۔“

”مگر امی! مجھ پر ساڑھی اچھی نہیں لگے گی۔“ وہ کسی طرح نہیں چاہ رہی تھی کہ وہ یہ ساڑھی باندھے اس

میں سر اپنا نمایاں ہوتا تھا۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ تم پر ساڑھی اچھی نہیں لگے گی تم تو اتنی پیاری اور خوب صورت ہو کہ تم جو بھی پہنو اچھا لگے گا۔ چلو اب خدمت کرو آؤ میں تمہیں تیار کرتی ہوں پھر تم خود آئینہ سے پوچھنا وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیسی لگ رہی ہو۔“ راجہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈیرینک روم میں لے گئی تھیں۔

کوئی چندرہ منٹ میں راجہ نے اسے ساڑھی باندھ دی تھی۔ ڈیرینک روم کا دروازہ بھی کھول دیا تھا۔ مقوم ایک قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ ساڑھی کی ساری پٹیلیں کھل گئی تھیں۔

”اوہ شٹ!“ اس نے تیزی سے ساڑھی منہ بلی گئی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ سامنے ہی بالکل عارفین بیٹھا تھا اور اس کا رخ نہیں تھا۔

”اوہ ہو.....“ راجہ نے بھی دیکھا تھا۔

”امی پلیز! مجھے رہنے دے میں نامیں کوئی سوٹ پہن لیتی ہوں۔“ عارفین کی موجودگی میں وہ گھبراہٹ اور شرم و حیا کے مارے سرخ ہوئی جا رہی تھی۔ کھلی دفعہ یہ ساڑھی باندھی جو کسی عذاب سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس عذاب سے جان چھڑانا چاہ رہی تھی۔

”نہیں تم کو ہم شاید سیکڑی پن لگانا بھول گئے ہیں۔“ انہوں نے مقوم کی ساڑھی کا پلو پکڑ کے زمین پر گرا دیا اور ساڑھی کی ساری پٹیلیں پھر سے پکڑ کے سیٹ کرنے لگی تھیں۔ اس کی حالت سے بے خبر وہ ساڑھی سیٹ کرنے میں مگن تھیں۔ اس کا دل بری طرح دھڑکے جا رہا تھا۔ جیسے مضبوط پٹیلیوں کی دیوار توڑ کے ابھی باہر آ جائے گا۔ کیوں کہ ان دو لگا ہوں میں شوخیاں ہی شوخیاں ہی ابھرنے لگی تھیں۔ بہت مشکل سے وہ دو سیاہ لگا ہیں اوپر اٹھی تھیں۔

”میں آؤں۔“ عارفین نے اپنے سینے پر ہاتھ کے اشارے سے وہاں مقوم کے پاس آنے کی اجازت مانگی تھی۔

”نہیں۔“ مقوم نے بے ساختہ ہی گھبراہٹ کے لہجے میں ادھر ادھر گردن ہلائی تھی۔ گھنیری سیاہ پٹیلیں بجدہ ریز ہو گئی تھیں اس کی پٹلیوں اور ہوشوں کے لرزے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ عارفین کی موجودگی سے بے اعتنا گھبرا رہی ہے۔

”یہ لو اب تمہیں کھلے گی ساڑھی؟“ راجہ نے اس کی ساڑھی کی پٹیلیوں پر سٹپتی پن لگائی اور ساڑھی کے پلو پر خوب صورت سا برج لگا کر سیٹ کر دیا تھا۔

لائٹ سائیک اپ اور ہم بیچنگ جیولری میں اس کا حسن دو آئندہ ہو گیا تھا۔

”تمہارے بال ہیں تو بہت خوب صورت مگر یہ کر لی کی وجہ سے سمجھ نہیں آ رہا کیا میٹر اسٹائل بنایا جائے۔“ راجہ نے پوسٹ نظروں سے اس کے کمر تک لہراتے بال ہاتھ میں لیے۔

”ایک کام کرتے ہیں ان بالوں کو تھوڑا سا اسٹریٹ کر دیتے ہیں۔“ راجہ نے میٹر مشین اٹھائی تاکہ اس کے کر لی بالوں کو اسٹریٹ کر دیں۔

”ارے امی نہیں مجھے اس پر اسٹریٹ بال بال بال اچھے نہیں لگیں گے آپ اس کو ایسے ہی سیٹ کر دیں۔“ عارفین تیزی سے بولا تھا۔ مبادا وہ میٹر مشین اس کے بالوں پر لگا ہی نہ دیں۔ راجہ نے عارفین کو سکرا کے دیکھا اور اسٹریٹ واپس بحال پر رکھ دیا تھا۔

تاکر و درخت کی چھاؤں میں محفوظ ہو گئی ہو کر کئی دھوپ سے ٹھنڈی چھاؤں میں آگئی ہو۔
 ”کیا بات ہو گئی تم اس قدر راتی پریشان کیوں ہو گئی ہو؟“ عارفین کو اس کے چہرے کی رحمت نے بہت پریشان کر دیا تھا۔
 ”پلیز عارفین! مجھ سے کوئی سوال مت کرو۔ بس تم یہاں سے مجھے لے چلو۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو خود بخود جاری ہو گئے تھے۔

”اوکے۔ اوکے۔“ پلوں میں ذرا آگئی کو بتا دوں وہ یہاں آ رہی ہوں گی۔“ عارفین نے مقصوم کا ٹھنڈا ہر ہاتھ تمام لیا تھا۔
 ”نہیں۔ آپ جلدی نہیں۔“ وہ تو باقاعدہ اسے کھینچنے لگی تھی۔ وہ خرید دیر نہیں کرنا چاہتی تھی اگر ذرا سی دیر اور ہو گئی تو ابھی اور اسی وقت سب ختم ہو جائے گا۔
 عارفین نے اس کی سپید پٹلی رکھتے ہوئے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔
 ”آل راءت تم گھبراؤ نہیں ہم چل رہے ہیں۔“ اس نے مقصوم کا ہاتھ تمام لیا اور باہر آ گیا تھا توڑی سی ہی دیر میں پائیک فرائے بھرنے لگی تھی۔
 ”گفٹ فینسل کرو یہ ہمارے ساتھ ہی اگلیٹڈ جائے گی۔“ ان دونوں نے جاتی ہوئی پائیک کو دور تک بغور دیکھا تھا۔

☆.....☆

عارفین اور مقصوم کے جانے کے بعد راجہ، نجمہ کے پورشن میں ہی آگئی تھیں۔ ان کے ساتھ کھانا کھایا اور اب تینوں باہر لاؤنج میں بیٹھے گرم گرم چائے پی رہے تھے۔
 ”شرن کی کوئی خبر نجمہ بھائی؟“

”ہاں وہ اپنی خالہ کے پاس ہے۔“ نجمہ کے انداز میں ایک اداسی جھلک رہی تھی۔ جسے راجہ نے بہت شدت سے نوٹ کیا تھا۔

”تو آپ جا کر اسے واپس لے آئیں۔“

”کس منہ سے جاؤں ارشد نے اس قابل چھوڑا ہی کب ہے۔“

”آپ نے ارشد کو سمجھایا اب تو بہت بہتر لگ رہے ہیں وہ۔“

”نہیں میں ارشد سے سخت ناراض ہوں انہیں احساس ہونا چاہیے کہ انہوں نے شرن کے ساتھ بہت غلط کیا ہے۔ بہت نا انسانی اور زیادتی کی ہے۔“

”نجمہ بھائی اگر آپ کہیں تو میں شرن کو مٹا لوں انہیں گھر لے آؤں۔“

”راجہ یہ کام تو میں بھی کر سکتی ہوں۔ کوئی مشکل نہیں ہے شرن کو مٹا دو مان جائے گی اور گھر بھی آجائے گی مگر ارشد نے شرن کی اتنا پر خودداری پر جو ضرب لگائی ہے اس کا مداوا کیسے کروں۔ وہ بے چاری بن ماں باپ کی بیٹی جس پر ارشد نے ظلم کر کے بہت برا کیا ہے۔“

”اللہ نہ کرے بھائی اور پھر ہماری شرن میں یہی خوبی تو سب سے اچھی اور بڑی ہے کہ وہ بہت رحم دل نرم مزاج اور درگزر کرنے والی لڑکی ہے۔ وہ کسی کو بدو عافیتیں دے سکتی کسی کا برا نہیں چاہ سکتی ہے۔“

”ہاں راجہ! میں جانتی ہوں اسے سال ہو گئے ہیں۔ ارشد اور شرن کی شادی کو مگر آج تک مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ بلکہ ڈالے گا جس طرح خیال رکھا رہا جو جس طرح پیار دیا۔ دن رات اس کی دیکھ بھال کی اس وجہ سے تو اور مزید اس کے لیے میرے دل میں جگہ ہی نہیں محبت بڑھی ہے۔“ کس قدر غلوں اور چاہت جھلک رہی تھی ان کے لہجے میں ان کے لب و لہجے میں شرن کے لیے یہاں تک کہ آنکھوں میں نمی بھی اتر آئی تھی۔

”انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا، اللہ سب بہتر کر دے گا۔“ راجہ نے غلوں دل سے دعا دی تھی۔

”انشاء اللہ۔“ نجمہ نے دل سے انہیں کہا تھا۔

”آج کل کہاں ہیں ارشد کافی دن ہو گئے ان کو دیکھے ہوئے۔“

”ارشد کے کسی دوست کا بہت پری طرح ایک میٹڈ ہو گیا ہے کہ چہرے کی شناخت کرنا تک مشکل ہو گئی ہے۔ پاکستان میں تو اس کا علاج ناممکن بتا دیا ہے۔ اس لیے وہ لندن لے کر گئے ہیں اپنے دوست کو۔“

”اچھا کب ہوایہ سب؟“

”ایک مہینہ کا عرصہ تو بیت ہی گیا ہے۔“

”کوئی فون آیا ہے اب تک؟“

”فون تو آیا ہے میں نے بات نہیں کی اپنے پاپا سے ہی ساری بات کی تھی۔“ نجمہ نے چائے کا خالی کپ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

”اور وہ اپنی کب تک ہے؟“

”پہنچیں۔“ راجہ نے ایک سرد سانس کھینچی تھی اور کب سے خاموش بیٹھے سلیم احمد کو دیکھا تھا جو سب سن تو رہے تھے مگر کچھ بول نہیں رہے تھے

”سلیم بھائی! آپ کیوں اتنے چپ ہیں کچھ بول ہی نہیں رہے ہیں؟“ سلیم احمد نے ایک خاموش نظر راجہ پر پھر نجمہ پر ڈال کر جھکا لی تھی۔

”کیا یوں میرے نصیب میں تو شاید اولاد کا سکھ دیکنا ہی نہیں ہے۔ اس سے بڑی بد نصیبی ایک باپ کے لیے کیا ہوگی کہ اس کی دونوں اولادیں پر باد ہیں۔“ کس قدر دکھ و کرب تھا ان کے لب و لہجے میں جھلکے ہوئے کلموں سے ایک بار بار ہوا باپ اپنی بد قسمتی کو کوس رہا تھا۔

”اللہ نہ کرے سلیم بھائی! اس طرح کیوں سوچتے ہیں آپ بے شک غم دینے والی ذات اور ہر والے کی ہے تو خوش بھی رہنا اس کے اختیار میں ہے۔“ راجہ نے دہل کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا تھا ان کا دل خون خون ہوا تھا سلیم احمد کی باتوں پر۔

”اور پھر ہماری ڈالے زربل کے پاس چلی گئی ہے۔ ان کے درمیان صلہ ہو گئی ہے۔“

”صلہ!؟“ وہ استہزاء سے ہنسی دے رہے تھے۔

”کاش یہ صلہ ہی نہیں ہوئی ہوتی۔“ انہیں کچھ دن پہلے کی بے عزتی بھول ہی نہیں پاری تھی جو زربل نے ڈالے کی کی تھی وہ اتفاق سے اس وقت بچے نہیں احمد سے کسی فائل کو ڈسکس کرنے گئے تھے۔ وہاں جو کچھ ہوا سب کچھ انہوں نے دیکھ اور سن لیا تھا جو انہوں نے اومہ اگر نجمہ کو نہیں بتایا تھا۔ جب وہاں سب دیکھ اور سن کر ان کا اپنا دل اس قدر چھنے لگا تھا تو نجمہ کی کیا حالت ہوتی۔ ڈالے ان کی اکلوتی لاڈلی بیٹی تھی۔

نجمہ اور رابعہ نے نہایت حیرت بھری نظروں سے سلیم احمد کو دیکھا تھا۔ دونوں کی کچھ میں نہیں آیا کہ سلیم احمد نے یہ بات کیوں کہی۔

”سلیم! کوئی بات ہوئی ہے کچھ ہوا ہے کیا آپ اس طرح کیوں بول رہے ہیں۔“ وہ تو کبھی تیس کر صرف وہی سب حالات کا احساس کر رہی ہیں مگر سلیم احمد بھی ان حالات کا شدت سے احساس کرتے ہیں انہیں محسوس کرتے ہیں۔ سلیم احمد نے نہایت چونک کر دونوں کو دیکھا تھا جن کی نظروں میں سوال تھے۔

”ارے نہیں بھئی میں نے تو یوں ہی بول دیا۔“
 ”نہیں سلیم! لہذا کوئی بات تو ہے ورنہ اتنی بڑی بات آپ اپنی اکلوتی نحت بکھر کے لیے بھی کیونکر بول سکتے ہیں۔“ نجمہ ماننے کو راضی نہیں تھیں اور پھر ان کے چہرے پر جو ایک دکھ کا سایہ سالہا تھا وہ بغور نجمہ نے ماحسوس کر دیکھا تھا بلکہ انہیں چونک جانے پر بھی مجبور کر دیا تھا۔

”نجمہ! میرا ذہن کہیں اور تھا میرے منہ سے نکل گیا ہے۔“ سلیم احمد بات سنبھالنے لگے تھے۔ جسے وہ باخوبی سمجھتی تھیں۔

”دیکھئے سلیم!“ نجمہ کچھ کہتیں کہ اسی دوران سلیم احمد کا فون بول اٹھا تھا۔ سلیم احمد موقع تفتیش جان کر نجمہ اور رابعہ کو ایک سیوڈی کہہ کر اٹھ گئے تھے۔ نجمہ نے بخور ان کی پشت دیکھی تھی۔

”رابعہ! سلیم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔“ نجمہ نے ٹٹلی لے کر رابعہ سے کہا تھا۔
 ”نہیں نجمہ! مجھ بھی! آپ کا وہم ہے ہو سکتا ہے وہ بالکل سچ بول رہے ہیں اب دیکھیے نارشد اور زمر سیل کے نہ ہونے سے پورا پورا یس ان کے کندھوں پر آگیا ہے۔“ رابعہ اور نجمہ بھی کہیں کہ ان کا موبائل بجنے لگا تھا۔ اسٹریمر پر ریحان سچ کا لنگ بگڑا رہا تھا۔ رابعہ نے اوکے کا بٹن پر پریس کیا تھا اور موبائل کان سے لگا لیا۔

”السلام علیکم ریحان بھائی!“
 ”علیکم السلام کیسی ہیں آپ رابعہ بھن؟“

”جی اللہ کا شکر ہے، آپ سنائیے آپ کیسے ہیں اور وانی بھئی کیسی ہیں؟“
 ”جی وانی بھی بالکل ٹھیک ہیں۔ اللہ کا بہت کرم ہے کہ ان کا آپریشن بھی کامیاب ہو گیا ہے۔ اب وہ ماشاء اللہ سے اپنے پیروں پر چل سکتی ہیں۔ انہیں بیساکھی کی اب بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ ریحان سچ بہت خوش تھے کہ ان کے لب و لہجے سے چھلکتی خوشی وہ فون پر بھی محسوس کر سکتی تھیں۔

”یہ تو بہت اچھی خوش خبری ہے آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔“ رابعہ بھی بہت خوش ہوئی تھیں۔
 ”آگے کیا سوچا آپ نے پاکستان کب تک آرہے ہیں۔“

”میں تو مستقل نہیں۔ مثل ہونا چاہتا ہوں یہیں پر کوئی پاکستانی اچھی فیملی دیکھ کر وانی کی شادی کر دیتا مگر وانی کی ایک ہی خدشہ ہے کہ وہ یہاں نہیں رہے گی بلکہ ہمیشہ کے لیے کراچی رہنے کے لیے ہند ہے۔“

”یہ تو اور اچھی بات ہے اور ایک طرح سے اچھا بھی ہے آپ کہاں وانی بھئی کو اتنی دور پردیس میں رہنے کا کہہ رہے ہیں۔ یہیں پاکستان آجائے کراچی میں اپنوں کے سچ ہماری نظروں کے سامنے ہمارے ساتھ رہے۔“

”درست کہہ رہی ہیں آپ بھی، انشاء اللہ میں اسی مقصد سے کراچی آرہا ہوں وانی کو لے کر۔“

”ٹھیک ہے آپ یہیں اسی گھر میں آئیے گا یہیں ہمارے ساتھ رہیے گا۔“

”نہیں رابعہ بھن! یہ تو نہ مجھے اچھا لگے گا نہ ہی وانی راضی ہوں گی۔ میں نے وہاں اپنے جاننے والوں میں

سے کہہ رکھا ہے کہ کراچی کے بہترین علاقے میں کوئی گھر دیکھ کر رکھیں میں وہیں جاؤں گا۔“
 ”میلے جو آپ کی خوشی مگر ہمیں بھی غیر متوجھے گا جس دن آنا ہو عارفین کو فون کر دیجیے گا وہ آپ کو اور وانیہ کو ایئر پورٹ لینے آجائیں گے۔“

”چلیں ٹھیک ہے اب اجازت دیں۔ دو تین اور کام منٹالوں پھر نکٹ بھی کنفرم کروانے جانا ہے۔“
 ”اوکے اللہ حافظ، وانیہ بھئی کو میرا بہت پیار دیجیے گا۔“

”جی بہتر۔“ ریحان سچ نے فون آف کر دیا تھا۔ رابعہ نے بھی مسکرا کے فون آف کر دیا تھا۔
 ”لگ رہا ہے کوئی بہت اچھی خبر ہے جو چہرے پر خوشی ہے۔“ نجمہ مسکرا کے ان کے چہرے پر خوشی دیکھنے لگی تھیں۔

”جی نجمہ بھائی! میری ہند کی بیٹی ہے نا۔ وہ ماشاء اللہ سے بالکل صحت یاب ہو گئی ہیں اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی ہیں۔ اس بیٹی کو کچھ کہ بہت ترس آتا تھا اتنی پیاری محسوس سی بیٹی بیساکھی کے سہارے چلتی تھی۔“
 ”ہے تو بہن ماں کی بیٹی ہے مگر اب ماشاء اللہ سے ان کا آپریشن کامیاب ہو گیا ہے۔ وہ اور ریحان سچ بھائی بیٹیں گراچی ایک ہفتے بعد آرہے ہیں۔“ رابعہ حقیقی معنوں میں وانیہ کے لیے بہت خوش ہوئی تھیں۔

”یہ تو واقعی بہت اچھی خوش خبری ہے۔ ڈالے نے بھی وانیہ بیٹی کی بہت تعریفیں کی تھیں۔ بہت خیال رکھا ہے انہوں نے ہمارے بچوں کا اچھا ہے ہمیں بھی ان کی میزبانی کا موقع ملا ہے۔ بہت اچھے اچھے کپڑے پہنائے تھے انہوں نے ہم بھی انہیں خالی ہاتھ نہیں لوٹائیں گے۔“ نجمہ کو وہ ان دیکھی لڑکی یاد آگئی جس کی ڈالے نے بہت تعریفیں کی تھیں۔

”جی نجمہ بھائی! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“

☆.....☆
 ”اب بولو کیا بات ہے کیوں تم اس قدر اچانک گھبرا گئی ہو؟“ عارفین مقوم کو گھر لے جانے کے بجائے ہوٹل لے گیا تھا تا کہ وہ کچھ ٹیکس ہو سکے ہائیک پر بھی اس کا کچھ پکا خوف زدہ ہونا وہ محسوس کر گیا تھا۔

”عارفین! آپ۔۔۔ آپ یہاں کیوں آگئے، پلیز عارفین گھر چلیے نا مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ بے انتہا گھبرا رہی تھی۔ کسی خوف زدہ ہرنی کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ جیسے کوئی شکاری کہیں سے آکر اسے اپنے جال میں جکڑ لے گا۔ ان سیاہ آنکھوں میں ٹھانہیں مارنا ایک سمندر تھا وہ کسی طرح بھی چیز پر بیٹھ ہی نہیں رہی تھی۔

”مقوم! ادھی تو پوچھ رہا ہوں کس سے خوف زدہ ہو کیوں اتنا ڈر رہی ہو مجھے بتاؤ۔ تمہاری یوں اچانک بڑی کیفیت سے میں بہت پریشان ہو گیا ہوں۔“

”آپ پلیز گھر چلیے نا میں آپ کو گھر چل کر سب بتا دوں گی مگر اس وقت مجھے گھر لے کر چلیں۔“ اس کی ایک ہی رٹ تھی۔ خوف سے اس کی رکت حریر زرد پڑتی جا رہی تھی کچھ دیر پہلے جس چہرے پر چاند شرمائے جا رہا تھا وہاں اب کسی خوف کے سائے لگا رہے تھے۔

”اوکے ٹیکس یار پہلے ہم تھوڑا کچھ کھا تو لیں ہال میں بھی کچھ نہیں کھایا۔“
 ”مجھے کچھ نہیں کھانا۔ آپ سنئے کیوں نہیں ہیں مجھے گھر جانا ہے۔“

”آل رات چلتے ہیں۔“ مقوم کی کنڈیشن حریر غراب ہونے کے ڈر سے وہ وہاں رکائیں تھا۔

رواؤ انجسٹ 181 مئی 2015ء

کوئی آدمی گھٹنے کے سفر سے عارفین اور مقوم مگر بھی آگئے تھے۔ رابہ سوچتی تھیں عارفین نے ان کے کمرے میں جھانکا تھا۔

”اچھا ہوا سو گئیں ورنہ مقوم کی حالت دیکھ کر پریشان ہو جاتیں۔“ وہ آہستگی سے خود سے بولتا ہوا رابہ کے کمرے کا دروازہ بند کر کے اپنے بیڈروم میں آیا تھا۔ ادھر ادھر حلقہ نظریں دوڑائیں وہ کہیں نہیں تھی۔

”شاید ڈریسنگ روم میں ہو۔“ یہی سوچ کر وہ وہاں گیا تھا۔ جتنا وہ رو بھی رہی ہوگی۔ بغیر ناک کیے اس نے ڈریسنگ روم کا دروازہ کھول دیا تھا۔ سامنے کے منظر نے جیسے اسے مہبوت سا کر رکھ دیا تھا۔ آہٹ پر مقوم نے پلٹ کر دیکھا تھا بہت عام انداز تھا اس کا دیکھنے کا مگر اس کے برعکس عارفین بالکل سادہ ہو گیا تھا۔

مقوم ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی تھی۔ بالوں میں سے کلب نکال کر رکھ دیا تھا پورے سیاہ کرلی بالوں نے اس کا چہرہ چرے کے گرد ہالہ سا کیا ہوا تھا۔ سادگی کا یہ بھی زمین پر گرا ہوا تھا۔ وہ مکمل حسن کا شاہکار تھی قدرت نے نہایت فرست سے یہ مجسمہ بنایا ہوگا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن سے کامل پھیل کر اس کے ہوش پر حسن کو مزید دوا آتے کر رہا تھا۔ پہلے کہاں اس نے مقوم کو اس طرح دیکھا تھا اس کا سات بیروں میں ڈھکا چھپا حسن آج بے پردہ تھا۔ عارفین کے دل میں شدت سے اس کے حصول کی خواہش جاگنی تھی۔ وہ اس کا شوق اس کا جنون اس کی محبت اس کی دیوانگی ہی تو بن گئی تھی اور اس میں تو جیسے لحات ٹھہر گئے تھے۔

وقت رک سا گیا تھا۔ ہر شے اپنی جگہ سادہ وہ چاندورہ گئی تھی۔ وہ خوشبو جیسی لڑکی اس کے آس پاس ٹھہر رہی تھی۔ عارفین نے بھرپور نظروں سے بنور اس کا سراپا دیکھا تھا۔ وہ خود کو بہت روکنے کے باوجود بھی روک نہیں پایا تھا۔

عارفین آہستہ آہستہ چلتا ہوا بالکل اس کے قریب اس کے نزدیک آکا تھا اور اپنی دونوں مضبوط چوڑی ہتھیلیاں اس کے نازک شانے پر دھر دیں اور بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھا تھا ان سیاہ عین کنوروں میں جھانکا تھا۔

”مگر یہ کیا۔۔۔۔۔“ وہ خود تو یہاں سراپا موجود تھا اس کا جسم یہاں تھا مگر اس کی روح اس کا دل و دماغ ایسا لگ رہا تھا جیسے کہیں اور جو سفر تھا۔ مقوم یہاں کمرے میں اس کے سامنے اس کے پاس نہیں بھی اس کے سوچوں کے تمام دھماکے کہیں اور ہی پرواز کر رہے تھے۔ وہ کسی اور دنیا کی ہاسی لگ رہی تھی کوئی اور ہی مقوم لگ رہی تھی۔ جیسے سوسلا دھار بارش میں کوئی دھندلا دھندلا سا منظر۔

ورنہ عارفین کے بے قرار لبس پر اس کے چہرے پر وہ شرمناک اور حیا کے رنگ کیوں نہیں تھے وہ اس کی قربت سے جو ہم کر سکت جاتی تھی خود میں اسے اس وقت یہ ہوش نہیں کہ وہ اس وقت عارفین کے قریب کس کنڈیشن میں کھڑی ہے۔

”مقوم۔۔۔۔۔!“ عارفین نے اس کا خوف زدہ سا چہرہ اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں بھر لیا تھا۔ مقوم نے عارفین کو دیکھا تھا۔

”عارفین۔۔۔۔۔!“ مقوم کے کپکپاتے ہونٹوں سے مشکل اس کا نام نکلا تھا۔

”ہاں مقوم بولو۔“ عارفین نے ہولے سے مگر بے تابی سے کہا تھا۔ اتنا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ کچھ تو ہے جس نے مقوم کو پریشان کر دیا ہے۔ کوئی تو وجہ ہے جس نے مقوم کی مغربی زندگی میں آکر اچانک بھونچال سا

کر دیا تھا۔ اس کے اندر کتنے جھگڑا چل رہے ہیں وہ کتنے طوفان و آندھمی کی زد میں تھی یہ صرف وہ ہی جانتی تھی جس کا پتہ عارفین کو لگتا تھا اس کو اس پریشانی سے نکالنا تھا۔ ان آندھی طوفان کے جھگڑے محفوظ کر کے اپنے اندر چھپا کر رکھ لے گا وہ۔

”مقوم میری جان! بولو نا کیا بات ہے۔ مجھ سے اپنے دل کی بات شیئر کرو۔“

”عارفین! آپ میرے ساتھ ہیں نا؟“

”ہاں مقوم! اپنی آخری سانس تک۔“

”آپ مجھے چھوڑیں گے تو نہیں نا؟“ عجیب بیگنے بیگنے سوالات کر رہی تھی وہ۔

”کبھی بھی نہیں۔“

”دیکھ کر رہے ہیں نا آپ؟“ وہ نہایت آس سے پوچھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اس کی آنکھیں بہت جلدی ہوئی گئی تھیں۔

”نکا وعدہ۔ اور اب تم ایک کام کرو تم بہت تھک گئی ہو چنچ کر اور سکون سے سو جاؤ مگر اس سے پہلے میں تمہارے لیے ایک گلاس دودھ لے کر آتا ہوں وہ چٹا پھر سونا۔“ عارفین نے ہولے سے اس کا رخسار چھپتیا تھا اور پھر وہاں ٹھہر نہیں تھا۔ ڈریسنگ روم سے باہر نکلا چلا گیا تھا۔

مقوم نے اس کی چوڑی پشت کو یقین بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

☆۔۔۔☆

لاروش اخولان نے سلوک آفریدی کی فرمائش پر لازانیہ بنایا تھا۔ سلوک آفریدی کو بھی اس کے ہاتھ کی ڈشیز بہت پسند آتی تھیں اسی لیے اس نے لاروش اخولان سے لازانیہ کی فرمائش کی تھی جو کہ اس نے نہایت پت تیار کر دی تھی اور اس وقت دونوں بھائی اس کے بنائے لازانیہ سے بھرپور انصاف کر رہے تھے۔

”اگر اس کے ساتھ میکر وئی رائس و دملائی یونی بھی ہو جائے تو مزہ آجائے۔“ حسین آفریدی نے لازانیہ کا پائٹ کھاتے ہوئے لاروش اخولان کو دیکھا تھا جیسے کہ رہا ہو جاؤ اور میرے حکم کی تعمیل کرو۔

”موتو پتہ نہیں کتنا کھاتا ہے۔“ لاروش اخولان نہایت آہستگی میں منہ میں بڑبڑاتی تھی اور اس کی یہ بڑبڑاہٹ وہیں بیٹھے سلوک آفریدی کی تیز سماعت سے محفوظ نہیں رہ سکی تھی۔ سلوک آفریدی اس کی بڑبڑاہٹ پر ہولے سے مسکرا دیا تھا۔ لاروش اخولان کی نظر سلوک آفریدی پر پڑی تو خفیف سی ہو کر رہ گئی تھی اور شرمندہ ہو کر وہاں سے بچنے کی جانب لگی تھی۔

وہ اندر ہی اندر جلتی کڑتی بھی رہتی کہ حسین آفریدی اس سے کھانے کے علاوہ اور کوئی بات ہی نہیں کرتا۔ وہ تو شاید اس رشتے کے بارے میں بھی بھول گیا تھا جو اس سے اس کا بے پھر جرب سمیعہ زیدی نے سے فون پر گفتگوں بات کرتا تو حریف اس کی جان جل کر رہ جاتی تھی۔ دل شدت سے چاہتا کہ کوئی بھاری سا پتھر اٹھا کر سمیعہ زیدی کے سر پر دے مگر سمیعہ زیدی کا فون زور سے دیوار پر دے مارے کہ دو ٹکڑے ہو جائیں۔

”اہم۔۔۔۔۔“ وہ اپنی ہی کڑوی سلی سوچوں میں گم تھی کہ احساس ہی نہیں ہوا کہ بچنے کے دروازے پر سلوک آفریدی آکھڑا ہوا تھا۔

لاروش اخولان بری طرح چونک کر مڑی تھی۔

”آپ۔۔۔۔۔!“ وہ سلوک آفریدی کو دیکھ کر کھیرا ہی جاتی تھی۔

”یہ جہاں کیوں آئے ہیں۔“ وہ صرف سوچ کر ہی رہ گئی تھی۔ پہلی ملاقات سے ہی وہ سلوکی آفریدی سے کلک لگتی تھی یہ اس کی سوچ تھی یا وہم کہ سلوکی آفریدی میں اس کو بہرک شاہ کی جھلک نظر آتی تھی۔ کہیں ایک اور بہرک شاہ تو۔“

”جینیں۔۔۔ جینیں۔۔۔“ یہی سوچ کر اس کی ریڑھ کی ہڈی سنسنی اٹھتی تھی۔

”پریشان ہو؟“ سلوکی آفریدی کا ڈیڑھ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ لاروش افولان نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

”جی نہیں تو۔“ اس نے نگاہ جھکا لی تھی۔

”لگ تو نہیں رہا۔ دیکھو لاروش! اگر کوئی پریشان ہے یا کوئی ٹینشن تو مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔ آئی ایم شیئر کر میں ایک بہت اچھا دوست ہوں گا۔“ سلوکی آفریدی نے مسکراتی آنکھوں سے لاروش افولان کو دیکھا تھا۔ لاروش افولان نے خاموشی مگر سوال نظروں سے سلوکی آفریدی کو دیکھا تھا۔

”یہ ٹرسٹ می؟“ یہ سوال تھا یا یقین مگر وہ کوئی جواب نہیں دے سکی تھی۔

☆ ☆

لاروش روم کی صفائی کر رہی تھی کہ جی جین آفریدی نے اسے بلا لیا تھا۔

وہ شاید اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا جی اس اعزاز میں بات کر رہا تھا لاروش افولان کی نظر اس کے ہاتھ میں پکڑے کاغذ کے گلاس پر پڑی تو اس سے من آنے لگی۔ او آج تو جیسے انکشافات کا دن تھا۔ وہ ڈرنک کرتا تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ جین آفریدی اپنی کہہ کر چاچا تھا۔ مگر اسے حکم صادر بھی کر گیا تھا۔ جیسے لاروش افولان کو تھیل کرنا بھی۔ وہ باہر کیسے جائے اس کے دوست بھی تھے۔ جینوں نے اس کی ہی طرح ڈرنک کی ہوئی تھی۔ تیرے بے انتہام انگلیش سوئگ پر وہ لوگ ڈانس بھی کر رہے تھے اس نے ایک تارکار نظر ان سب پر ڈالی اور باہر نکل آئی اس کا رخ بچن کی جانب تھا۔

لاروش افولان نے جلدی جلدی سب کے لیے کافی بتائی اور ڈرے ہاتھ میں لیے باہر آئی تھی۔

”جینیں۔۔۔!“ اس نے پکارا تھا۔

مگر تیر میوزک میں اس کی آواز دب کر رہی تھی۔ وہ اگر چیخ چیخ کر بھی جین آفریدی کو پکارتی تب بھی وہ سننے والا نہیں تھا۔ لاروش افولان نے سوچا بے کار ہے خود ہی آگے بڑھ کر رکھ دے۔ دل تو نہیں چاہ رہا تھا نزدیک جانے کو مگر مجبوری تھی ان لوگوں کو دیکھ کر ہی اس کا دل خراب ہو رہا تھا۔

”اے اللہ! کاش بی جان بابا ماما آجائیں۔“ اس نے بہت شدت سے یہ دعا مانگی تھی۔ وہ کافی کیڑے لے کر آگے بڑھی تھی اور جی بھی آتیں وغیرہ یاد تھیں سب پر جتنی ہوئی وہاں تک آئی تھی۔ مگر کیا جانے جب بری گھڑی برے وقت کو آتا ہوتا ہے تو وہ آکر ہی رہتا ہے۔

لاروش افولان ڈرے لے کر جیسے ہی ٹھیل کی جانب بڑھی تھی۔ جین آفریدی کے ایک دوست نے بڑی بے دردی سے اس کی چادر کا کونا پکڑ کر کھینچا تھا کہ تا صرف اس کے ہاتھ سے وہ کافی کیڑے ماربل پر گری تھی بلکہ اس کا وہ پٹہ بھی عماد کے ہاتھ میں رہ گیا تھا۔

”جی۔۔۔ سمعیہ فریدی نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا تھا کیونکہ بد قسمتی سے وہ کافی کیڑے سمعیہ فریدی کا مہنگا ترین ڈریس ہی نہیں اس کا پیر اور پیر میں پڑے سینڈل بھی داغ دار کر گئی تھی۔

وہ مری کیوں نہیں گئی زمین کیوں نہیں پھٹی آسمان کیوں نہیں گرا وہ زمین و آسمان میں کیوں نہیں سما گئی وہ یہ دن دیکھنے کے لیے زندہ کیوں ہے ان برائی آنکھوں سے کتنے ہی موتی اس کی حالت پر ماتم کدہ تھے۔

”جینیں۔۔۔“ جین آفریدی کی چنگھاڑتی اور چیختی آواز پر سب ہی ساکت ہو گئے تھے۔ جبکہ سلوکی آفریدی نہایت ہی جلال میں آگے بڑھا پہلے اس نے ہاتھ مار کر وہی ڈی پلیٹر پھینکا پھر عماد کا گریبان پکڑا وہیں پر کھڑی خود میں کئی خوفزدہ سی کئی سی لاروش افولان کو دیکھا تھا۔ جو آنکھیں بند کیے صرف رو رہی تھی اور اپنے لیے موت مانگ رہی تھی۔ اس کا پورا وجود خوف سے کانپ رہا تھا۔ سلوکی نے فرش پر پڑا اس کا وہ پٹہ اٹھا کے اس کے گرد ڈالا تھا اور پھر نصی سے دانتوں کو مساتھا ہوا عماد کو بتا مارا کہ لیو لیو لہان کر دیا۔

جین آفریدی کے اور دوست اپنی جگہ سہم کر رہ گئے تھے۔ انہیں جیسے سانپ سونگھ گیا تھا کسی کی بھی ہمت نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر سلوکی سے عماد کو بچالیں۔

لاروش افولان اپنے سارے ہوش و خرد کھوٹی چلی گئی تھی۔ ہر شے اسے گھومتی ہوئی لگ رہی تھی۔ زور پارے نہ تو آتے ہی اسے اپنے سینے میں چھپایا تھا۔ مگر اسے نہیں پتہ تھا کہ وہ اپنے سارے ہوش و حواس کھوٹی چلی گئی ہے۔

بی جان آگے بڑھیں اور سمعیہ فریدی کے منہ پر ایک تھپڑ مارا تھا۔

”جینیں جب میں نے پہلی بار دیکھا تھا میں جب ہی سمجھتی تھی کہ تمہارا فیملی بیک گراؤ کیا ہوگا۔ تمہاری نسل کیا ہے تمہارے جیسے ہی لوگوں نے سوسائٹی میں رہنے والے شرفاء اور عزت دار لوگوں کو بدنام کیا ہوا ہے آج جو میرے گھر میں ہوا ہے وہ ہماری سات پشتوں میں بھی نہیں ہوا ہے۔ ہاں مگر تمہارے خاندان میں ہر روز ہوتا ہوگا۔

سمعیہ فریدی تو چپ چاپ بی جان کو دیکھتی رہ گئی۔ وہ اس کو ہی نہیں اس کے خاندان کو بھی گالی دے رہی تھیں اور وہ کچھ نہیں بول سکی۔ اس کے ماں باپ نے آج تک اسے بلکے سے ڈانٹا تک نہیں تھا۔ اور بی جان نے اسے سب کے سامنے تھپڑ مار دیا۔ اس نے نظریں گھما کر جین آفریدی کو ڈھونڈا تھا جو اس کے سائیڈ میں نظریں زمین پر گھاڑے کھڑا تھا۔

”جی۔۔۔!“

”جسٹ اپ جسٹ شٹ اپ اینڈ گیٹ لاسٹ۔“

عماد آفریدی کی ہری طرح دھاڑے تھے۔ اس نے عشا کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل گیا تھا۔

”اے بیٹلر کوتم۔“

سلوکی آفریدی نے جیسے سے ان دونوں کو آواز لگائی تھی۔ وہ دونوں رک گئے تھے۔ عشانے افس کو دیکھا۔ ”اگر ذرا بھی شرم ہائی ہے آج کے بعد جین آفریدی سے نہیں ملنا اور جاتے ہوئے اس کو لیتے جاؤ۔“ اس کا اشارہ آدھرا عماد کی طرف تھا۔

”جی!“ وہ دونوں شرمندہ شرمندہ سے آگے بڑھے اور زمین میں پڑے خون میں لت پت عماد کو اٹھایا تھا۔ سلوکی آفریدی نے اس کا منہ پھاڑ دیا تھا۔ افس اور عشا تو سہم کر رہ گئے تھے۔

”اور تم ذرا بھی شرم ہائی نہیں ہے یہ تمہارے آوارہ دوست۔“

کوہ نور آملہ بیئر آئل



کوہ نور آملہ بیئر آئل بالوں کی نشوونما کر کے ان کو روشنی، صحت مند اور چمکدار بنائے۔
اس کا مسلسل استعمال بالوں کو خشکی، مرنے کے عمل اور دومنہ کے سرے بننے سے محفوظ رکھے۔

... زندگی سے بھرپور صحت مند بال

معد آفریدی کا یہ آخری جملہ ان جاتے ہوئے انس، عشا اور سمیہ نے سنا تھا اتنی بے عزتی سمیہ زیدی
مزید تیز رفتاری سے بھاگی تھی روتی ہوئی۔

”لاروش لاروش!“

زوبار یہ چیخنے لگی تھیں اس کے چیخنے پر سلجوق اور بی جان تیزی سے آگے بڑھے تھے۔

”سلجوق! لاروش بے ہوش ہو گئی ہے۔“

”اوہ مائی گاڈ؟“

سلجوق آفریدی نے جلدی سے اس کے نازک پھول جیسے وجود کو اپنے مضبوط بازوؤں میں بھر اور جلدی
سے گاڑی میں ڈالا۔ گاڑی کا رخ آغا خان ہاسپٹل کی جانب تھا۔ ساتھ ہی ان کے زوبار یہ بھی تھیں۔

”شرم آتی چاہیے تمہیں آج تمہاری وجہ سے وہ معصوم بچی اس حال کو پہنچی ہے۔“ معد آفریدی اس کے
چمکے ہوئے سر کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے اپنے پیڈروم کی سمت بڑھ گئے۔

حسین آفریدی نے بمشکل اپنی نظریں اوپر اٹھا کر اس کے بچہ کی جان کھڑی اسے دکھائی نظروں سے
دیکھ رہی تھیں۔

”بی جان!“

”بس۔“

بی جان نے اسے ہاتھ کے اشارے سے آگے بولنے سے روک دیا تھا۔

”جانے کہاں ہماری تربیت میں کی رہ گئی ہے تمہاری ہر گئی کو نظر انداز کیا تمہاری لڑکیوں سے دوستی کو
تمہارا بچہ مانا۔ مگر گھر تک یہ سب آگیا ہے۔ جس میں اس معصوم بھولی بھالی بچی کا نقصان ہوا ہے۔ ہم نے

اسے اس گھر کی بیٹی مانا ہے اور تم نے کیا کیا اپنے گھر کی عزت کو ہی اپنے دوستوں کے آگے رسوا کر دیا۔ یہ
غلطی تمہاری ناقابل معافی ہے۔ ہم اس کے لیے بھی تمہیں معاف نہیں کریں گے۔“ بی جان بھی جھکی ہی اپنی

بوڑھی آنکھوں میں ہی لیے اپنے کمرے میں آئی تھیں۔ تاکہ نماز پڑھیں اور دعا مانگیں اس معصوم بچی کی
لاروش احوال ان کے لیے۔

☆.....☆

”جی فرمائیے آپ کو کس سے ملنا ہے؟“ ڈالے اس وقت رضا کو نوڈلر کھلا رہی تھی۔ چونک کر نے انٹرکام
پر کسی کے آنے کی اطلاع دی تھی۔ تو اس نے اندر آنے کی اجازت دی تھی۔

”ہمیں مقصوم سے ملنا ہے کیا آپ انہیں بلا سکتی ہیں؟“

”ایک منٹ پہنچے۔“ ڈالے نے رضا کو اپنی گود سے اتار کر نوڈلر کا یہ المیز پر رکھ کر انٹرکام کے پاس مگی۔

”جی عارفین بھائی کوئی مقصوم بھابھی سے ملنے آیا ہے۔“

”کون ہے؟“

”پہنچیں میں نے تو پہلا وفد دیکھا ہے انہیں ایک سینڈر کیس میں نام پوچھ کر بتاتی ہوں۔“ ڈالے نے
انٹرکام سے منہ موڑ کر پیچھے ان دونوں کو دیکھا۔

”آپ اپنا نام بتائیں؟“

”جی کیوں نہیں میرا نام اسفند درانی ہے اور یہ میرا بیٹا اور درانی ہے۔“

”او کے“ ڈالے نے عارفین کو نام بتائے۔

ٹھیک ہے تم ان کو اوپر بھیج دو۔“

”جی ہمت۔“ ڈالے نے ریسیور رکھ دیا۔

”آپ لوگ اوپر سینکڑوں طور پر چلے جائیں۔“

ٹھیکس بیٹا! ”اسفند درانی نے پیار سے کہا اور دونوں اوپر جانے والی سیڑھیوں کی جانب بڑھتے چلے گئے۔ ڈالے نے ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ دیکھنے میں تو کسی مہذب خاندان کے لگ رہے ہیں۔ ان کی چال و حال ان کی ڈرائنگ ان کے بولنے کا انداز پر سے لکھے ہوئے کا ثبوت دے رہا تھا مگر ان صاحب کا بیٹا تو بالکل ہی انگریز لگ رہا تھا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ پاکستان کا شہری ہو۔

”خیر مجھے کیا لینا۔“ اپنی سوچوں کو جھٹکتی وہ رضا کی جانب بڑھی اسے نوڈلز کھلا کر پھر زرمیل کے لیے سوپ بھی تیار کرنا تھا۔

”مقوم اتم سے کوئی ملے آیا ہے۔“ عارفین بیڈروم میں آیا وہ شام میں پہننے کے لیے کپڑے استری کر رہی تھی۔

”مجھ سے مگر کون؟“ اس نے استری چھوڑ دی تھی اور عارفین کو دیکھنے لگی تھی۔

”آئی ڈونٹ نو۔“ عارفین نے لالچی کا اظہار کر دیا تھا۔

”او کے میں آتی ہوں۔“ مقوم نے سوچ آف کر دیا اور عارفین کے ساتھ ڈرائنگ روم میں انٹر ہوئی تھی اس کی نظر ان دونوں شخصیات پر چبھے ہی پڑیں ایسا لگا جیسے اس کی سانس رک گئی ہو۔

اسفند درانی اور یاور درانی کی بھی نظر مقوم پر پڑ چکی تھی۔ وہ دونوں صوفے سے کھڑے ہو گئے تھے۔ بلکہ یاور تو باقاعدہ کھڑا ہو گیا مقوم کہتے ہوئے۔

”مقوم ڈرائنگ کہاں چلی گئی تھی تم؟“ مقوم تو خوف کے مارے سپید پڑ چکی تھی اس کے تو ذہن و گمان میں بھی نہیں تھا وہ دونوں یہاں بھی آسکتے ہیں۔ وہ کسی خوفزدہ سبکی چڑیا کی طرح عارفین کی پشت پر چپک گئی تھی۔

عارفین کو اس طرح مقوم کو پکارنا سخت ناگوار لگا تھا۔ مگر مقوم کا یوں ڈر کر کہم کر اس طرح سے اس کے پیچھے چپ جانا وہ الجھ کر رہ گیا۔

”کیا میں جان سکتا ہوں آپ لوگ کون ہیں؟“ عارفین نے ناگوار نظروں سے یاور درانی کو دیکھنے کے بعد خاموشی سے اسفند درانی کو دیکھا تھا۔

کیا یہ اچھا نہیں ہوگا یہ سوال آپ مقوم سے کریں۔“ اسفند درانی نے پیچھے سے جھانکتی مقوم کو مسکرا کے دیکھا تھا۔

عارفین نے خاموشی کی ایک نظر ان پر ڈالی پھر سوالیہ نظروں کا رخ مقوم کی سمت موڑا۔

”مقوم کون ہیں یہ لوگ؟“

”جی!“ وہ بری طرح بوکھلا کر رہ گئی تھی۔

”ہاں بتاؤ کون ہیں یہ؟“ عارفین نے مقوم کی بوکھلاہٹ نوٹ کر لی تھی۔

”یہ اسفند درانی ہیں میرے چچا اور یہ ان کے بیٹے ہیں یاور درانی۔“ مقوم نے ڈرتے ڈرتے ان دونوں کی طرف دیکھا تھا۔

”بیٹا پورا تعارف کرا ہے۔“ اسفند درانی نے شفقت سے کہتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ مگر مقوم خاموش رہی۔ عارفین کو تو ان لوگوں کی ذہنی باتیں بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔

”ڈیڈ! یہ کچھ نہیں بتائے کی آپ بتائے یا مجھے بتائے دیجیے۔“ یاور درانی کی آنکھوں میں غصے کے رنگ گھلنے لگے تھے۔

”آل رائنٹ مانی سن ریلیکس۔“ انہوں نے یاور کو فصر سے منع کرنے کا اشارہ دیا تھا۔

”عارفین صاحب مقوم نہ صرف میری بیٹی ہے بلکہ میری بہو میرے بیٹے یاور کی بیوی بھی ہے جو اس وقت آپ کے سامنے کھڑا ہے۔“

”واٹ کیا بے ہودگی ہے یہ؟“ زبردست انکشاف ہی نہیں بلکہ دل کو دھچکا بھی لگا تھا۔

”آپ کو کچھ اندازہ بھی ہے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مقوم آپ کے بیٹے کی بیوی کیسے ہو سکتی ہے کیونکہ مقوم تو میری بیوی ہے۔ میں نے باقاعدہ سب کی موجودگی میں اس سے نکاح کیا ہے۔“

”اب کیا کہہ سکتے ہیں آپ کو حقیقت کا نہیں پتا اس لیے اس طرح کہہ رہے ہیں۔ اچھا ایک کام کریں کہ مقوم آپ کے سامنے کھڑی ہے آپ مقوم سے خود ہی پوچھ لیں۔ کیوں مقوم بیٹا؟“ اسفند درانی نے مقوم کو نرم و ظاہر نظروں سے دیکھا تھا۔

”میں یہ سب جھوٹ ہے۔ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔“ وہ بری طرح ڈری ہوئی تھی اور اسفند درانی کی باتوں نے اسے مزید ڈرا دیا تھا۔

”ڈیڈ! یہ اس طرح نہیں مانے گی مجھے اپنی زبان میں سمجھانے دیں اسے۔“ یاور درانی اسے بری طرح غصے سے گھورتے لگا تھا۔ اور ایک لمحے میں اس کی طرف بڑھا تھا اور ایک جھٹکے سے اس کی کانٹنی کلائی تمام کی گئی۔

”جھل میرے ساتھ۔“ جیسے بیٹا کی بات سمجھ میں آئی نہیں ہے۔

”میں!“

مقوم نے خوفزدہ ہو کر عارفین کا کمرتی باز واپسی تھیلی میں ہنسی سے دیوبج لیا تھا۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے؟“ عارفین نے یاور درانی کے ہاتھ سے مقوم کی کلائی چھڑوائی تھی۔

”جب مقوم منع کر رہی ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے تو اس سب کیا مطلب۔“ عارفین کو یاور درانی کا اس طرح مقوم کو ہاتھ لگا کر سخت ناگوار گزارا تھا۔ مقوم تو پھرتی سے عارفین کی پشت کے پیچھے پھر سے جا چھپی تھی کہ مبادا یہ لوگ اسے لے لی نہ جائیں۔

”عارفین صاحب! اب آپ زیادتی کر رہے ہیں مقوم ہماری بہو بیٹی ہے آپ کو انہیں یہاں روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“ اسفند درانی چراغ باہر گئے تھے مگر زیادہ فصرہ کر کے کام کو بگاڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اپنے غصے پر کنٹرول کیا کیونکہ ثبوت نہیں تھا ان کے پاس۔

”بہر حال جو کچھ بھی ہے میں نہیں جانتا میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ مقوم میری بیوی ہے اور مجھے اس پر پورا پورا بھروسہ ہے وہ اگر بول رہی ہے تو سچ ہی ہے۔ اسی لیے آپ لوگوں کی بہتری اسی میں ہے کہ آپ لوگ یہاں سے تشریف لے جائیں اور دوبارہ یہاں آنے کی تکلیف نہیں کیجئے گا۔“

روحانی ڈائری

روشنی فیصل کی ڈائری سے

فیض احمد فیض کی ایک نظم

موتی ہو کہ شیشہ جام ہو کہ زور
جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا
کب انکوں سے جڑ سکتا ہے
تم ناحق کلوے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
یہ سفر خستہ یہ قفل و کوہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں کلوے ہوں تو فقط
چیتے ہیں خون رلاتے ہیں

ریمانا نور رضوان کی ڈائری سے

احمد اسلام احمد کی نظم

موسم سرما کی پہلی بارش
موسم سرما کی یہ پہلی بارش بھی تو
پہلے پہلے پیار کے جیسے ہوتی ہے
ملتی ہے پڑھتی روپ بدلتی ہے پتلی میں
کس کی ہلکی خوشبو یا
اک نظر دزدی ہو
دھڑے کی جھلک میں لپٹا
جلداک شلت سا
ایسے دل کو رام کرے
جذیوں کی بے تاب ندی
پر جیسے پل کا کام کرے

ہر اک ابھرن اور بے چینی
پہلی پہلی بارش کی اس
پہلی پہلی سرکشی میں
گھلتے گھلتے گھو جاتی ہوں
اک مجھ مدھوشی کی
ہر سوطاری ہو جاتی ہے
کراہی اس خواب بچائی
پہلی پہلی بارش میں

ملالہ اسلامی ڈائری سے

دوسی شاہ کی نظم

پہلی آنکھوں والی لڑکی
میری طرف جب دیکھتی ہے تو
من میں جل کر جاتی ہے
مجھ کو پاگل کر جاتی ہے

افشاں علی کی ڈائری سے

ایک خوب صورت غزل

محبت کے سفر میں جب وفا کا سلسلہ لکھا
تو تجھ کو اپنی ہستی کا اکیلا آشنا لکھا
زمانے کی عداوت نے کافر تک کہا مجھ کو
پھر بھی میری چاہت نے تجھے سب سے جدا لکھا
میرے جذبیوں کی طاقت کو کوئی نہ سمجھ پایا
کسی نے ابتدا لکھا کسی نے انتہا لکھا
تیری ہستی قیامت تھی یا کوئی مہر تھا تجھ میں

کہ خود تقدیر نے تجھ کو دعا کا معجزہ لکھا
میری جڑ کن کی بندش پر زمانے کے سجانے
محبت کو غم لکھا تجھے اس کی دوا لکھا
مجھے یہ فر ہے کہ میں تجھے تحریر کرتی ہوں
اسی خاطر تجھے پل پل اپنا ہمو لکھا

مدیح اعجاز حسین کی ڈائری سے

قمر امروہوی کی غزل

ان کی آنکھوں میں اگر ہم عکس اپنا دیکھتے
جانے کیا ہوتا کہاں ہوتے جو ایسا دیکھتے
دل کے ہر گوشے میں ان کی یادیں جاتی اگر
آرزو کو صورت خال سد یدواہ دیکھتے
مگرانے کو تھے میر حال پر وہ بھی قمر
آج غم کی پورش پیچم کو پسپا دیکھتے
ان کے دامن پر اگر گرتا میری آنکھوں سے خون
اپنے ہر آنسو کو ہم دوش تریا دیکھتے
اپنے بیل کا وہ خود آکر تماشا دیکھتے
دل کے ہر گوشے میں ارمناؤں کی دنیا دیکھتے

علیہ احمد کی ڈائری سے

ایک غزل

یاد آؤں تو بس اتنی سی حمایت کرنا
اپنے بدلے ہوئے لہجے کی وضاحت کرنا
تم تو چاہت کا شاہکار ہوا کرتے تھے
کس سے سیکھا ہے یہ الفت میں ملاوٹ کرنا
ہم سزاؤں کے حقدار بنے ہیں کب سے
تم ہی کہہ دو جرم ہے کیا محبت کرنا
تیری فرقت میں یہ آنکھیں ابھی تک نم ہیں
مجھ آتا میرے آنکھوں کی زیارت کرنا
دل میں اب بھی محبت کے دینے ہیں روشن
دیکھ بیوے نہیں ہم تیری ہستی کی عبادت کرنا

شہلا گل محری ڈائری سے

ایک خوب صورت نظم

تو موسم میرے اندر کا
تیری پلکیں جب کھلتی ہیں
میری سانسیں بھی چلتی ہیں
تیرے ہونٹوں پہ ہنسی جب جھپکتی ہے
میرے من مندر میں کھنکھاتی جھپکتی ہے

تو

پیار میری آنکھوں کی

تو

چاہت میری سانسوں کی

تو

خواہش میرے وجدان کی

تو دیر میرے من مندر

تو موسم میرے اندر کا

صائمہ ظہیر کی ڈائری سے

دوسی شاہ کی غزل

اب تو ممکن ہی نہیں اُن سے ملاقات دوسی
اب تو عروج پہ پہنچی ہے اس کی ذات دوسی
وہی وعدے ہیں اور دوسوں کی زنجیریں باقی
کب بدلتی ہیں زمانے کی روایات دوسی
ایک وہ دن تھے کہ اک دھڑے کو پوچھے تھے ہم
اب ملنے نہیں دونوں کے خیالات دوسی
میری ہر صبح کا آغاز تیرے نام سے ہو
تیری یادوں میں کئی میری ہر اک رات دوسی
تم کہاں اور میرے پیار کا معیار کہاں
وہ تھی سادگی سے کہہ گئے یہ بات دوسی

☆.....

پہلی لائبریری اینڈ آرکائیو پبلیکیشن
سابقہ سلسلہ اور جلد سازی کی کاپیوں کو جوڑ دے
لے کر پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے
روزانہ انجسٹ 193 صدف سعد کی ڈائری کا حصہ ہے

اشعار

ریما نور رضوان..... کراچی
 اچھا خاصا بیٹھے جیسے کم ہو جاتا ہوں
 اب میں اکثر میں نہیں رہتا تم ہو جاتا ہوں
 سدرہ شاہین..... خانپور
 کھلونے ٹوٹ جانے پر بہت روتی تھی بچپن میں
 مگر اب دل جو ٹوٹا ہے تو آنسو کیوں نہیں بہتے
 ریشل آرزو..... اوکاڑہ
 تم نے ہی تو سنایا تھا ترک تعلق کا فیصلہ
 پھر کیوں آتے ہو خواب میں تو بھی خیال میں
 ریما راشن..... کراچی
 میرے الفاظ ہی پردہ ہیں میرے چہرے کا
 میں ہوں خاموش جہاں مجھ کو دہاں سے سینے
 ملا اسلم..... خانپور
 لفظوں کے ہیر پھیر مجھے نہیں آتے لیکن
 دل سے تیرے دیدار کی چاہت نہ گئی
 علیہ احمد..... بہاولنگر
 لوگ کہتے ہیں کہ مکان ہے ہوتوں پر میرے
 کون جانے تصور میں بنایا کس نے
 ثناء حیات..... کراچی
 ستم گر تم سے امید کرم ہو گی جنہیں ہو گی
 ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ تم ظالم کہاں تک ہو
 عشنا علی..... لاہور
 جواہر عرف ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کے ملتے ہیں
 صراحتی سرگوں ہو کر بھرا کرتی ہے جگہ

عانیہ نیازی..... ریلوے
 غم کی بارش نے بھی تیرے نقش کو دھویا نہیں
 خود کو کھو دیا میں نے تجھے کھپایا نہیں
 جانتا ہوں اک ایسے شخص کو میں بھی نہیں
 غم سے بچر ہو گیا لیکن کبھی رویا نہیں
 امیرین حیدر..... اسلام آباد
 ذرا سی دیر کو آئے تھے خواب آنکھوں میں
 پھر اس کے بعد مسلسل عذاب آنکھوں میں
 وہ جس کے نام کی نسبت سے روشن تھا وجود
 کھٹک رہا ہے وہ ہی آفتاب آنکھوں میں
 نوشین مندر..... لاہور
 سر چھپانے کی جگہ مانگو تو سر مانگتے ہیں
 رہا باہم کے لیے خون جگر مانگتے ہیں
 ہو سکے تم سے تو اغلاص کی کلیاں دے دو
 زرد گوہر نہ کوئی ٹمس و قمر مانگتے ہیں
 رابعہ منیر..... سرگودھا
 عجب نیکی ہے یہ ہاتھ کی لکیروں میں
 ستر لکھے ہیں سحر راستہ نہیں لکھا
 خیال و خواب کے منظر رقم سب ہی نے کیے
 جو چشم دید تھا وہ واقعہ نہیں لکھا
 شامک ملک..... کراچی
 سدا جگرے رہے قسمت کی جو زنجیروں میں
 ہمارا نام بھی شامل ہے ان ایروں میں
 وہ جس کے ساتھ کی خواہش اڑان بھرتی ہے
 اسی کا نام نہیں ہاتھ کی لکیروں میں

صباح..... ہارون آباد
 کیا کہ عقل کی انگلی پکڑ کر چلتے رہتے ہو
 سبھی دل کی بھی بوقت ضرورت مان لیتے ہیں
 صائمہ ناز..... فیصل آباد
 تمہارے عشق میں ہم پر جو حال گزرے ہیں
 ملا جلا کے کوئی تیس سال گزرے ہیں
 یہ چار دن کی محبت تو ہے نہیں جاناں
 شمار کر لو کہ کتنے سال گزرے ہیں
 رامین..... راولپنڈی
 اس قدر زلیلت کی راہوں نے تھکایا ہے مجھے
 کون چھڑا ہے کہاں کون ملا یاد نہیں
 ہسمہ احمد..... ایبٹ آباد
 آہٹ پر میرے پاؤں کی دھیرے سے چمک کر
 دیکھا ہے اس نے مڑ کے مجھے اس ادا کے ساتھ
 جھکی ہے جسم و جان میں جب ایک سر خوشی
 خوشبو کی کوئی اڑنے لگی ہے ہوا کے ساتھ
 منیرہ سید..... کجرات
 حراج اپنے بہت محقق تھی پھر بھی
 ہمارے سچ محبت کا پاس رہتا ہے
 حنا علی..... ملتان
 یہ جو پانی میں چلا آیا سنہری سا غرور
 اس نے دریا میں نہیں پاؤں اتارا ہو گا
 نبیلہ خالد..... واہ کینٹ
 ان کو دل میں سنبھال کے رکھو
 ان کو سوچو بہت قریبوں سے
 چند سانفوں سے ٹوٹ جاتے ہیں
 لفظ نازک ہیں آئینوں سے
 کائنات علی..... کراچی
 ہجوم میں تھا وہ شاید نہ رو سکا ہو گا
 مگر یقین ہے شب بھر نہ سو سکا ہو گا
 وہ شخص جس کو سمجھنے میں مجھے عمر لگی

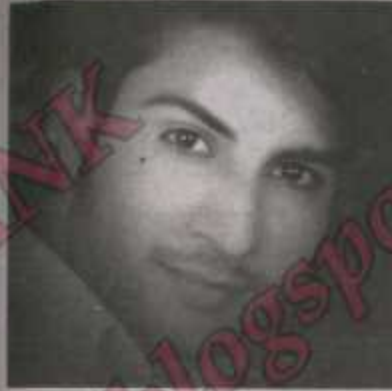
چھڑ کر مجھ سے کسی کا نہ ہو سکا ہو گا
 نگہت تو قیر..... چیچک وطنی
 درد کی دل پہ حکومت تھی کہاں تھا اس وقت
 جب مجھے تیری ضرورت تھی کہاں تھا اس وقت
 دل کے دریاؤں میں اب ریت ہے صحراؤں کی
 جب مجھے تھکے سے محبت تھی کہاں تھا اس وقت
 سحرہ سعید..... کراچی
 خود سے کھینچا ہو کوئی زہر کا بھالا ہم نے
 اس طرح اس کو کھینچے سے نکالا ہم نے
 ضد پر آجائے کسی بات پر بچے جیسے
 دل تیرے بعد کچھ اس طرح سنبھالا ہم نے
 فرزادہ شوکت..... کراچی
 خوشبو ہوں اگر تو گلابوں میں ڈھونڈنا
 سایہ ہوں میں اگر تو سراہوں میں ڈھونڈنا
 جس روز یاد میری ستانے لگے تھے
 تصویر میری اپنی کتابوں میں ڈھونڈنا
 نوشین طاہر..... دہاڑی
 مایوسیوں کے دور میں کن حسرتوں کے ساتھ
 ہم پتھروں کے دل میں خدا ڈھونڈتے ہیں
 حجاب زہرہ..... خیرپور
 ہمیں جو ناز ہے خود پہ نہیں وہ بے وجہ "خشن"
 کہ جس کو ہم نے چاہا ہو وہ خود کو عام کیوں سمجھے
 صائمہ اکبر..... خیرپور
 کل رات میں نے اپنے دل سے تیرا رشتہ پوچھا
 کم بخت کہتا ہے جتنا میں اس کا ہوں اتنا تیرا بھی نہیں
 کنول آفتاب..... لاہور
 اک تھا آنسو فک پڑا چپکے سے
 جینے کی مجھے دعا میری سہیلیاں دے گئیں
 خدا ہوتا نہیں کبھی بے خبر دعاؤں سے
 تسلیاں یوں ہی مجھے میری سہیلیاں دے گئیں

الغزوة

FM 102

کے پریزنٹر

R.J عدیل اقبال



آواز کی دنیا کی ایک جانی پہچانی آواز جو ہوا کے دوش پر ستر کرتی ہوئی Dil FM 102 کے سامعین کے دلوں میں ایک خاص مقام رکھتی ہے وہ آواز آج ہمارے ساتھ ہے۔ جی ہاں آ رہے عدیل اقبال

سنائے بولے تو باتوں سے پھول جھرتے ہیں یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں سوال کے عدیل اقبال کون ہے اپنے بارے میں کچھ بتائیے؟

جواب کے پہلا سوال ہی قدرے مشکل ہے میں کیسا ہوں یہ میرے ساتھ رہنے والے کام کرنے والے بہتر بتا سکتے ہیں پھر بھی جواب میں اپنے لیے یہی کہوں گا کہ ابن انشاء نے کہا تھا کہ میں اک گناہ سپاہی ہوں۔ عدیل اس سپاہی سے زیادہ مختلف نہیں ہے بہت سادہ مزاج اور خاموش لیکن خاموش اس سمندر کی طرح جس کے اندر بہت کچل اور شور ہے۔

سوال کے ریڈیو پر کب سے ہیں اور کس نے حصارف کروایا؟

جواب کے ریڈیو کا آغاز آج سے تقریباً چار سال قبل 13 جنوری 2012ء سے کیا۔ جہاں تک سوال ہے حصارف کروانے کا تو حصارف کسی نے نہیں کروایا بلکہ کسی کو بھی نہیں پتا تھا گھر سے چھپ کر

آڈیشن دیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اجازت نہیں ملتی مگر کسی کو بتانا نہیں چاہتا تھا ابھی بھی نہیں بتاتا۔ دیکھیں اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں بہت سی صلاحیتیں رکھی ہوتی ہیں کچھ وراثت میں ملتی ہیں اور کچھ انسان خود اپنے اندر جذب کرتا ہے، سیکھتا ہے، معاشرے سے تو ان صلاحیتوں کو حریف نکھاراجاتا ہے۔ میرا اب ولید میرا منتظر اس پہ میرے والد محمد اقبال فریدی صاحب کی بہت محنت ہے وہ میرے والد بھی ہیں اور استاد بھی اللہ انہیں زندگی اور صحت عطا کریں۔ جب ریڈیو سننا تھا تو لفظ لفظ لفظ ادا کی پر غصہ آتا تھا تو سوچتا تھا کہ اس سے بہتر تو میں کر سکتا ہوں تو بہتر کرنے کے شوق نے مجھے ریڈیو پہنچا دیا۔

سوال کے پہلا شو آن ایئر ہونے پر کیا

احساسات تھے کس ہستی نے جی بھر کر سراہا؟

جواب کے میری خوش قسمتی ہے کہ ایسے گھرانے میں پیدا ہوا جہاں سب کے سب ادب سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ اسکول میں ادبی پروگرام، تلاوت، نعت، ملی نغمے اور تقریری مقابلہ جات میں حصہ لیا کرتا تھا چونکہ بچپن سے ہی مائیک سے آشنا تھا تو زیادہ مشکل نہیں ہوئی۔ میں نے نواز سے آغاز کیا تھا پروگرامز بہت بعد میں شروع کیے۔ میں بہت خوش پر جوش تھا اور خبریں پڑھتے وقت ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ میری پوری نواز نیم خصوصاً مشتاق عادل صاحب، محمد اسحاق صاحب، احتشام صاحب، حافظ محمد عمران صاحب، کامران اور محمد عثمان صاحب نے اور پھر گھر سے بھی بہت پذیرائی ملی بہت سراہا گیا۔

سوال کے آج کے دور میں ریڈیو کی کیا اہمیت ہے؟

جواب کے دیکھیں ریڈیو کی اہمیت آج بھی کم نہیں ہوئی وقت کے ساتھ ساتھ ریڈیو میں بھی جدت آگئی۔ یہ بات ماننا پڑے گی کہ ہر جگہ ٹیلی ویژن نہیں ہو سکتا، انٹرنیٹ نہیں ہو سکتا اگر ہو بھی تو مکمل کا بحران ہوگا۔ ریڈیو ہر جگہ سننے کو ملے گا پھر یہ کہ ریڈیو کو سننے کے لیے آپ کو کوئی کام نہیں چھوڑنا پڑتا۔ آپ کام کے دوران، سفر کے دوران، سیر کے دوران ریڈیو سن سکتے ہیں پھر ہر طرح کے پروگرامز آپ کو سننے کو ملتے ہیں۔ مطلب یہاں بھی بہت درائی ہے آپ مذہبی، معلوماتی، تفریحی، تعلیمی اور دنیا بھر کی خبریں بھی سن سکتے ہیں۔ ٹی وی نیٹ ہر کسی کی بساط میں ہوتا ہے ریڈیو اب ہر کسی کی پہنچ میں ہے اور بہت آسان استعمال ہے شاید کسی وجہ سے کہ ٹیلی ویژن موٹا ہے کم عمری کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے موبائل کے ہر ماڈل میں ریڈیو

ایپلی کیشن کو حصارف کروایا۔ بڑے تعلیمی اداروں، ریسکیو، پولیس، آرمی دیگر پرائیٹ اداروں میں بھی ریڈیو بڑی کامیابی سے چل رہے ہیں۔

سوال کے کیا آواز کی بنیاد پر محبت ہو سکتی ہے؟ جواب کے کہتے ہیں تاکہ محبت اندھی ہوتی ہے تو بس جب ہوتی ہوئی ہے تو ہو جاتی ہے۔ آواز، رنگ، نسل، مذہب، ذات پات کچھ نہیں دیکھتی بس ہو جاتی ہے۔

سوال کے زندگی آپ کی نظر میں کیا ہے اور اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟

جواب کے زندگی ایک ڈرامہ ہے جس میں بہت سے کردار ہیں۔ اس ڈرامے میں آتے ہیں پر قارم کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں مگر اس ڈرامے کا اسکرپٹ ہمیں دیا گیا پھر ہماری رہنمائی کے لیے رہنما بھیجے گئے جنہوں نے ہمیں پر قارم کر کے دیکھایا۔ اب ہمارے پاس اسکرپٹ تو ہے مگر ہم اس کو اپنے مطابق ڈھال کر یہ ڈرامہ کر رہے ہیں اگر اسکرپٹ نہ دیا جاتا تو اجرت بھی اسی طرح کی ملے گی اور جہاں تک بات ہے میرے مطمئن ہونے کی تو اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہوں ہمیشہ بہتر سے بہترین کی جستجو رہتی ہے اور رہے گی۔

سوال کے کن لوگوں پر رشک اور کن لوگوں پر غصہ آتا ہے؟

جواب کے ایسے لوگ جو بہت ہی عاجز و انکسار ہوتے ہیں۔ مخلوق خدا سے پیار کرنے والے ہوں اور جو خدا کے برگزیدہ بندے ہیں ان پر رشک آتا ہے۔ غصہ بہت ہی کم کرتا ہوں ہاں اگر کوئی لفظ بیانی سے کام لے تو غصہ آ جاتا ہے۔

سوال کے ہمارے ہاں زیادہ تر ریڈیو پرائیڈن اور انٹرنیشنل ڈک پلے کیا جاتا ہے مطلب خالصتاً

پاکستانی ایف ایم چینل کوئی بھی نہیں ہے۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے؟

جواب کہ چینل پاکستان میں بہت سے ریڈیو ہیں پاکستان ریڈیو کے علاوہ بھی جن پر صرف پاکستانی گیت آن ایئر کیے جاتے ہیں بلکہ جیکبرا کے قواعد و ضوابط کے مطابق ساتھ فیصد پاکستانی اور چالیس فیصد غیر ملکی گیت آن ایئر کیے جاتے ہیں پھر کوئی بھی پاکستانی ریڈیو ہونا ہر قومی ہونا مرنے اس حوالے سے عوام میں شعور اجاگر کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ ثقافت، زراعت، صحت، تعلیم کے علاوہ دیگر عوامی مسائل پر مختلف پروگرامز کیے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ سامعین کی پسندیدگی کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔

سوال کہ عام بولنے میں اور ایف ایم پر بولنے میں کیا فرق ہے؟

جواب کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ آسان کام ہے اور ہم بھی بول سکتے ہیں۔ چلی بات بولنے اور اچھا بولنے میں بہت فرق ہے اور کہا جاتا ہے تاکہ پہلے تو لو پھر بولو۔ مائیک ایک ڈسے داری ہے جو الفاظ ایک بار ادا کر دیے گئے وہ واپس نہیں لائے جاسکتے پھر ایک ہی وقت میں آپ کو لاکھوں لوگ سن رہے ہوتے ہیں جن میں بچے بھی ہوتے ہیں، خواتین، مرد، جوان اور بزرگ بھی تو سب کے ذہنی معیار کو مد نظر رکھنا پڑتا ہے ریڈیو پر بولنے کے لیے آپ کو جس زبان میں پروگرام کرنا ہے اس پر عبور ہونا چاہیے بولتے وقت لگت نہیں ہونی چاہیے تسلسل ہونا لازم ہے۔ جام روزمرہ زندگی میں بولنا آسان ہے تاکہ مائیک پر صرف مائیک پر بولنا نہیں ہوتا اور بھی بہت سے کام ساتھ ساتھ انجام دینا ضروری ہوتے ہیں۔

سوال کہ زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا

ہے؟ جواب کہ خواہش ہے کہ خانہ کعبہ کے انتہائی پاس رہوں اور عبادت رہوں۔

سوال کہ شدید اداسی کے عالم میں کیا کرتے ہیں؟

جواب کہ اداسی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہوں یا پھر خاموش رہتا ہوں۔

سوال کہ ایک اچھا آر جے بننے کے لیے کن صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے؟

جواب کہ پہلی بات یہ کوئی نوکری نہیں ہے شوق کی حد تک ٹھیک ہے۔ شوق ہونا، آپ کا بھندار ہونا، آپ کی آواز، تلفظ، لہجہ، تسلسل، زبان پر عبور، معلومات، برداشت کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ پر نظر اور انداز بیان کے آپ ڈیلیور کس طرح سے کرتے ہیں میرے مطابق یہ چیزیں ایک اچھے آر جے کی خوبیاں ہوتی ہیں۔

سوال کہ ہم لوگ اپنے ملک کے ٹیلنٹ کو سر لانے کے بجائے بیرونی ملک کے فنکاروں کو کارروں کی زیادہ پذیرائی کیوں کرتے ہیں؟

جواب کہ ہم پر جب عروج تھا ہم نے ایجادات کیں ہم نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا مگر کچھ عرصے سے ہماری میوزک انڈسٹری میں معیاری کام نہیں ہو رہا آپ کے جو موجودہ کلاسیکل گلوکار ہیں جیسے شفقت، راحت وغیرہ جنہیں سرسرم راگ تال کا پتا ہے جنہوں نے باقاعدہ موسیقی کے علم کو سیکھا ہے وہ آج بھی مقبول ہیں چاہیں پاکستان میں گائیں یا مہاجر ممالک میں۔ ہمارے ہاں اب گانے کے لیے صرف آپ کے پاس پسپا ہونا چاہیے۔ چار پیسے دو گانا گاؤ مختلف جتنی کو سمجھو جیسا تیار چل جائے گا۔ ہمارے ہاں اب سیکھا نہیں جاتا جبکہ مہاجر ملک

میں یہ باقاعدہ تعلیم ہے سکھانے والے ادارے ہیں اساتذہ ہیں جدید انسٹرومنٹس ہیں لکھاری ہیں ہر کام الگ الگ بندہ کرتا ہے اور یہاں لکھتے بھی خود کمپوز بھی خود میوزک بھی خود مختصر آئے کہ جہاں محنت ہوتی ہے دیکھی ہے لوگ پسند بھی کرتے ہیں سنتے بھی ہیں۔ ہمارے ہاں چند ایک لوگ اچھا کام کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس بہت اچھی آوازیں ہیں مگر صرف آواز کا ہونا ہی کافی نہیں ہے سوانحی بہت محنت درکار ہے۔

سوال کہ ادب سے کس حد تک لگاؤ ہے اور کبھی خود کچھ لکھا آپ نے؟

جواب کہ ادب سے بہت لگاؤ ہے جس کی وجہ سے یہ کہ گھر کا ماحول اور پھر جس شہر سے تعلق ہے اس کی تعلیمی اور ادبی میدان میں اپنی ہی ایک منفرد پہچان ہے جسے ضمیر نیازی، طارق عزیز، نکل سامری جیسی شخصیات کے علاوہ دیگر ادب سے وابستہ لوگوں نے اپنا سکھ بنایا۔ جہاں تک بات ہے پسندیدگی کی تو علامہ اقبال آئینڈیل ہیں۔ ان کے علاوہ فیض احمد فیض، احمد فراز، قسطنطین، حسن نقوی، احسان دانش، مسعود انور آج کل امجد اسلام امجد کو پڑھ رہا ہوں۔ خود لکھنے کی کوشش کرتا ہوں میں نہ شاعر ہوں نہ لکھاری بس کچھ اشعار اور نظمیں لکھیں ہیں ایک نظم قارئین کی نذر

یہ چاہتا ہوں کہ میں سلسلے

مختار کا یہ دور ہے

آؤ رئیس اور کدورتیں

سب جڑ سے اکھاڑ کے پھینک دیں

آؤ گلے ملیں نئے عزم سے

نئے آشیانے تراش لیں

اس سرزمین کے جو پھول ہیں

انہیں آؤ پھر سے بہاؤ دیں

انہیں نور دیں نئے رنگ دیں

انہیں آؤ پھر سے سنوار لیں

سوال کہ آپ کے پسندیدہ آر جے کون ہیں؟ جواب کہ آج سے کوئی چھ سال پہلے جہلم کے ایک آر جے کو سنا تھا وحید بہت ہی ادنیٰ بہت سنجھا ہوا پروگرام کرتے تھے ان کا تلفظ اداسی الفاظ کا ذخیرہ اور غضب کا انداز بیان تھا ان کی تعریف میں اتنا ہی کہوں گا کہ

نہیں امل سخن کی لب کشائی فیض سے خالی

صدف کا جب وہاں کھلتا ہے تن کو ہر لہجے میں

سوال کہ محبت کیا ہے اور آپ نے محبت کی؟

جواب کہ محبت ایک ایسا خوب صورت پرکشش اور لطیف احساس جس نے ہر رشتے کو جوڑے اور باندھے رکھا ہے۔ محبت کی بھی اور کرنی بھی چاہیے مگر اسے صرف لاکالری تک محدود نہیں کرنا چاہیے۔

سوال کہ اربن میرج یا لو میرج کے حق میں ہیں؟

جواب کہ اربن کے حق میں ہوں مگر بچوں کی رضامندی شامل ہونا از حد ضروری ہے۔ ویسے ہمارے ہاں والدین بچوں کی رضامندی کو اہمیت دیتے ہیں جو کہ سراہا جاتا ہے۔

سوال کہ شریک حیات میں کن خوبیوں کو دیکھتے ہیں؟

جواب کہ نیک سیرت ہوں، گفتہ نرم خواہر

انتہائی سادہ اور عاجز حراج طبیعت کی مالک ہوں۔

سوال کہ ملکی حالات کا ڈسے دار کون ہے؟

جواب کہ ملکی حالات کے ڈسے دار ہم خود ہیں ہم نے دوسروں کو ٹھیک کرنے کا ٹھیک لے رکھا ہے

رواۃ النجاشی 197 مئی 2015ء

اس ماہ میں

کے رکاوٹوں کے باوجود آگے بڑھنا اور دکھوں کو
بھٹ کر چھیلنا ہی زندگی ہے۔

کے اگر دکھوں کا دریا عبور کرنا ہے تو آنسوؤں کو
جذب کرنا سیکھو۔

کے علم کی محبت اور استاد کی عزت کے بغیر کچھ
حاصل نہیں ہوتا۔

کے رشتے خون کے ہی نہیں احساس کے بھی
ہوتے ہیں اگر احساس ہو تو انہی بھی اپنے اور اگر

احساس نہ ہو تو اپنے بھی بیگانے بن جاتے ہیں۔
عائشہ نیازی۔ ریلوہ

اس ماہ کا ڈراما سٹین

ہڈیوں کے دو بڑے ڈاکٹر حسب معمول شام کو
فلپس کے لیے نکلے۔ انہیں دور سے ایک آدمی لنگڑاتا

ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر ایک ڈاکٹر بولا۔ ”معلوم ہوتا
ہے کس کے گھٹنے کی ہڈی سٹار ہے۔“

دوسرے ڈاکٹر نے کہا۔ ”میرا تجربہ کہتا ہے کس
کے گھٹنے میں بری طرح موج آئی ہے۔“

اتنے میں وہ آدمی قریب آ گیا تو ایک ڈاکٹر نے
اسے روک کر پوچھا۔ ”کیوں جناب! آپ کے

لنگڑانے کا سبب گھٹنے کی تکلیف ہے یا گھٹنے کی
”موج“؟“

وہ آدمی پریشان ہو کر بولا۔ ”معاف کیجئے گا
میرے گھٹنے میں تکلیف ہے اور نہ گھٹنے میں موج آئی

ہے دراصل میری چھل ٹوٹی ہوئی ہے۔“
نوشین مدثر۔ لاہور

اس ماہ کے اقوال

کے ضروریات کو کم کر لینا سب سے بڑی
مالداری ہے۔

کے سچائی بھی اپنی تلاش کرنے والوں کو ذلیل نہیں
ہونے دیتی۔

کے جو شخص تمہارے سامنے دوسروں کی برائی
کرتا ہے جان لو کہ وہ تمہاری برائی دوسروں کے

سامنے کرتا ہے۔
کے جاہل کے خیال اور عمل میں بہت کم وقفہ

ہوتا ہے۔
کے جو لوگ صبح کو فیصلے کرتے اور شام کو بھول

جاتے ہیں وہ زندگی میں کسی کامیاب نہیں ہوتے۔
کے جس شخص کے خیالات اور نظریات اچھے ہوں

وہ کبھی تباہ نہیں ہوتا۔
کے زیادہ خوش حالی اور زیادہ بد حالی دونوں برائی

کی طرف لے جاتی ہیں۔
کے زندگی کو سادہ مگر خیالات کو بلند رکھو۔

کے انسان کو باوصی کی طرح ہونا چاہیے کہ ہر کوئی
اس کے آنے کا انتظار کرے۔

کے عمل سے کائنات خیر ہوتی ہے لیکن لامکاں
تک پہنچنے کے لیے محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔

کے جو عالم اپنے علم پر عمل نہ کرے، ایسا بیمار ہے
جس کے پاس دوا تو ہے مگر استعمال نہیں کرتا۔

کے تباہی میں اپنے خیالات پر اور عمل میں اپنی
زبان پر قابو رکھو۔

رائے رکھتے ہیں کہ میں بہت سمجھنڈی ہوں، مگر وہ
ہوں شاید اس تاثر کی وجہ میری خاموشی سے کام
سے کام رکھنا اور ٹوڈی پوائنٹ بات کرنا ہے۔

سوال کے آپ کی ایک اچھی اور ایک بری
عادت کیا ہے؟

جواب کے اچھی عادت۔ آہ۔۔۔۔۔ شاید کوئی
بھی نہیں۔ ہاں اپنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ بری یہ

کہ کسی کا بھی دل نہیں دکھنا بول دیتا ہوں۔ بات
منہ پر کہہ جاتا ہوں جس وجہ سے لوگ برا مان جاتے

ہیں، ناالاں رہتے ہیں۔
سوال کے جو لوگ اس فیلڈ میں آنا چاہتے ہوں

ان سے کیا نہیں گے؟
جواب کے ان سے کبھی کہوں گا پھر سے کہ یہ

نو کری نہیں ہے اسے آپ پارٹ ٹائم اپنا نہیں بہت
سے لوگ اسے آمان کا اچھا ذریعہ سمجھ کر اپناتے ہیں

مگر بس یہ سمجھ لیجئے کہ اس سے آپ کا جیب خریق ہوتا
ہے ہاں آپ کو شوق ہے تو آپ اپنے شوق کی تکمیل

ضرور کیجیے اور اگر آپ اس فیلڈ میں آگے جانا چاہتے
ہیں تو ریلوے آپ کا پہلا اور اہم قدم ہے۔

سوال کے قارئین کے نام کوئی پیغام؟
جواب کے ریل آپ کے اور آپ ادارے کے

شکریے کے ساتھ قارئین سے نہایت ہی سہولت
التماس ہے کہ دوسروں کے بجائے ہمیں اپنی اصلاح

کرنی ہے خود پر محنت کرنی ہے ہمیں آئندہ آنے والی
نسل کی تربیت پر خاص توجہ دینی ہے محبت وطن،

منہذب اور ذمے دار شہری اس معاشرے کے
حوالے کرنے ہیں۔ آخر میں یہ بھی کہ۔۔۔۔۔

بڑا حسرت تو بڑا حاد و قار انسان کو
جو ہو سکے تو شکستہ دلوں سے پیار کرو

☆۔۔۔۔۔☆

مگر خود پر کوئی محنت نہیں کرتا۔ وہ کیا کہے اور کیوں
کرتا ہے سب اس میں رہتے ہیں میں کیا کرتا ہوں

یہ میں سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ ہمیں اپنا محاسبہ کرنا
ہے نہ کہ کسی کا اگر معاشرے کا ہر فرد دوسروں کی

بجائے اپنی اصلاح کرتا رہے تو ملک کیا پوری دنیا
میں امن ہو جائے۔

سوال کے اپنے کریزی فیکس کو کس طرح ہینڈل
کرتے ہیں؟

جواب کے ہا ہا۔۔۔۔۔ میں اپنے فیکس کا فین ہوں
کیونکہ وہ میری پہچان ہیں میری طاقت ہیں وہ نہ

سٹیں، میرا ہیں تو کیا حیثیت میری۔ سب کے ساتھ
پیار نرمی سے پیش آتا ہوں سب محترم ہیں میرے

لیے سب کے جذبات کی قدر کرتا ہوں، سمجھتا ہوں۔
سوال کے پسندیدہ رنگ، موسم اور خوشبو؟

جواب کے پچھن سے رنگوں سے کھیلنا آیا ہوں
ڈرائنگ میرا پسندیدہ مضمون رہا تو سب رنگ اچھے

ہیں مگر سفید اور سیاہ زیادہ پسند ہے۔ موسم بہار کا ہے
حد پسند ہے اور ٹی وی کی خوشبو پسند ہے گل داؤدی

اور گلاب کی بھی اچھی لگتی ہے۔
سوال کے گھر میں کتنے افراد ہیں؟

جواب کے ہم سات بہن بھائی ہیں پانچ بہنیں
اور دو بھائی میرا نمبر درمیان ہے اور امی ابو ہیں کل نو

افراد ہیں۔
سوال کے کس شخصیت نے سپورٹ کیا؟

جواب کے زندگی میں ہر وہ انسان جس نے
مجھے ڈی کر لیا ڈی مورالز کیا درحقیقت ان کا

ایسا رویہ میرے لیے آگے سے آگے بڑھنے میں مدد
گار ثابت ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کا بھلا کرے۔

سوال کے کوئی ایسی لفظ نہیں جو آپ کے بارے
میں پائی جاتی ہو؟

جواب کے میرے بارے میں اکثر لوگ یہ

اس ماہ کا فلسفہ

کبھی ہمارے ساتھ یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی پر بغیر سوچے کچھ اعتبار کرنے کو بھی چاہتا ہے ہمیں یقین ہوتا ہے کہ چاند اپنی روشنی کھوسکتا ہے، سورج اپنی گرمی کم کر سکتا ہے، موسموں میں رد و بدل ختم ہو سکتا ہے مگر ہمارا اعتبار نہیں ٹوٹ سکتا۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ہم کوشش کے باوجود ان کو نہیں بھلا سکتے۔ ان کی یادرات دن ہمارے ساتھ رہتی ہے مگر جب وہی لوگ ہمارا اعتبار توڑتے ہیں تو ہم بھی دست اور بے یقین سے ہو جاتے ہیں اور تمام عمر پھر پھر ورنہیں کر پاتے کہ اعتبار ایک بار ٹوٹ جائے تو پھر تمام عمر قائم نہیں ہوتا۔

شاملہ ملک۔ کراچی

اس ماہ کی ہری مرجیں

☆ آپ کو سب سے زیادہ کون سی چیز بری لگتی ہے؟

☆ فصاحت

☆ خوش کی بیماری سے بچاؤ کے لیے کب لکوانے چاہئیں؟

☆ آپ تو ابھی لکوائیں۔

☆ کسی کے دل میں اترنا ہو تو جو جوتے کہاں اتاریں؟

☆ جو جوتے کھیں بھی اتار دو، دھیان رہے کہ بارش میں بھیگے نہ ہوں ورنہ دل کچھڑ سے بھر جائے گا۔

☆ کیا آپ اپنے شوہر کے مستقبل کے بارے میں کچھ جانتا چاہیں گی؟

☆ قسمت کا حال بتانے والے نے ایک خاتون سے پوچھا۔

☆ کبھی نہیں اٹھائیں بولیں۔ مجھے تو بس آپ اس کے ماضی کے بارے میں بتادیتے۔

صباح۔ ہارون آباد

اس ماہ کی غزل

جو بھی مشکل کام تھا کرنا اچھا لگا
اس نڈی کے پار اترنا اچھا لگا
لفظوں میں تصویر بنا کر چاہت کی
اس میں رنگ معانی بھرنا اچھا لگا
ہم نے دیکھا اس کو ایک بلندی پر
اور وہاں پر اس کا ڈرنا اچھا لگا
وہ خوشبو کی صورت آکر پھیلاؤ تو
ہمیں بھی اپنا اور بھرنا اچھا لگا
جس رستے سے سارے لوگ پلٹ آئے
اس رستے سے مجھ کو گزرتا اچھا لگا
جس منظر پر دھیان کیا وہ ڈوب گیا
میری خشک آنکھوں سے جبر بنا اچھا لگا
سعد و غم کی صورت اس نے پیدا کیا
جس کو بٹنا اور ستورنا اچھا لگا
(سعد اللہ شاہ)

امیرین حیدر۔ اسلام آباد

اس ماہ کا قطعہ

اب کلا لعل زندگی کیا ہے؟
سایہ رحمت دوائی میں
فیض تہذیب پائے ہیں کیا کیا
پتھر پاک کی غلامی میں
راؤ تہذیب حسین تہذیب۔ رحیم یار خان

اس ماہ کے اقتباس

لذتیں وقتی اور ہنگامی ہوتی ہیں لیکن مسرتیں،
شادمانیاں مستقل ہوتی ہیں۔ لذتوں کا جسم سے تعلق
ہوتا ہے اور خوشیوں کا روح سے۔ شادمانی نفس اور
وجود سے ہٹ کر ہوتی ہے۔ یہ نفس سے جنگ کا دوسرا
نام ہوتا ہے۔ نفس سے جنگ روح کو روشنی عطا کرتی
ہے جب کہ غماشات کے آگے سر غم تسلیم غم کرنے
سے جسمانی لذتیں میرا آتی ہیں۔ روح کو ہالیدیگی

نہیں ملتی۔

اقتباس اشفاق احمد زاویہ 3 صاحب السیف صفحہ 282
ریما نور رضوان۔ کراچی

اشفاق احمد کہتے ہیں

میرا پہلا بچہ میری گود میں تھا۔ بارش میں بیٹھا تھا
اور مالی کام کر رہا تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔
”ماشاء اللہ بہت پیارا بچہ ہے۔ اللہ اس کی عمر دراز
کرے۔“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تمہارے کتنے
بچے ہیں؟“
وہ کہنے لگا۔ ”میرے آٹھ بچے ہیں۔“

جب اس نے آٹھ بچوں کا ذکر کیا تو میں نے کہا
”اللہ ان سب کو سلامت رکھے لیکن میں اپنی محبت کو
آٹھ بچوں میں تقسیم کرنے پر تیار نہیں ہوں۔“
یہ سن کر مالی مسکرایا اور میری طرف چہرہ کر کے
کہنے لگا۔ ”ساجد بی! محبت تقسیم نہیں کیا کرتے۔
محبت کو ضرب دیا کرتے ہیں۔“

اس ماہ کا مزاحیہ شعر

بھول گئے ہو اب تو بالکل سی ہمیں
کیا تیری یاد کے آگے بھی حکومت نے تسلیم لگا دیا؟
اشفاق علی۔ کراچی

اس ماہ کی پیاری باتیں

☆ جب سانپ زندہ ہو تو وہ جو خیاں کھاتا ہے
اور جب سانپ مر جائے تو جو خیاں اسے کھاتی ہیں
کدو قوت بھی بیکر بدل سکتا ہے۔

☆ ایک درخت سے کئی لاکھ ماچس کی تیلیاں بنتی
ہیں مگر ایک ماچس کی تیلیاں کی لاکھ درخت جلا سکتی ہے
تو

زندگی میں کبھی کسی کو مت ستانا شاید آپ
طاقت ور ہوں مگر مت بھولو وقت آپ سے زیادہ
طاقت ور ہے۔

ایمنہ رؤف، مصباح مسکان رؤف۔ جہلم

اس ماہ کی بات

آج کی سنہری بات: ذلت کی سی این جی سے
عزت کا پیروں دل بھتر ہے۔

دھنک ناز۔ کراچی

اس ماہ کے زعفرانی قطعات

چلن آلودگی نے اس طرح بدلا ہے دنیا کا
جو تھکا ہوا سال اپنے سچا ہوتے جاتے ہیں
بدن پہ جل کر کبھی مرض کی تھقیں کرتی ہے
ہمیں بستر پہ پھر رات بھر لیے لگاتے ہیں

☆☆

مالک نے ذائقہ تو نے پھر تو مارنے تھے
بھیں بھیں کی کچھ صدائیں گانوں میں ہو رہی ہیں
تو کر یہ بولا پھر تو مر چکے ہیں سارے
تھائیں ان کی آ کر گانوں میں رو رہی ہیں
اشفاق علی۔ کراچی

اس ماہ کی بے بسی!

کاش! میرے پاس ایسا کوئی ہنر ہوتا
میں جانے والے کو داپس لاسکتا
مگر میں بے ہنر ہوں اس کے کمال ہنر کے آگے
موت ہی موت کبھی ہے
زندگی کے آگے!

سعدیہ عابد۔ کراچی

اس ماہ کا سیب

”زندگی کی سب سے بڑی ہار کسی کی آنکھوں
میں آنسو آپ کی وجہ سے اور زندگی کی سب سے بڑی
جیت کسی کی آنکھوں میں آنسو آپ کے لیے!“
وریشا خان۔ حیدر آباد

☆☆



حضور اکرمؐ نے فرمایا

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے سوکھانے والے پر، سودینے والے پر، اس کے گواہوں پر اور اس کی تحریر لکھنے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔ (ابن ماجہ)

سیدہ نورینؓ - کراچی حضرت حسن بصریؒ کی کہتے تھے

☆ اے ابن آدم! تیرے لیے ایک دنیا کی زندگی ہے اور ایک آخرت کی۔ یعنی تو اپنی دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح نہ دے۔ اللہ کی قسم! میں نے ان لوگوں کو دیکھا جنہوں نے اپنی دنیا کو آخرت پر ترجیح دی کہ وہ ہلاک ہوئے۔ ذلیل ہوئے، برسا ہوئے۔

☆ اے ابن آدم! جب تیرے لیے آخرت کی بھلائی ذخیرہ کر لی تو دنیا کی جو تکلیف آئے وہ نقصان نہیں دیتی اور جب تو آخرت کی خیر سے محروم کر دیا گیا ہو تو کیا دنیا کی کوئی راحت تجھے نفع دے سکتی ہے۔

☆ اے ابن آدم! دنیا سواری ہے اگر تو اس پر سوار ہو گا تو وہ تجھے اٹھائے گی اور اگر تو نے اسے اٹھایا تو یہ تجھے مار ڈالے گی۔

عائشہ نیازی - ربوہ

لغظوں کی کریمیں

☆ غصہ کرنے کا مطلب ہے ہم دوسروں کی غلطیوں کا انتقام اپنے آپ سے لیتے ہیں اور یہ حق حیرت انگیز اور مستحکم خبر بات ہے۔

☆ علامہ دوسروں کی غلطیوں سے سبق سیکھتے ہیں جب کہ بے وقوف اپنی غلطیوں سے سبق سیکھتے ہیں۔
☆ دوست کمزور ہو جائیں تو دشمن خود بخود دوطاقت و رہو جاتے ہیں۔

دعک باز - کراچی

خوب صورت بات

☆ ایک اللہ والا فرمایا کرتے کہ جنت دو قدم پر ہے۔ کسی نے کہا: "حضرت جنت دو قدم پر ہے اس کا کیا مطلب ہے؟" فرمایا: "اے دوست! تو اپنا پیلا قدم اپنے نفس پر رکھ لے تیرا دوسرا قدم جنت میں پہنچ جائے گا۔"

نوشین - لاہور

فصیحہ نبیوش.....!

عباسی خلیفہ ابراہیم بن مہدی کھڑے پر گزر رہا تھا۔ ایک شخص مقتصد باللہ اچانک اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس نے ابراہیم کا ہاتھ چوما اور اپنے لڑکے کو آگے بڑھاتے ہوئے عرض کیا: "خلیفہ المومنین! میرا لڑکا ہارون ہے۔ آپ کا غلام۔"

ابراہیم نے حکم دیا کہ ہارون کو خزانہ عامرہ سے دس ہزار درہم دے دیئے جائیں۔ کچھ دنوں بعد ابراہیم معزول ہو گیا اور مقتصد باللہ خلیفہ بنا، مقتصد ایک روز اسی مقام سے کھڑے پر گزر رہا تھا۔ ایک شخص ابراہیم بن مہدی اچانک اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس نے مقتصد کا ہاتھ چوما اور اپنے لڑکے کو آگے بڑھاتے ہوئے عرض کیا: "خلیفہ المومنین! میرا لڑکا

کابیت اللہ ہے آپ کا غلام۔"

مقتصد باللہ نے حکم دیا کہ "کابیت اللہ کو خزانہ عامرہ سے دس ہزار درہم دے دیئے جائیں۔"

مقتصد باللہ عباسی خاندان کا آٹھواں خلیفہ تھا اور اپنے بھائیوں میں بھی آٹھواں تھا۔ اس نے آٹھ سال آٹھ مہینے اور آٹھ دن حکومت کی۔ اس نے آٹھ بیٹے چھوڑے اور آٹھ بیٹیاں چھوڑیں۔ اس نے خزانے میں اسی لاکھ دینار اور ایک سو اٹھارہ لاکھ درہم چھوڑے۔ اس نے آٹھ ہزار غلام اور اٹھارہ ہزار گھوڑے۔ اس نے آٹھ جنگیں جیتیں۔ وہ 227 ہجری ربیع الاول ختم ہونے سے آٹھ دن پہلے مر گیا۔

عباسی زمانے میں ایک دن ایسا گزرا ہے جس دن دولت شکیریوں کی طرح لٹائی گئی۔ اس دن خلیفہ مامون نے اپنے بھائی ابراہیم کو مغربی صوبوں کی گورنری بخشی اور پانچ لاکھ دینار دیئے۔ اسی دن مامون نے اپنے بیٹے عباس کو عرب اور بازنطینی کی سرحدوں کی نگہداشت پر مقرر کیا اور اسے بھی پانچ لاکھ دینار دیئے۔ اسی دن مامون نے عبداللہ بن طاہر کو خیال کا گورنر بنایا اور اسے بائیس خزی کے خلاف جنگ کا حکم دیا اور مامون نے لاکھ دینار عطا کیے۔ اسی دن اس نے اپنے چند فوجی سرداروں میں سات لاکھ دینار تقسیم کیے۔

وہی مامون جب مراٹھوں کی کوئی فرصت نہیں تھی کہ اس کی لاش کی طرف توجہ دیتا کیوں کہ ہر شخص نے غلطی کی تھی جنسوری میں لگا ہوا تھا۔ شاہی گل میں اس کے گفن تک کے لیے کپڑا نہیں تھا۔ مجبوراً کسی شخص نے اسے اپنا جامد اوڑھا دیا تھا۔

تاریخ میں ایک مثال ایسی ملتی ہے کہ ایک شخص جب ماں کے پیٹ میں تھا اسی وقت بادشاہ ہو گیا تھا۔ اس کا نام شاہور زوالا کثاف تھا۔ اس کا باپ ہرگز زینہ اولاد چھوڑے بغیر مر گیا تھا۔ امراء نے سلطنت کو حلوں تھا کہ اس کی بیویوں میں سے ایک ماں بننے والی ہے چنانچہ ان لوگوں نے فیصلہ کر لیا کہ

خواہ لڑکا ہو یا لڑکی اسے بادشاہ بنالیں گے۔ تین ماہ بعد کثاف پیدا ہوا۔ اتنا کم عمر بادشاہ پھر بھی نہیں ہوا۔ ایسی امتیاز احمد - کراچی

پھولوں جیسی باتیں

☆ کسی مسلمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ تلاش رزق میں بیٹھ جائے اور دعا کرے کہ اے خدا مجھے رزق دے۔ کیوں کہ تجھے معلوم ہے آسمان سے پانچویں سوٹا نہیں رہتا۔

☆ اپنے کسی اچھے کام پر غور نہ کرو۔ کیوں کہ کامیابی کا دار و مدار انسانی کوشش پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے لطف و احسان پر ہے۔

☆ اگر تم نیک اور قلمس بننا چاہے ہو تو شہنم کے قطرے کی طرح شفاف ہو جاؤ۔
☆ جو ہم ہاشمی بن چکا ہے اس پر غمگین اور افسردہ ہونے کا مطلب یہ ہے ہم ایک نئے کم کو محبت دے رہے ہیں۔ امیر ہاشمی - کراچی

سردار جی

☆ حرا سنگھ نے اپنے شوہر کو سنگھ کا قتل کر دیا۔ گرد سنگھ کے بیٹے بڑھو سنگھ نے میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا: "میں اب بھی شادی نہیں کروں گا اور آئندہ اپنے بچوں کو بھی یہی نصیحت کروں گا۔"

ریحانہ نور رضوان - کراچی

جو میری بات مانو!

اپنی زندگی کی ترجیحات طے کرتے وقت اپنی زندگی کو خوبصورت بنانے کے لیے ایسی زندگی جس کی سب مثال دیں، ضروری نہیں ہے کہ آپ کے پاس دولت کے ذخیرہ ہوں۔ ایک بڑے گھر میں ششے کی ٹیبل پر بیٹھے نہایت فلسفیانہ اعزاز میں آپ کوئی ماہرانہ رائے دے رہے ہوں اور اپنے ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو نواز رہے ہوں۔ آپ کے جسم پر نہایت قیمتی لباس ہو، کسی فقرے میں تمام لوگوں کی برسات لٹھ لٹھریں آپ کا طواف کر رہی ہوں۔ آپ

فریادِ بے گناہ

نکلتا تو جان لینا

یہاں یہ احساس کی کمی ہے
جو تم کو صوفیوں سے بھی نہ ملے گا
ہزار باری تم اپنا تھا پھوڑو
بے حسوں کی اس زمین پر
غزلیوں پہ ہی ہر سو
تمہاری نظر پڑے گی
ہزار باری جن کرلو
تم جس بھی دل کو
مختوں کی تلاش میں
ٹٹولو گے پرکھو گے
دل حسد سے بھرے ملیں گے

تمہاری جاہت

تمہاری محبت

کچھ بھی انسان کے دلوں کا اثر کرے گی

غبار لکھوں کے فسوں سے

نکلتا تو جان لینا

مریم ماہ خیر

غزل

محبت محبت کو پہچانتی ہے
وہ بھی تو اپنا جواب مانگتی ہے
ایسی محبت کا کیا اعلان کرنا
دل کی محبت تو نگاہ جانتی ہے

چہرہ تو چہرہ ہے کھلا ہے سب کے سامنے

حجہ باری تعالیٰ

اپنی دیران زندگی آباد کرنا چاہتی ہوں
میرے سوا میں تجھ سے یہ فریاد کرنا چاہتی ہوں
میری زندگی کی خامس (زینت) تیری بندی سے ہے
شام و صبح تیرے ذکر میں کھوئے رہنا چاہتی ہوں
آنکھوں سے نکلا ہوا سوتیری یاد میں بہانا چاہتی ہوں
میرے سوا تیرے ذکر پر تیری یاد میں رونا چاہتی ہوں
میرے سوا تیری مسکرت کا آج کل اڑھنا چاہتی ہوں
فقط تیری بندی ہو کر جینا چاہتی ہے ہانگی
میرے سوا تیری نصرتوں کے بدلے میں
ساری عمر مجھ کو شکر کرنا چاہتی ہوں

خلیفہ دوم حضرت عمرؓ

حق و باطل میں آپ نے فرق نمایاں کر دیا
جناپ عمرؓ نے اسلام کا یوں بالا کر دیا
مل گئی پھر نئی شوکت لہن خطاب کو
آقاؐ نے جب حصہ کو حرم کا گھر کر دیا
جس نے عمرؓ کی محبت سے جموٹی بھری اپنی
اس نے مومن ہونے کا مجموعہ ادا کر دیا
انہیں بھی جن کے غضب سے پناہ مانگے
رب نے قاروق کو ایسا جری کر دیا
ان کی عدالت میں ٹھہر گئے سب براہ
مومن انہوں نے انصاف کا نام اونچا کر دیا

ماہ فکرمون شاہ

نظم

خدا رکھوں کے فسوں سے

کے ذہن کی شفافیت اتنی گہری اور صاف ہوتی چاہیے
کہ آپ کا پہنا ہوا کھدر کا سادہ لباس (یاد رکھیے سادہ
معمولی نہیں) کسی بیش قیمت لباس میں ملیں خود پسند
وجود کے سامنے بھی پیکانہ نہ پڑے۔ اور ایسا ہو سکتا ہے!
ایسے امتیاز احمد۔ کراچی

کنز و بخرے

یہ ضروری نہیں کہ ہم مختوں کو پرندوں کی طرح
بھڑوں میں بند کر کے رکھیں یا بند کر لیں۔ وہ قید ہو ہی
نہیں سکتیں۔ رہنا ہو گا تو پرواز کی تمام تر صلاحیتوں
کے باوجود کہیں اور نہیں جائیں گی اور نہیں رہنا ہو گا تو
بھڑے بھی بڑے کمزور ہو جاتے ہیں۔
فرزانہ شوکت۔ کراچی

اقوال

☆ ہر کھوئی ہوئی چیز وہیں سے مل سکتی ہے جہاں
پر ہم ہوئی ہوسوائے انتظار کے۔
☆ انسان خوش رہنے کے لیے کماتا ہے اور
کمانے کے لیے افسردہ رہتا ہے۔
☆ زندگی کی کتاب پڑھ کر صرف وہی لوگ
کامیاب ہوتے ہیں جن کی توجہ اگلے باب پر ہوتی ہے۔
☆ ہمارا جائزہ اذیت ناک کسی گھر اس سے بھی زیادہ
اذیت ناک خود کو ہر وقت ہمارے یاد دلاتے رہتا ہے۔
دانیا آفرین۔ کراچی

مہمان نوازی

ایک آدمی پٹھان سے ملنے اس کے علاقے میں گیا تو
پٹھان اسے اپنا علاقہ دکھانے لگا۔ ایک جگہ پٹھان نے
مہمان سے کہا: ”یہاں پہنچے تو یہاں پہنچاؤں گا۔“
مہمان نے کہا: ”وہی تو تمہاری ہے میں کیوں
پہنچے ہونے جاؤں۔“

پٹھان نے کہا: ”اوپر ہم نے اس کا مہمان مارا
تھا وہ کہتا ہے ہم بھی تمہارا مہمان مارے گا۔“

ہاتھ امین۔ کراچی

کے قیمتی پرس میں موجود آپ کا کریڈٹ کارڈ اس بات
کا مظہر ہو کہ آپ کو کسی چیز کی کمی نہیں اور اپنی خوب
صورت انگلیوں میں موجود طلائی انگلیوں جو آپ کو
بے حد تسکین دے رہی ہیں اور ساتھ ہی کسی کو مرغب
کر رہی ہیں اور آپ اس تمام صورت حال سے نہایت
لطف اندوز ہو رہے ہیں تو معاف کیجیے گایہ طرز عمل صحیح
نہیں ہے۔ خوش رہنے کے لیے۔

بلکہ ان تمام لوگوں سے پوچھنا چاہیے جو ایسے
معمولی لوگوں سے مرغب ہیں۔ اس کے کپڑے
دیکھیے۔ کتنے زبردست ہیں یہ نہیں کتنے بڑا کاسٹ
ہے اور جیولری اف خدا کی قدر حسین ہے، کتنے خوش
نصیب ہیں یہ لوگ۔ یہ کیا بات ہوئی اللہ نے آپ
کو ایک عمل انسان بنایا ہے، ذہن دیا ہے پھر
کیوں اسے روشن نہیں کرتے، ایک مثبت اور حقیقی
سوچ کا امین کیوں نہیں بناتے۔ فرش پر بیٹھ کر کھانا
کھانے میں شرم کیسی؟ میں نے تو مٹی کے سادے
پیلے میں پانی پی کر دیکھا، یقین کیجیے کہ شیشے کے قیمتی
گلاس سے تم حرا نہ آیا۔ ڈزینٹ کی بیش قیمت رکابی
چھوڑ کر مال کے ہاتھ کے بنے پراٹھے پر دی رکھ کر
کھایا۔ دنیا میں اس سے مزید ارڈش کوئی نہیں لگی۔
اپنے چھوٹے سے گاؤں کے کچے کچے راستے پر اپنے
باپ کی انگلی پکڑ کر آتے جاتے ہر چیز کے بارے میں
ہی پوچھتے رہے۔ اور وہی زندگی کی بہترین ناچ بن
گئی اور گاؤں کے چھپر پڑے اسکول میں نیچے زمین
پر بیٹھ کر لکھتے لکھتے ہی یہ بین زمین پر گرے تو فوراً
آنکھوں سے لگاؤ۔ آگے بڑھتے چلے جاؤ گے تو ہم
گاؤں میں پہلے بڑے بس انہی چند چیزوں کو اپنا اثاثہ
بنائے شہر کے اس بے کراں جنگل میں جو آج بھی ہم تو
کسی سے مرغب نہ ہوئے کہ ہمیں ابتدائی تعلیم تو دی
ہوئی گاؤں کی کئی مگر تھی بے حد مضبوط۔ ہمیں سب
سے پہلے جو بات سکھائی گئی تھی وہ تھی ادب۔ اور
دوسری بات تھی اپنے ہی فیصلے کی عزت کرنا۔ آپ

بہت سے انسانوں کو دیکھو اس کو بھی کتاب کہتے ہیں
اس دل کو دیکھو اس پر تو پردہ پڑا ہوا ہے
بہت سے انسانوں کو دیکھو پردہ اٹھانا بھی جانتے ہیں

ہر انسان دوسروں سے چھپاتا ہے اپنی حقیقت
وہ اتنا نہیں بھٹکتا جیسے والے اس سے بھی ہیں آگے
یہ سچ ہی بہت بھٹکا اعلان کرتا ہے سب کے آگے
یہ غلطی پڑھ سکتا ہے اس کی کتابت
ہر عمل کی کتابیں پڑی ہیں سب کے آگے
کوئی سمجھانے سے اسی دم بھٹکتا ہے عمل سے
کوئی اچھٹا رہتا ہے بے چارہ سب کے آگے
فرخ سلطان

غزل

میں جو تیری ذات کے بحر میں گرفتار ہوں
بس محبت کرنے کی خطا کا میں ٹھہرا سزاوار ہوں
رہا ہوا ہوں جہاں بحر میں تہماری خاطر جاناں
تیری اک نگاہ لطف کے لیے دیکھ میں کتنا خواہوں
تہماری پہچانتائیں میری جان لے لیں کسی کی روز
نہ سمجھ بے حس مجھے اپنی طرح میں آدمی بڑا کمزور ہوں
چڑھا دو سولی مجھے چاہے کڑی سے کڑی سزا دو مجھے
میرے کردار کو نہ پرکھ لیں مٹا کر محبت کا گناہگار ہوں
شک آلودہ لگاؤں اٹھ رہی ہیں جو میری جانب بخاری
بھری بزم میں وہ کہہ رہے ہیں سب سے میں بڑا بکرہ ہوں
مریم شاہ بخاری

نظم

تیرے پیار کی خوشبو
میری زندگی میں
ہر سو بھری ہوئی ہے
تیرے پیار کی خوشبو
مجھ سے وابستہ ہر رشتے
پر حاوی ہو گئی ہے
تیرے پیار کی خوشبو

میری زندگی میں کھل گئی ہے
تیرے پیار کی خوشبو نے
چھینا سکھا دیا
جینے کا ڈھنگ سیکھا دیا
تیرے پیار کی خوشبو میں
میں ہو کر میں اپنے پیارے میں
کفر و اموش کر گئی
تیرے پیار کی خوشبو
رب صدا سلامت رکھے
تیرے پیار کی خوشبو سے
لو کہ وہی میرا جیون میں
(آمین)

ریحان نور رضوان

تم وفا کرنا

اس قدر کی وفا دے کہ ہمیں پرانا نہ کرنا
دیکھو ابھی بتا دو ہم کو بے وفا نہ کرنا
ہمیں اعزاز مٹھلو پسند آتے ہیں تیرے
دیکھو انہی لافوں کے دہر بار بار نہ کرنا
میرے دل کے انگن میں بہت دوش ہے تیرے پیار کی
دیکھو تم اس کے اندر آکر اندھیرا نہ کرنا
اجازت مل بھی جائے مگر تجھے اس دل ناہان کی
دیکھو سچ راستے میں چھوڑ کر ہمیں رستا نہ کرنا
اس قدر جو طالب اعتبار ہے تجھے مل بھی جائے گا
دیکھو لذت میں لیکن خیانت نہ کرنا
زارا صدف قر

نظم

نہیں بھی کیسی چورچی
اکٹھ میری رات چرائی تھی
وہ جو تم سے ہو سکتی تھی
ساری بات چرائی تھی
رب سے تجھ کو مانگنے والی
ہر اک ساعت چرائی تھی

اچھا کیا جو وقت رخصت
تم اس چور کو لے گئے ساتھ!

ریمل آرزو

غزل

ان آنکھوں سے ہی ابتداء ہے
ان آنکھوں سے ہی انتہا ہے
پھول و خوشبو حسن سے حزن
جلوہ گر ہے وہ گلابی آنکھیں
اگر دیکھ لوں ایک بار تو
ذوق ہی چلی جاؤں ان میں
سندھ سے بھی گہری ہیں وہ
جھلکتی آب حیات سی آنکھیں
جھکا لو سر زدہ نگاہیں کہ پھر نہ کہنا
کیوں تھی رتی ہو تادیب یہ آنکھیں
ان سانسوں کا راز ہی تو ہے فلک!
زندگی کو سایہ دیتی تہماری آنکھیں
خیر جھلکتی دھوپ نما سے سفر میں
مجھے سنبھالے مرہم سی تہماری آنکھیں
ابھی فقط چند اشعار ہی جتے ہیں میرے
داستان محبت ان کتابی آنکھوں پر
ستاروں کی مانند کشف بھری تھی
ان چمکتی چاند سی آنکھوں پر
روک لو مجھ کو میرے ہراز
کھیں کتاب نہ لکھ لوں
میری زندگی کا سکون ہے
مقصود عبادت بھری تہماری آنکھیں

مدیحہ اعجاز حسین

غزل

برے نصیب تھے سب مجھ کو کر گیا سائیں
جس کو چاہا تھا میں نے چھوڑ گیا سائیں
سدا جو ساتھ بھانے کی بات کرتا تھا
کہاں ہے آج وہ جانے کدھر گیا سائیں

مرے فراق میں رات جو ترپتا تھا
نظر بچا کے وہ مجھ سے گزر گیا سائیں
مجھ کو درد محبت سے آشنا کر کے
بڑے آرام سے وہ خود سدھ کر گیا سائیں
وفا نصیب ہو دنیا میں بالداروں کو
میں ہوں غریب تو شاید کر گیا سائیں
ہے بے وفا سے محبت کا یہ صلہ چیدر
میرے ہیں پیار کے چپے کدھر گیا سائیں

حمید حیدر اعوان

غزل

سنو کہ وعدہ بھانے کوئی نہ آئے گا
نئے گلاب اگانے کوئی نہ آئے گا
سندھوں پہ مجھ سے بڑی حماقت ہے
لیوں کی پیاس بجھانے کوئی نہ آئے گا
ذرا سخیل کے پلو راستہ نہیں ہموار
جو گر گئے تو اٹھانے کوئی نہ آئے گا
تری طرف ہیں زمانے کی منتیں نظریں
جو سو گیا تو جگانے کوئی نہ آئے گا
سحر تک تو حفاظت کرو چرخوں کی
تہ بچھ گئے تو جگانے کوئی نہ آئے گا
تھیں مٹانے کی کیوں چارو ہیں تدبیریں
مگر یہ راز بتانے کوئی نہ آئے گا
ہمارے بعد زمانے کو اے امتیاز
حدیث عشق سناتے کوئی نہ آئے گا

ایس امتیاز احمد

نظم

ترجی ہے
ترجائی ہے
محبت
عالم ہے تجھ ہی
ایسی
بے شکلوں کی

مصل کو
لٹکانے پر
لگاتی ہے

نور العباء

اے خدا!

سن ذرا

میری دعا

ایر کرم

انتا ہر سا

انتا ہر سا

کہدلوں کی ساری فرتیں

دلوں کی ساری کدورتیں

دھل جائیں

اور ان کی بیکہ

مچھڑوں کی

چاہتوں کی

مٹی کو پھینک

پھوٹ آئیں

تو کیوں نہ کانٹوں کو پھر میں گلاب لکھوں گی؟
سدرہ شاہین

معصوم دعا

محبت

دیکھو جب محبت پھڑپھڑ جائے

تب کوئی مال مت کرے

کوئی شکایت نہ کرے

یہ ایسی ہی ہوتی ہے

ہاتھوں سے پھل جاتی ہے

پھر بہت رلاتی ہے

یاد دین کے جیون پھر سنا دیتی ہے

اے سنبھالنا پڑتا ہے

آپ وفا کا پھڑکاؤ کرنا پڑتا ہے

کہ کہیں اس کا پودا مر جانا نہ جائے

محبت اک نازک شے ہوتی ہے

اگر ٹوٹ جائے

پھر کبھی نہیں جڑتی

محبت روکھ جائے تو

پھر کبھی نہیں ملتی

ساری زندگی بچھتا پڑتا ہے

دانیا آفرین

غزل

افسانہ غم دل پر کتاب لکھوں گی
تمہارے نام اس کا احتساب لکھوں گی
لکس لکس پہ میرے ہو گیا تیرا احسان
اے سوز جاں اچھے عزت تاب لکھوں گی
میں دل کی بات بھی تم سے کہ نہیں پائی
جو دیکھے تم پھر سارے وہ خواب لکھوں گی
جہاں خوشی تھی وہاں اب کسک ہی باقی ہے
میں ٹوٹے دل کا ہی اب تو عذاب لکھوں گی
کسی کے دکھ سے ہے شاہین تھی حیات میری

نظروں سے حکیم اس کو گرا دیتی ہے دنیا
حکیم خان حکیم

غزل

کہیں پھول مجھے تیری یاد میں
کہیں درد ملا تیری صدا میں
کوئی بھنگ گیا ہے منزل سے
وہ پہلے سا رنگ نہیں تھا میں
شرمندہ ہوں میں بھی تیری طرح
کوئی راحت نہیں ملتی اب وفا میں
غم ستائے گا ہر بحر تیرا ہمیں
جیسے کوئی دیوانہ پھرتا ہو صحرا میں
کسی کی نظر سے عیاں ہے اداسی جاوید
شیخ جے پھر کوئی کیسے تیز ہوا میں
محمد اسلم جاوید

وہشت اور اسلام

جیسے ڈھونڈتی ہوں ہر قدم

وہ رہتا کہاں میں

میرا ملک ہے پورا وہ نشان کہاں میں

جہاں روشنی کی کرن ہو

کہاں ڈھونڈوں میں وہ راستہ؟

جہاں مل سکیں ہمیں منزلیں

یہاں ہر جگہ اندھیر ہے

کسی سوچتی ہوں میں

وہاں سے درمیان کون ہے یہ؟

ڈھونڈتی ہوں ہر جگہ نہ ملے مجھے دشمن میرا

کون ہے تو؟

اور کون ہوں میں؟

جو میں کہتی ہوں یقین سے

کیا تجھ کو بھی یقین ہے

میں تو ہوں مسلمان

کیا ظالم تیرا بھی یہی دین ہے؟

اداس موبسوں میں
اداس موبسوں میں

تیری یاد

روشنی کی امید لے کر آتی ہے

جیسے کسی مرنے والے کے لیے

دعا زندگی بن کر آتی ہے

محبت میں ہم بھٹکے ہوئے دیوانوں کو

وفا کی ضرورت ہوتی ہے

کیا کریں کہ

دنیا میں جینے کی بس

یہی ایک صورت ہوتی ہے

آج کی تجدید یکہ کردہ کی ہے

کہ

میرے سامنے پھر ماضی کی کتاب رکھی ہے

آج پھر یہ سوچ کر

گھر سے نکلتا نہیں

کہ وہ بے وفا خود غرض

آج بھی ملنا نہیں

کاش یہ میری تہائی

کوئی خواب ہوتی

تم ساتھ ہوتے

پھر چاہے زندگی عذاب ہوتی

کہ

ساون کی بارشوں میں

جانی سردیوں کی شاموں میں

تمہاری کی محسوس ہوتی ہے

اور آنکھوں میں جیسے

ہمیشہ جم جانے والی

نئی محسوس ہوتی ہے!

زیرِ مہیار

سنہری سی

قبر و شمع..... کراچی

السلام علیکم! تمام اساتذہ کو، لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو میرا پر خلوص سلام اور پیار۔ سب سے پہلے تو آتے ہیں شازیہ مصطفیٰ کی طرف آپ کی اسٹوری کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپ کی ہر نئی اسٹوری پہلے سے بالکل الگ اور منفرد ہوتی ہے۔ آپ کو جتنی داد دی جائے کم ہے مجھے آپ کی ہر اسٹوری پر سلی بہت پسند ہے۔ نانکھ طارق آپ کی تو کیا بات ہے۔ ردا کی جان "جو شمع میں جیتی وہ شمع ہی جانتے" ہر کردار انمول اور نگینہ کی طرح انگوٹھی میں فٹ۔ اس کے علاوہ بہت سی نئی رائے زسانے آرہی ہیں۔ کسی ایک کی تعریف کرنا دوسری رائے کے ساتھ زیادتی ہے۔ اس لیے سب نے بہت اچھا لکھا ہے جس میں ابھی جو اور بہت اچھی ابھر کے آئی ہیں روشنائی، ہمد احمد، یاسمین آفریدی، دانیہ آفرین، اسویرہ ملی اور بھی سب نے بہت اچھا لکھا ہے۔ اس کے علاوہ سندھیے میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ مجھے اچھا لگتا ہے جو میرے بارے میں تعریف کرے یا تنقید کرے، دونوں سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ میں آپ لوگوں کی دل سے ماضی قدر کرتی ہوں بلکہ بہت پیار بھی کرتی ہوں۔ سندھیے میں خط لکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ میری چھوٹی سی بیٹی ذہان نے مجھے بہت مصروف کر دیا ہے۔ آٹھ ماہ کی ہوئی ہیں جب کچھ لکھنے لگتی ہوں ہاتھ سے قلم کاغذ چھین لیتی ہیں۔ خیر یہ تو چل رہا

ہے مگر ایسا بالکل نہیں کہ میں سندھیے نہیں پڑھتی ہر خط بخور پڑھتی ہوں آپ سب کا بہت شکریہ اب اجازت چاہوں گی، مئی امان اللہ!

افشاں علی..... کراچی

بہت سی دعاؤں، محبتوں، چاہتوں اور عقیدوں کے نذرانے لیے افشاں ملی ایک بار پھر سے شامل محفل ہے۔ تمام پڑھنے والی خوب صورت آنکھوں اور مسکراتے چہروں کو افشاں ملی کا پیار بھرا سلام قبول ہو۔ چار سو جہاں آہ بہار ہے فضا میں خوب صورت و پیارے پھولوں کی خوشبو رہتی ہی ہے، وہیں اپریل کے رونے بھی تمام رنگ بکھیر دے۔ ماہ اپریل کے شمارے میں بہار کے رنگوں سے لکھے افسانے، ناولٹ و ناول تھے تو وہیں پھولوں کی طرح مہکتی خوشبو بکھیرتی ہماری پیاری سی صالحہ ایبیا کی "گوشہ آگئی" تھی اور ساتھ ہی خوب صورت سے مستقل سلسلے جنہوں نے دل و آنکھوں دونوں کو ہی خیرہ کر دیا۔ دل چھوٹی مسکراہٹ کے ساتھ عشاء نور سرورق پر نظر آئیں۔ پیار بھرا "گوشہ آگئی" اور ایمان افروز "ردائے جنت" سے مستفید ہو کر آگے بڑھے تو معلوم ہوا اس بار شازیہ مصطفیٰ اور قمر و شمع کی ناول کی اقساط شامل نہیں، بہت کمی سی محسوس ہوئی۔ دل اداس ہو چلا تھا کہ نانکھ جی کے خوب صورت دل لہجے سے شمع سے بھر پور ناول کی یہ قسط پڑھ کر کافی حد تک اداسی کے بادل چھٹ گئے۔

نانکھ جی آپ کا یہ ناول باقی ناول کی طرح بہت عمدہ جا رہا ہے۔ بہت جلد خرمن اپنے پتھر شمع کو پہچان جائے گی جب کہ ایک کا انداز ظاہر کرتا ہے کہ شازیہ وہ یہ راز جان چکا ہے۔ بہر حال ناول بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ جب سے یہ جانا کہ "تم مجھے اچھے لگتے ہو" اور "مجھےیں مجھ سے محبت ہے" بس تب سے "محبت زاد راہ بنی"، "بیت گئے وہ پل"، جب نا آشنا تھے اب تو ہم جان گئے کہ "گھر اور گھر" کی اہمیت کیا ہے۔ یہ گئے "انو کے رشتے" ہیں "نفرت سے محبت تک" وہیں یہ جانا کہ "رشتے دنوں کے محتاج نہیں"، "پہلا قدم" لیا تو جانا کہ "ایک خدا پر یقین" ہی ہماری "تقدیر" ہے۔ سحرش قاطرہ، کائنات غزل، عاصمہ عزیز، امراء سیف اس ماہ آپ سب شامل فہرست رہیں۔ رضوانہ آفتاب کا مکمل ناول بھی خوب رہا۔ اقراء چنانے بھی بہت اچھا سبق دیا۔ ان لوگوں کو جو ماں باپ کے بڑھاپے میں ان کا سہارا بننے کے بجائے انہیں دھکا کر دیتے ہیں۔ گھر اور گھر واقعی بحرین نے بجا فرمایا کہ گھرنے کے لیے مگر کی ضرورت پڑتی ہے۔ طاہرہ حسن کا مکمل ناول بھی خوب صورتی کے ساتھ مکمل ہوا۔ ناول بہت زبردست رہا۔ پیاری سی نوک جھونک اسلام کی محبت چکا تا خوب صورت ناول تھا۔ اب بات ہو جائے باقی سلسلوں کی "اس ماہ میں" سے بھی پسند آیا۔ "خوشبو" بھی بھری سی نظر آئی۔ "ذرا پھر سے کہنا" میں حافظہ مون شاہ، نضب شاہ، رینا نور رضوان، شمیمہ فاضل، نور العیاد، دانیہ آفرین، شام کنول اللہ دتہ کی شاعری پسند آئی۔ "سندھیے" میں اس بار کافی رونق نظر آئی۔ پیاری فریہ و فریہ نوازش آپ کو میرا سندھیہ پسند آتا ہے۔ ریمیل آرزو و شمیمہ فاضل اپنی محبتوں میں یاد رکھئے گا

شکریہ۔ سوئیٹ دانیہ بہت شکریہ میرے قلمی سفر کے چار سال مکمل ہونے پر آپ نے یاد رکھا فریٹ ضرور ملے گی اس کے لیے آپ کو گھر آنا پڑے گا (ہا ہا ہا)۔ ان چار سالوں کی کامیابی کا کریڈٹ صالحہ ایبیا کے نام ہی ہے جنہوں نے ردا میں میری تحریروں کو جگہ دے کر میرا حوصلہ بڑھایا۔ میں بہت مشکور ہوں آپ کی۔ "سندھیے" میں فریہ و فریہ، رینا نور، دانیہ آفرین اور کیتی آرا کے تبصرے اچھے رہے۔ ڈیٹر عانیہ نیازی، نور بانو، دھنک ناز، مباحہ فرزادہ شوکت، امیرین حیدر، مباحہ عبدالغنی، زاہدہ ہاشمی آپ سب کی کمی سندھیے میں بہت محسوس ہوتی ہے اور اسٹوری آفتاب سسز کی بھی۔ "مکین" اور "سنگھار" بھی ہر باری طرح خوب سجا۔ انشاء اللہ پھر حاضر محفل ہوں گی تب تک اپنی دعا میں اپنی محبتوں میں افشاں ملی کو یاد رکھیے گا۔

گیسی آراء..... کراچی

پیاری آپنی السلام علیکم! اور سب ٹھیک شاگ۔ چھاپریل کو ردا ملا۔ دیکھ کر آنکھوں کو یقین نہ آیا کہ اتنا وقت پر اولہ کیا بات ہے آپنی۔ پیاری آپنی مح وقت پر پہچانے کا شکر۔ اب بات ہو جائے اس ماہ کے ردا کی تو جنتاب "گوشہ آگئی" سے گزر کر "ردائے جنت" میں داخل ہوئے تو ایمان کے مسائل اور دوسرے کامیابی کی باتیں دل میں گھر کر گئیں اور اب پیاری جی رضوانہ آفتاب کے ناول "اچھے لگتے ہو" جسے پڑھنے کے بعد ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ طاہرہ جیسے لوگ صرف کہانتوں اور فکروں میں ہوتے ہیں۔ تھینہ بانو "انو کے رشتے" واقعی میں ایک انگوٹھی اور دلچسپ تحریر رہی۔ اب پیاری جی آسیہ مجید کے افسانے "نفرت سے محبت تک" جو کہ عام تحریروں سے تھوڑا بہت کرختی سی لگی۔ بحرین کی "گھر اور گھر" میں ہر صورت میں گھر بسانے اور بھنا

کرنے والی لڑکیوں کے طور پر چلتے سمجھا دیئے۔ بہت خوب امداد یہ عمران کے ناول کا عنوان دل میں اتر گیا۔ ”رشتے دنوں کے محتاج نہیں۔“ عرش قاطر۔ ہمارے جذبات و خیالات کو گفتگو کی زبان دے کر دل خوش کر دیا۔ کائنات غزل کا ”پہلا قدم“ اپنے اندر ڈھیروں تجسس لیے ایک دلچسپ بہترین تحریر تھی۔ عاصمہ عزیز کی ”بہی تقدیر کی“ تقدیر کو نبھانے والوں کے لیے ایک بہترین سبق آموز کہانی تھی۔ ”محبت زاد راہ بنی“ ایک اداس کہنے والی تحریر تھی۔ ”مجھے تم سے محبت ہے“ بھی ایک اچھی منفرد تحریر تھی۔ گو کہ اس ماہ تمام ناول، ناول اور افسانے انفرادیت کا رنگ لیے خاصے دلچسپ رہے پڑھ کر کہیں بھی بوریت کا احساس نہ ہوا۔ ”ردا کی ڈائری“ کے سبھی انتخاب اچھے تھے۔ ”اس ماہ میں“ اور ”خوشبو“ ہمیشہ کی طرح بہترین رہا۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ میں تمام شاعری بہترین تھی۔ خاص کر مومن شاہ و منیب شاہ، شہلا گل، فرزانہ شوکت، شہید فیاض، شام نول خوب لکھا۔ ”سندے“ میں افشاں علی ہمیشہ کی طرح اس بار بھی بازی لے گئیں۔ فریدہ فرید آپ نے مجھ ناچ کو کسی قابل سمجھا بہت شکر یہ۔ بس آپ ہیں تو ہم ہیں۔ ”دوستوں کے نام پیغام“ میں مدح و تجاویز کی باتیں اچھی لگیں۔

عائشہ نیازی..... دیوہ
السلام ملکہ آبی! قارئین و رائٹرز اور پڑھنے لکھنے والوں کو۔ بہت عرصے بعد ردا کی محفل میں شامل ہو رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سب لوگوں نے مجھے مس کیا ہوگا۔ ماشاء اللہ کچھ عرصے سے سندے کی محفل میں رائٹرز و قارئین کی شرکت نے اس محفل کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ آپ یقین کریں اب میں ردا ہاتھ میں لیتے ہی پہلے فہرست پر نظر ڈال کر سب سے پہلے سندے پڑھتی ہوں۔ سندے میں سب کے بھرے بہت اچھے ہوتے ہیں اور

خاص طور پر افشاں علی تو بہت کمال تیرہ کرتی ہیں۔ چلیں اب بھرے کی جانب چلتے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے میں بہت سی نورا نثر نے ردا میں سولیت اختیار کی ہے اور ماشاء اللہ سب بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ اس کے علاوہ شازیہ آبی اور قمرش آبی تو ردا کی جان ہیں۔ شازیہ آبی کے ناول میں مجھے جو کردار سب سے زیادہ پسند ہے وہ ہے رضوانہ ضمران لوگوں کی اسی کا۔ انہوں نے بہت مشکل حالات میں اپنے بچوں کی بہترین پرورش کی۔ وہیں حباب اور خوشنما بھی مجھے بہت پسند ہیں۔ قمرش آبی کے ناول کے نام ہمیشہ منفرد اور اثر رکھنے کرنے والے ہوتے ہیں۔ جیسے ”تیرے پیار کی خوشبو“ اف کیا خوب صورت ناول اور کردار ہیں پڑھتے ہوئے کسی ظلم اور سحر کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ قمر آبی کے ناول اور کردار بہت روانہ لگتے ہوتے ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ نائیکہ آبی آپ کے ناول کی یہ قطع بہت سے انگشتاقت لیے ہوئے تھی۔ اب دیکھنا ہے کہ قمرن تمام حقیقت جان کر کیا ریائیٹ کر رہی ہے۔ محفل ناول میں شیوں ناڈر اچھے تھے۔ رضوانہ آفتاب نے بہت خوب لکھا اور اقراء سیف نے بھی۔ طاہرہ حسن کا ناول بھی اختتام کو پہنچا اچھا رہا۔ افسانے بھی اچھے تھے مشکل سلسلوں میں ”خوشبو“ اور ”اس ماہ میں“ بہت اچھے ہوتے ہیں اور ”دوستوں کے نام پیغام“ تو مجھے بہت پسند ہے اس بار میں نے بھی سب کو ایک پیغام بھیجا ہے تھینا سب کو اچھا لگے گا۔

رابعہ افضل خان..... سکراچی
سویت سی صالحہ آبی پیاری نورین ملک اینڈ رائٹرز و قارئین بہنوں کو رابعہ افضل خان کا محبت کے مہکتے تر و تازہ گلہ سے سے سچا سلام محبت قبول ہو۔ اپریل کا شمارہ جب ہمارے ہاتھوں کی زینت بنا تو دل خوش ہو گیا۔ سرور پر موجود پیاری سی

مسکراہٹ کے ساتھ عشاق بہت کیوٹ لگی۔ ”کوشہ آگہی“ اور ”ردائے جنت“ سے فیض یاب ہونے کے بعد اس ماہ کے اکلوتے سلسلے دار ناول کی طرف بڑھے۔ نائلہ طارق یا رکیا بات ہے تمہاری رضوانہ آفتاب اچھے لگتے ہو۔ واقعی میں بہت اچھی تحریر تھی۔ طاہرہ حسن جیسے مجھ سے محبت ہے۔ اینڈ پڑھ کر حزمہ آگیا۔ افسانے میں اقراء چنا، آسیہ مجید، سحر بینین عرش قاطر، کائنات غزل، عاصمہ عزیز سب ہی نے اچھا لکھا۔ کسی ایک کی تعریف نہیں کر سکتی۔ ماریہ عمران کا ناول ایک خدا پر یقین موضوع بہت اچھا تھا۔ تہینہ بانو کا ناول انوکھے رشتے اچھی تحریر تھی۔ ”محبت زاد راہ بنی“ اقراء سیف کی تحریر دلچسپ تھی۔ ”ردا کی ڈائری“ سے صافنی کی نظم اچھی لگی۔ ”اس ماہ میں“ عائشہ نیازی کی اطلاع کشش کی پڑھ کر بے اختیار لیوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ایسے اعتبار احمد کی لکھی محبت دعا نے آنکھیں نم کر دیں۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ میں سب ہی کا کام بہت اچھا لگا۔ کسی ایک کی تعریف کرنا مشکل ہے۔ ”سندے“ میں افشاں علی، فریدہ فرید، ملالہ اسلم کا تیرہ اچھا لگا۔ سویت افشاں علی میری خوشی کا اتنا خیال کرنے کے لیے شکر یہ۔ ملالہ اسلم مجھے بھی بہت اچھا لگا اور بے حد خوشی ہوئی کہ میرے جواب دینے سے آپ کا دل بھی خوش ہو گیا۔ صبا عبداللہی آپ کہاں غائب ہو گئیں۔ ”کوشہ جہنم“ میں اپنا نام دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ صالحہ آبی ایہ آپ کی محبت ہے جو آپ ہم سب کو یاد رکھتی ہیں۔ آپ کا پیار ہی ہمیں آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ ”دوستوں کے نام پیغام“ میں ملالہ اسلم میری وجہ سے افسردہ ہو گئیں۔ یہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ نیکس نام نہیں مٹائیں گئے سے گریز کروں گی۔ اب اپنی افسردگی ختم کر لینا یا (میری وجہ سے کوئی افسردہ ہوں یہ مجھے ہضم نہیں ہوتا) فریدہ فرید میری اتنی تعریف کرنے

کے لیے شکر یہ آپ خود بھی بہت سولیت ہیں۔ یہ آپ سب لوگوں کا پیار ہے جو مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ اس پیار کو اور ساتھ کو ہمیشہ یوں ہی بنائے رکھیے گا۔ ”مجن“ میں موجود سب ہی ڈشز زیر دست تھیں۔ صالحہ آبی! آپ کے لیے ڈھیر ساری دعائیں اس کے ساتھ ہی سندے کی پروفٹی محفل سے رابعہ افضل خان کو اجازت اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گی، ماشاء اللہ۔

سحر بینین..... فیصل آباد
آداب! پیاری اور کیوٹ سی ایسا ٹھیک ہیں؟ تھینا ٹھیک ہی ہوں گی۔ (یار دل کو دل سے راہ ہوتی ہے ہاں۔ ہا ہا ہا) بہت دفعہ ”سندے“ لکھا مگر افسوس کسی نہ کسی وجہ سے بھیجا ہی نہ جاسکا۔ سب سے اہم مسئلہ تو یہی ہے کہ ڈائجسٹ ہمیشہ مجھے تب ہی ملتا ہے جب سندے کی آخری تاریخ بھی نکل چکی ہوتی ہے۔ ہمیشہ افسوس رہتا ہے۔ اس محفل میں شامل نہ ہونے پر۔ آئی صالحہ آپ جو ردا کی کالی گھر بھجواتی تھیں وہ بھی اکٹھے چمکے ڈاک کی مہربانی کی بدولت 14 تک ہی ملتی تھی اور پھر پڑھتے ہوئے مزید دو دن گزر جاتے۔ خیر اس دفعہ بہت (ڈھیر ساری) مصروفیت سے وقت نکال ہی لیا ہے۔ ماشاء اللہ سے سب نے پرانے رائٹرز اچھے ہیں اور اچھا لکھ رہے ہیں۔ شازیہ، نائلہ، قمرش، صائمہ آبی سبھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ ایمان علی، افشاں، عائشہ، مہرین، نول، مومن شاہ، ایمان، مامبر، ریل، مٹا، حنا، شاہدہ، مدیحہ، یاسین، روشانے آپ سبھی اچھا لکھے ہیں۔ جو نام رہ گئے معذرت، او کے خدا حافظ۔

دے سکی۔ میں اکثر خط لکھنے میں دیر کر دیتی ہوں۔ بقول منیر نیازی کہ ”ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں“ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے آپ لوگ یاد نہیں آتے میرے غلوں پر کبھی شک نہ کریں اور میڈم صالحہ اکثر کہتی ہیں خط لکھیں، غور نہ کریں آپ ٹھیک کہتی ہیں میڈم آپ سب یقین کریں غور نہ کریں کوئی بن ہی نہیں ہے مجھ میں مجھے تو سوچ کر ہنسی آتی ہے میں اور مغرور! خیر افشاں علی، عائشہ نیازی، رابعہ افضل، ریمہ نور خط لکھا ہوا جائے گا اگر میں نام لکھوں یقین کریں مجھے سب کے نام یاد ہیں میں کیا ہوں مگر یہ سب کا ہر ماہ میرا خط نہ بھی ملے تو آپ میری حاضری لگائیں۔ آپ سب کی وجہ سے میں لکھ رہی ہوں میرا ساتھ دیں میں بھی آپ کو نہیں بھول سکتی۔ آخر میں ایک گزارش میرے مانا ابو کی طبیعت ان دنوں بہت خراب ہے۔ آپ سب ان کے لیے دعا کریں کیا معلوم کئے وجہ قبولیت مل جائے۔ پلیز میری پیاری دوستوں خوش رہو صدا اللہ حافظہ اور ہاں سننے لکھنے والے بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔

صبا عبد الغنی..... کراچی
تمام قارئین روا، رائزہ، ریڈرز، اشاف، صالحہ آپنی اینڈ نورین ملک کو پیاری سی باری ڈول کا پیارا سا سلام پر غلوں قبول ہو۔ امید ہے آپ سب نے مجھے مس کیا ہوگا (خوش فہمی، پتا ہے پتا ہے) معصوفیت کے باعث جنوری سے غیر حاضری۔ معذرت چاہتی ہوں لیکن اب اپنی آنکھیں کھولیں اور ہمارا سندسہ ملاحظہ کریں۔ سب سے پہلے ”گوشہ آگہی“ صالحہ آپنی! کیا کھولیں تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ بہت شاعرانہ ہوتے ہیں آپ کے الفاظ، ساتھ ہی دل اداس ہو گیا یہ دیکھ کر کہ ہم سب کے پسندیدہ ناولز اس بار شامل نہیں تھے۔ قمرش آپنی کے ناول کی قطعہ کا بہت بے مبری سے انتظار کیا تھا مگر خیر کوئی گل نہیں جی۔ ”جو عشق میں

ہمیں وہ عشق ہی جائے“ ناول جی! آپ کا تو نام ہی کافی ہے۔ ”ایٹھے لگتے ہو“ رضوانہ جی! اتنے دنوں کے بعد حاضری اور وہ بھی اتنے اچھے ناول کے ساتھ دل خوش کر دیا۔ ”تمہیں مجھ سے محبت ہے“ طاہرہ حسن جی! پڑھ کے بے ساختہ دل سے دعا نکلی کہ ”کاش! ہمارے بھی پاس ایسے ہوتے“۔ یہ تو تھا مذاق ورنہ کچھ کھوں تو میرے پاس تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں مجھے بہت پسند آیا۔ ”محبت زاد راہ جی“ اقراء سیف کیا کہوں؟ واڈامیزنگ۔ بہت زیر دست تھا آپ کا ناول۔ ”انوکھے رشتے“ بہت سوگند ناول تھا۔ سب سے اچھا کردار مجھے سنی کا لگا۔ ”ایک خدا پر یقین“، ”مگر اور“، ”مگر“ اور ”پہلا قدم“ تھے۔ بحرین! آپ کا تو نام ہی کافی ہے۔ جتنی پیاری آپ ہیں اتنی ہی پیاری آپ کی تحریر بھی۔ ”بیت گئے وہ ہیں“ اقراء چنا آپ نے لکھا ہے تو برا کہیے ہو ممکن ہے۔ ”نفرت سے محبت تک“ آسیہ مجید فرسٹ امپریشن از لاسٹ امپریشن۔ ”رشتے دنوں کے محتاج نہیں“ حشرش قاطعہ بہت چچی اور کھری بات آپ نے اپنے افسانے کے ذریعے واضح کی ہے۔ ”میںی تقدیر بھی“ عاصمہ عزیز ویری ویلڈن۔ کائنات غزل! واقعی ہم لوگ آنکھیں ہونے کے باوجود اندھے بن جاتے ہیں۔ یو آر دی بیسٹ۔ ”ردا کی ڈائری“ میں رابعہ افضل خان، افشاں علی اور شام کنول کے اختیارات کمال کے تھے۔ اشعار میں سدہ شاہین، ریمہ آرزو، سہاس گل، عائشہ نیازی، دھنک ناڈ اور صبا بحر نے متاثر کیا۔ ”اس ماہ میں“ ہر ایک قابل تعریف تھا۔ ”خوشبو“ کونورین ملک نے خوشبو کی طرح سجایا۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ میں سبکی کی شاعری متاثر کن تھی۔ ”سندیسے“ میں افشاں علی، فریدہ فرید، ریمہ نور رضوان، رابعہ افضل، ریمہ آرزو، شمیز فیاض، دانیا آفرین، سبکی آرام، طلال اسلم اور اسویرہ علی نے

اچھا تبصرہ کیا۔ ”دوستوں کے نام پیغام“ میں سب نے اپنے پیاروں کو اپنی یاد دلائی۔ ”گوشہ چشم“ لاجواب تھا۔ سدہ شاہین، حشرش رانی اور مہوش تبین کو دل سے خوش آمدید۔ ”ہاتھیں محبت کی“ میں جی کے نوام کے متعلق جان کر اچھا لگا۔ ”بچن“ اور ”سنگھار“ دونوں ہی بہترین تھے۔

گل صحر..... کراچی
ڈیڑہ صالحہ آپنی اردا کے تمام اشاف اور تمام ریڈرز کو میرا پیار بھر اسلام سب سے پہلے آپنی کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ نے مارچ کے روا میں میرے ناولٹ ”بے اعتبار محبت“ کو جگہ دی۔ اس کے بعد ان تمام ریڈرز کی مشکور ہوں جنہوں نے میرے ناولٹ کو پسندیدگی کی سند سے نوازا۔ اب کچھ اپریل کے روا کے بارے میں سب سے پہلے ”گوشہ آگہی“ اور ”ردائے جنت“ سے استفادہ حاصل کیا۔ اس کے بعد جو افسانے پڑھ چکی ان کے بارے میں ضرور تبصرہ کروں گی۔ بیت گئے وہ ہیں، نفرت سے محبت تک، پہلا قدم اور میںی تقدیر بھی۔ ایٹھے لگے۔ مکمل ناول میں اقراء سیف کا محبت جی زاد راہ پسند آیا۔ باقی سلسلے ابھی زیر مطالعہ ہیں۔

زلفہدہ ہاشمی زلفی..... کراچی
سوگند صالحہ آپنی، نورین آپنی اور پیاری روا قارئین ورائزہ! آپ سب کو زاہدہ زانی کا پیار و غلوں بھر اسلام قبول ہو۔ دعا ہے روا کے لیے کہ یہ یوں ہی ہمیشہ تر کرتا رہے اور روا کی وجہ سے ہم سب میں جو پیار بھرا رشتہ ہے وہ سدا قائم رہے، آمین۔ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے خط لیت ہونے کی معذرت چاہتی ہوں اور صالحہ آپنی و نورین آپنی کی تہ دل سے مشکور ہوں۔ شام کنول اللہ دے آپ نے میری دوستی کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو بہت غلوں سے تھما ہے۔ میں آپ کی بھی

شکر گزار ہوں۔ دعا ہے ہماری دوستی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید پختہ ہو، آمین۔ اب بات ہو جائے اس خوب صورت سلسلے کی جسے ہم ”ردائے جنت“ کہتے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح جی نئی احادیث پڑھنے کو لبیں اور ایمان میں اضافے کا سبب بھی بنیں اور ”گوشہ آگہی“ لفظ نہیں بلکہ سوتی ہوتے ہیں وہ بھی انمول۔ نورین آپنی نے خوشبو کے سلسلے کو بہت سلیقے سے مہل کر رکھا تھا۔ ”خالی ہاتھ“ شاہدہ علی کا افسانہ دل پراثر کر گیا۔ باقی تمام افسانے اور ناولٹ بھی بہت اچھے تھے۔ سلسلے وار ناول جو کہ ہمارے روا کی شان ہیں۔ بڑی شان کے ساتھ ہمیں لطف اندوز کر گئے۔ اب اجازت چاہوں گی۔

شہدہ علی..... قصور
السلام علیکم صالحہ آپنی! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ آپنی آپ جس طرح مجھے جیسی نو آموز لکھاریوں کا ہاتھ تھامتی ہیں اس کی مثال بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ ردا ڈائجسٹ نئی لکھاری بہنوں کے لیے ایک بہترین پلیٹ فارم ہے جہاں ان کی ہر طرح سے رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ آپ کی شفقت ہے کہ آپ نے میرے چند افسانے شائع کر کے مجھے مزید لکھنے کی جرأت اور تحریک عطا کی ہے۔ اس کے لیے میں تہ دل سے آپ کی شکر گزار ہوں۔ نورین ملک صاحبہ کو میری طرف سے خصوصی سلام اور دعاؤں کہ میں فون پر اکثر ان کو تنگ کرتی رہتی ہوں مگر یہ بہت عمل سے بات سنتی ہیں اور بہت نرم اور پیارے لہجے میں جواب دیتی ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ لکھنے کے حوالے سے یونہی میرا ہاتھ تھامے رکھیے گا اور اپنی رہنمائی سے نوازی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کے لیے جڑے خیر سے نوازے۔

دوستوں کے پیار

آمین

کیا لگا چاہت کا انداز ضرور بنانا۔

ہم سوویت ریڈا! سدا مسکراتی رہو۔ تمہارا خوب صورت سا کارڈ مجھے بہت اچھا لگا۔ بڈل آف سٹائل اور فضا گڑیا کو میرا بہت پیار۔ تم خود بہت پیاری شخصیت کی مالک ہو اور تمہاری آواز سے چمکتا غلوس اور خوشی ایک لمحے میں مجھے بتا دیتا ہے کہ ریمایا بات کر رہی ہے۔ تمہارے اتنے پیار اور غلوس کے لیے مجھے تو لفظ نہیں مل رہے کہ تمہارا شکر یہ ادا کروں۔ گڑیا بس دعا ہے جو چاہو وہ پاؤ سدا ایسے ہی خوش آباد رہو اپنے گھر میں۔ آمین۔

ریمایا نور ودوان۔ کراچی

تمام ردا فریڈز کے نام

میری پیاری پیاری بہنوں اور کھسی سہیلیوں افشاں علی، صبا عمر، ریمایا نور، صبا عدالتی، شعیقہ آبی، ثنا کنول، وادیہ آفرین، اسوشلی شازیہ آبی، قمرش آبی، نائیلہ آبی آپ سب لوگوں کے لیے بہت سی دعا میں۔ بہت سا پیار آپ لوگ جو چاہیں خدا وہ سب آپ کو عطا کرے، آمین۔ آپ لوگوں کا پیار غلوس میری متاع ذات ہے۔ تمہاری کھنکھوں میں بھی آپ کی تمہاری اور بیٹامات خوشی کا باعث ہوتے ہیں۔ رب تعالیٰ آپ لوگوں کو بہت بہت خوشیاں عطا کرے، آمین۔

عائشہ نیازی۔ ریوہ

اسکول کی کلاس ٹیچر کے نام دوست کے نام

عائشہ نیازی کے نام

عائشہ سندھیے میں آپ کا خط سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ یقین چاہیے آپ کے خط سے بہت انرجی آ جاتی ہے۔ اتنی تعریفیں میں آسان پڑھواؤں میں پرواز کرنے لگتی ہوں۔ آپ کی تعریفیں کرنے میری اسٹوری کو پسند کرنے کا بہت بہت شکر یہ۔ انشاء اللہ زندگی نے موقع دیا تو میری دعا ہے کہ آپ سے کبھی ضرور ملاقات ہو۔ آپ کی والدہ کا سنا بہت دکھ ہوا اور انہیں بھی۔ اللہ پاک والدہ کو صحت و زندگی دے انہیں ایسی حیاتی دے۔ آپ کی والدہ میری والدہ انہیں میرا بہت سلام اور دھیروں دعا کریں۔

قمرش شہک۔ کراچی

نورین ملک کے نام

نورین تم میری پیاری دوست گلی تمہارے لیے یہ کارڈ بنانے میں میری غمازوں نے Help کی ہے۔ میرے لیے بہت ہی محترم و چاہت کے قابل نورین ملک میری بہت ہی پیاری دوست میرے صرف ہیلو کہنے سے مجھے پچکانے والی شخصیت تمہارے لیے دھیروں دعا کریں۔ اعزاز بیاں مجھے آتا نہیں چاہت کو تم سمجھ جاتی ہو یہاں۔

میرے مولا میری دعا ہے

یہ جو پیاری ہی بس کھسی

لڑکی ہے اسے سدا خوش رکھنا

ہمارے سدا بظاہر غلوس کو

سدا قائم رکھنا

میری میٹرک کی عقیم کلاس ٹیچر مس سلی جنہوں نے میرے ساندے کے چھپے ٹیلٹ کو سمجھا، جانا اور اسے سامنے لائیں اور پھر میں نے بھی میٹرک میں اچھے مارکس لے کر آپ کا اور آپ کے اسکول کا فخر بن کر دکھایا اور آج آپ کے اسکول اور کلاس کی وہ ہوگی اور چلی خاموش بیچ اسٹوڈنٹ اس ملک کی مشہور اسٹریٹیجی آرا کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے، ہے ناں آپ کے لیے اور فخر کی بات۔ ٹھیکریا لے بالوں والی سرخ و سفید رنگت، سرخی اور دھیمی آواز میں باتیں کرنے والی حینہ فرین فریٹی کہاں ہو؟ کیسی ہو؟ تمہارے حسن کی تو میں پہلے ہی دیوانی تھی۔ اوپر سے تمہاری حسین ٹیچر نے مجھے تمہارا اور دیوانہ بنا دیا وہ دن جب ایک روز اسکول سے گھر واپسی پر ہم سب کلاس فیلوز ساتھ ٹکڑے ٹکڑے راہ لے رہے تھے سب نے اپنے اپنے گھر کے موٹر پر راستہ بدل لیا لیکن تم واحد دوست اور لڑکی تھیں جو میری ڈر پک فطرت کے باعث مجھے پہلے میرے گھر تک چھوڑ کر اپنے گھر کی راہ لی۔ جب کہ ہماری ٹیکسٹ بک کے علاوہ کوئی خاص دوست بھی نہ تھی۔

شعیقہ آراء۔ کراچی

پیاری امی کے نام

ہوں خوش بہت میں اپنے آشیاں میں بس مٹی ہوں میں اپنے اسی جہاں میں یاد آتی ہے اکثر اداس ہو جاتی ہوں گڑے پلوں کو جیتی ہوں ان میں کھو جاتی ہوں ہرگز نا مل یہ احساس دلاتا ہے مجھ کو کہ کتنا ستایا ہے ہر ماں میں نے تجھ کو بچپن میں راتوں میں بھی باتوں میں رلا لیا ہے پھر بھی ماں تو نے لودیاں دے کر سلایا ہے کبھی معصوم باتوں سے مجھے ہنسایا ہے کبھی کبھی میرا کوئی روپ تجھے بہت بھایا ہے کبھی رطبت دلائی تو نے مجھے کاموں میں مگن رکھتی ہے ہم نے سہائی شاموں میں

کبھی جولا پڑتی تھی میں پیاری ماں تجھ سے اس پل روٹھ جاتی تھیں غنڈیں مجھ سے کائنات کی ہر شے سے ماں تو اعلیٰ ہے بہت ہی چاہتوں سے تو نے مجھے پالا ہے نہیں اتار سکتی قرض میں تیری محبتوں کا دنیا میں کوئی سول نہیں تیری ان چاہتوں کا کرتی ہوں اپنے رب سے ہر دم میں دعا پوری ہو میری ماں کی ہر آرزو اور تمنا بھی نہ آئے کوئی مشکل تجھ پہ ماں تجھے دم سے روشن میرا یہ جہاں کبھی نہ بھولنا مجھے دعاؤں میں ماں تم سے ہے عمل میری ذہنت کا سناں درخشاں ضیاء۔ کراچی

میری منورہ اور پیاری سہیلیوں کے نام

عادت کے مطابق سب سے پہلے تمام کارٹینا ردا، ریڈرہ، رائزہ، نورین ملک، صالحہ آبی اینڈ ردا اسٹاف کو پیارا سا سلام پر غلوس قبول ہو۔ عمارہ شاہ، امیراٹن شامل اور انوشہ سرور آپ تینوں کی اس منتہرہ برتھ ڈے ہے۔ تو آپ سب کو میری طرف سے آپ سب کو برتھ ڈے پر بہت مبارک باد۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ آپ سب ہمیشہ خوش و آباد رہیں، آمین۔ ویسے آپ سب کس کس جہاں ہیں؟ پلیز واپس آجائیں ردا کی محفل میں اور انوشہ سرور! آپ ردا میں پہلی بار شامل ہوئی تھیں آخری بار نہیں۔ پلیز ایوری دن! کم بیک ٹوردا۔ پچھلے صفحہ کی غیر حاضری کی وجہ سے میں افسانہ آفتاب، ثناء کنول، حنا کنول اینڈ فرزانہ حبیب فرزین، آپ سب کو آپ کی برتھ ڈے ڈے وٹ تھیں کر پانی سواری۔ اینڈ پٹی برتھ ڈے بہت بہت مبارک ہو۔ حنا کنول! آپ کو آپ کی ویٹنگ اینیورسری اور ایم ایف کی خوشی بہت بہت مبارک ہو۔ ثناء کنول آپ کو کھسی کی بہت بہت مبارک باد۔ سہال جاکر بھول تو نہیں جائیں گی

ناں۔ ویسے ان کا نام کیا ہے؟ بتائیے گا ضرور۔ آپ نے بہت محبت دی ہے جس کی میں ہمیشہ مشکور رہوں گی۔ افسانہ بنی آپ سندھیے میں مجھے بھول جاتی ہیں لیکن کوئی گل نہیں جی۔ ہم تو آپ کو ہمیشہ یاد رکھیں گے اور رکھا ہوا ہے۔ سحر بین کی ادوتی کی ابتداء وہ بھی سوری سے اس ناٹ فیر۔ پلیز پہلے بھی کہہ چکی ہوں اور اب بھی کہہ رہی ہوں سوری اور تھک پون نہیں کہا کریں ناں، پر اپنا پر اپنا لکھا ہے۔ امیرین حیدر جی آپ بھی لکھا ہے بھول گئیں۔ واپس آجا میں سندھیے کی شکل میں۔ شہلا گل عرا آپ کو راکھی شکل میں دل سے دیکھ کر رہی ہوں۔ آپ کا نام بہت چار اور بونیک ہے۔ دوستی کریں گی مجھ سے؟ اور آپ شام کنول اور افشاں علی سے لازمی دوستی کریں گے۔ محبت بہت دینی ہیں۔ افشاں علی! کسی نہ کسی پہانے سے آپ مجھے یاد رکھتی ہیں۔ چکی بہت خوش ہوئی ہے۔ آسہ علی! غائب کہاں ہیں؟ رابعہ افضل خان کو بھی میری سندھیے میں بالکل اچھی نہیں لگی۔ آپ کی طرح اور کتنی ہی قارئین کو بھی میری کی اچھی نہیں لگی ہوگی۔ اس لیے آتم بیک اب تو خوش ہیں ناں۔ ویسے آپ کے سندھیے بہت زبردست ہیں۔ ملازم! آپ نے میرا نام لیا تو نہیں پھر بھی میں آپ سے دوستی کرنا چاہتی ہوں کریں گی ناں پلیز جواب ضرور دیجیے گا۔ مومن شاہ! آپ نے بھی دوستی کی ابتداء سوری سے کی بہت فلفل بات ہے۔ ناراض تو نہیں ہو سکتی مگر آپ کی مسکراہٹوں کا تھوہ چاہتی ہوں۔ اس لیے جتنی بھی فینشن ہو یا بڑی ہوں مسکرائی رہے گا۔ مصباح مسکان رؤف اینڈ امینہ رؤف بہت خوش رہیں۔ قارئین ردا کے نام آپ کا پیغام پڑھا بہت خوش ہوئی۔ زاہدہ ہاشمی جی! مجھے بھی آپ کی دوستی قبول ہے اور پلیز جلدی سے ٹیک ہو جائیں ناں۔ میں بھی دعا کر رہی ہوں اور تمام قارئین بھی دعا کریں کہ اللہ رب العزت! زاہدہ جی اور تمام مسلمان (جو بھی بنار

ہیں) سب کو شفا کاملہ عطا فرمائے (آمین ثم آمین)۔ دانیاہ آفرین! آپ کو بھی منگنی کی بہت بہت مبارکباد اور عانیہ نیازی! آپ کو آپ کی امی کی صحت یابی کی ڈھیروں مبارکباد۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ سب کو اور ردا سے جڑے ہر فرد کو خوش، کامیاب اور شاد و آباد رکھے، آمین۔ اور میرے لیے دعا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین)۔

مباہد الغنی۔ کراچی دوستوں کے نام پیغام

میری تمام راتیں دوستوں کو رابعہ افضل خان کا محبت بھر اسلام قبول ہوں ملازم! سلام، مباہد الغنی، فریدہ فریدہ، افشاں علی، عانیہ نیازی، نانکہ طارق، شادیہ مصطفیٰ قمر و شہک، عانتہ خان، مومن شاہ! آپ سب لوگوں کے لیے غلوں دل سے ڈھیروں دعا میں خدا آپ لوگوں کو ہمیشہ ہنستا مسکراتا رکھے اور زور ظلم میں حریہ روانی اور طاقت دے، آمین۔ ملازم! سلام، افشاں علی، مباہد الغنی، عانیہ نیازی، فریدہ فریدہ! آپ سب کا پیار اور ساتھ بہت اچھا لگتا ہے اس پیار کو دوستی میں بدلنا چاہتی ہوں کیوں کہ مجھے دوست زندگی کا لاکھ ہوتے ہیں اگر دوستی قبول ہو تو جواب ضرور دیجیے گا۔

رابعہ افضل خان۔ کراچی تمام فریڈز کے نام

السلام علیکم دوستوں، بہنوں، افشاں علی، کشف ضیاء، حمیرا عروش، مباہد الغنی، صبا سحر، دھنک نازہ، صالحہ آبی، نورین آبی، عانتہ ڈوالقار، ملازم! سلام، دانیاہ آفرین، ندا حسنین، سحر فاطمہ باقی سب کیسی ہیں۔ میری زندگی کا سب سے خوب صورت دن 24 جنوری اور 25 جنوری ہے۔ اسی دن کو آج میں آپ سب سے میٹر کرنے جا رہی ہوں۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ بھلا ان دنوں میں ایسا کیا ہوا جو میرے لیے خاص بن گئے ہیں۔ تو میں بتاتی ہوں عام دنوں کی طرح ہی دن گزر رہے تھے کہ بھلا اکل جو کہ سعودیہ

عرب میں کام کرتے ہیں کا فون آیا کہ وہ پاکستان آرہے ہیں۔ یہی تو پھر کیا تھا گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ساتھ ہی آپ کی شام کنول اللہ دتہ یعنی میری منگنی کی بھی عانتہ بھابی اکل بھابی کی منگیت کا بھائی یاسین میرا منگیت بنا۔ 24 جنوری کو منگنی کی تاریخ رکھی گئی۔ 23 جنوری کو شام کنول اللہ دتہ جو کاب حاکم کنول شہزادہ ہے۔ کراچی سے لوہراں آئی۔ ہفتہ 24 جنوری کی شام مجھے حاکم آبی نے تیار کیا۔ میک اپ کے بعد پھولوں کا زیور پہنایا گیا۔ ریڈ کلر کے ڈریس میں جو کہ میری ساس نے مجھے دیا تھا ڈھیروں چڑیاں پہنے میں شرمائی گھبرائی تیار تھی۔ یاسین بھی آگئے۔ پوری بات کے ساتھ اور جب مجھے لے جا کر ان کے پاس بٹھایا گیا تو جب مجھے احساس ہوا اپنا آپ کسی کے نام کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایک پل کے لیے دل رک سا جاتا ہے۔ دھرم کی چیز ہو جاتی ہے۔ خیر یاسین نے مشائی مجھے کھلائی اور اپنا ہاتھ انہوں نے میرے کندھے پر چبھایا ہی رکھا میں اندر تک کانپ کر رہی تھی اور اس بات کا بدلہ میں نے مشائی کھلائے وقت خوب لیا۔ وہ اس طرح سے کہ یاسین کے منہ کے قریب میں نے مشائی کی انہوں نے کھانے کے لیے جیسے ہی منہ کھولا میں نے ہاتھ پیچھے کر لیا اور ایسا تین چار بار میں نے کیا۔ پھر بالآخر مجھے ان کے حال پر دم آئی گیا اور میں نے انہیں مشائی کھلا دی۔ یوں ہی ہنستے ہوئے میری ساس نے میرے سر پر یاسین کے نام کی چڑی ڈالی اور ہاتھ میں انگوٹھی۔ پھر مغرب کی اذان ہونے لگی تو یاسین وغیرہ چلے گئے۔

25 جنوری کو دوبارے گھر والے یاسین کے گھر گئے۔ عانتہ بھابی کی منگنی کرنے۔ ایک بات میں واضح کر دوں کہ میرا اور میرے بھائی کا رشتہ ویشٹ ہو رہا تھا۔ کچھ مہینے میں بھائی کی شادی کریں گے جب کہ میری دو تین سال بعد۔ بھابی عانتہ پھولوں

کا زیور پہنے بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ میری کزن شہناز جو کہ حاکم آبی کی کندہ اس نے عانتہ بھابی کا میک اپ کیا تھا۔ امی نے بھابی کے سر پر اکل بھابی کے نام کی چڑی ڈالی مشائی سے اس کا منہ ٹھٹھا کیا پھر فروٹوں کی بڑی سی ٹوکری اس کی گود میں رکھی۔ تھوڑی سی دیر باقی گانے کے بعد ہم سب واپس آگئے۔ ایک بات میں بتاتی چلوں کہ آپ کی راتیں شام کنول اللہ دتہ ہمیشہ کتنی رہے گی۔ بس شرط صرف اتنی ہی ہے کہ آپ مجھے پڑھیں گے اور تعریف یا تنقید ضرور کریں گے۔ کچھ نئے اور کچھ انوکھے رشتے ہی انسان کی زندگی کا حاصل ہوتے ہیں جب آپ کا نام کسی کے نام سے جڑ جاتا ہے تو تب آپ آپ نہیں رہتے وہ ہو جاتے ہیں۔ نئے رشتے بنانا جتنا آسان ہوتا ہے۔ بھانا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ آپ سب پلیز میرے لیے دعا کریں کہ میں یہ نئے رشتے نبھاسکوں۔ اب میں اپنی کچھ کیوٹ سوئٹ اور اچھی سی دوستوں کے نام لکھوں گی ان کے نام جو مجھے خود سے بڑھ کر عزیز ہیں۔ کیوٹ سی دھنک نازہ، پیاری سی صبا سحر، اچھی سی افشاں علی مسکرائی ہوئی کشف ضیاء مباہد الغنی اور افسانہ آفتاب سدا خوش رہنے والی حمیرا افسانہ، ملازم! سلام، ریمل آرزو، امینہ رؤف، مصباح مسکان، صانتہ قریشی، رابعہ افضل، دانیاہ آفرین، حمیرا عروش، حنا اصغر، عانتہ مومن شاہ بخاری عانتہ ڈوالقار، مہرین کنول، عانیہ نیازی، رعنا نور، فریدہ فریدہ، زانی جن کے نام رہ گئے ہیں ان سے سوری۔ آپ ہی میری سب کچھ ہو تو پلیز میرے لیے دعا کرنا۔ صرف ایک گزارش ہے سب سے

جودل پل پو بھو ہے اتا رددو
دودن زندگی کے ہیں جنس کر گزاردو
میں تم کو اپنی جان دوں گی سب کچھ
بدلے میں تم سب مجھے صرف اپنا پیار دودو
شام کنول اللہ دتہ۔ لوہراں

باتیں صحت کی

مند ہے۔ یہ فولاد کی فراہمی کا بھی ذریعہ ہے۔ بعض اطباء دم اور جوڑوں کے درد کے علاج میں بھی زیرہ استعمال کرتے ہیں۔ پیٹ کی گیس، جلن، پت اور بخار میں یہ بڑا فائدہ مند ہوتا ہے۔ اگر بھوک نہ لگتی ہو تو زیرہ بھون کر انار کے رس کے ساتھ ملا کر کھانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ بواسیر کے مسئلے میں بھی زیرہ بہت فائدہ مند ہے۔ زیرہ کو مصری کے ساتھ کھانے سے بواسیر کی تکلیف میں افادہ ہوتا ہے۔ زیرہ بڑھے ہوئے پیٹ اور کئی نوع کا بھی بہترین علاج ہے۔ چھوٹے بچوں کو بھی انی وغیرہ ہونے پر زیرہ، لونگ، کالی مرچ اور شکر کو برابر مقدار میں لے کر پاؤڈر بنا لیں۔ شہد کے ساتھ دن میں دو تین بار یہ پاؤڈر چاٹنے سے تے آتی بند ہو جاتی ہے۔

آلو بخارا

موسم گرم کا پھل آلو بخارا بے شمار شفائی اثرات کا حامل ہے۔ موسم کی مناسبت سے قدرت نے اس کا حراج سرد و تر رکھا ہے۔ فرحت بخش اور قبض کشا ہے۔ اس کا حراج سرد درجہ اول اور تر درجہ دوم ہے۔ اس کی مقدار خوراک دس سے تیس دانے تک ہوتی ہے۔ اس جیاتین پھر پھل میں قدرت نے گوشت پیدا کرنے والے کمی اور نشاستہ دار اجزا کے علاوہ فولاد، کیشیم، پوٹاشیم، فلورین اور فاسفورس کے اجزا بھی وافر مقدار میں سمود دیے ہیں۔ اس میں امینو ایسڈ کے علاوہ قدرتی گلوکوز کی بھی کافی مقدار

زیرہ نہ صرف نظام ہضم کی خرابیوں کو دور کرتا ہے بلکہ اس میں جراثیم کش علامات بھی پائی جاتی ہیں۔ اس میں اسٹی آکسیڈنٹ مرکبات اور تھائمو کینون بھی پایا جاتا ہے جو پراسٹیٹ گنڈ سے بچاتا ہے۔ زیرہ کے بیج میں آئرن بھی ہوتا ہے جس سے جگر کی طاقت بڑھ جاتی ہے۔ بذہنی کے علاوہ دست، انی، منگی خاص طور پر حاملہ خواتین کی صبح کے وقت ہونے والی منگی کی کیفیت کو روکنے کے لیے زیرہ کو انتہائی مفید قرار دیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک گلاس پانی میں ایک چائے کا چمچ زیرہ ڈال کر جوش دیا جائے اور اس میں نمک اور پودینے کا عرق شامل کر کے پلایا جائے تو افادہ ہوگا۔ عام نزلہ زکام میں بھی زیرہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ گلے کی خراش میں زیرہ کے جوشاندے میں ہنسی ہوئی سوٹھ شامل کر کے خوارے کرنے سے آرام ملتا ہے۔ اگر کوئی بیماری نہ بھی ہو تو زیرہ کا جوس جسم کے لیے بہترین ٹانک کا کام کرتا ہے۔ اس کے استعمال سے غذا ہضم کرنے والی جستانی صلاحیت بہتر ہو جاتی ہے۔ گردہ اور جگر کی کارکردگی پر بھی اس مشرقی بڑی بوٹی کا بہتر اثر ہوتا ہے اور بیماریوں سے محفوظ کرنے والا قدرتی نظام توانا رہتا ہے۔ زیرہ ماں کے دودھ میں اضافہ کرتا ہے جب کہ باض بہتر بنانے اور قبض، معدے کی جیزایت اور جی مسئلے سے نجات دلانے میں بھی فائدہ

ایک دن کی دوا من بی کی کی پوری کرتا ہے۔ جلد اور بالوں کے لیے بے حد مفید ہے۔ عام طور پر کھیرا کھانے کا جو طریقہ بتایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کا چھلکا اتار کر کھایا جائے۔ یہ بھی کسی حد تک درست ہے لیکن چھلکے میں دوا من اے اور سی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے اس سے پورے فوائد حاصل کرنے کے لیے اس کو اچھی طرح دھو کر چھلکے سمیت کھانا چاہیے۔ کھیرا چل کر تھوڑے سے دودھ میں ملا کر چہرے پر لگائیں۔ چہرہ تر و تازہ ہو جائے گا۔ کھیرے کی پتلی قاشیں کاٹ کر آنکھوں کے حلقوں کو اس سے ڈھانپ لیں۔ آنکھوں کے حلقوں کا یہ بہترین علاج ہے۔

نمک

نمک ملا کر دن میں دو بار گندے اور سڑے ہوئے زخموں کو دھوئیں۔ اس سے زخموں کا گندامادہ نکل جاتا ہے اور زخم جلد بھر جاتا ہے۔

چھل: کسی چھری کی تیز پر پانی کے چند قطرے ڈالیں اور اس پر نمک کی ڈلی کو کھسائیں اور چھل پر لیپ کریں۔ دن میں دو تین بار لگانے سے پرانے سے پرانا چھل دور ہو جاتا ہے۔

داد: چند روز اسی نسخے کو استعمال کرنے سے داد بھی دور ہو جاتا ہے۔ آرام آنے کے بعد بھی چند روز لیپ کرتے رہیں تاکہ اس کی جڑ باقی نہ رہ جائے۔

پھوڑے: جو پھوڑے ابھی بکے نہ ہوں ان پر گاڑھا گاڑھا نمک کا حلو لیپ کریں اور اوپر گرم چاول یا کھجڑی باندھ دیں۔ دن میں تین بار ایسا کریں اس سے پھوڑے بہت جلد پک کر پھوٹ جاتے ہیں۔ بھیری کے پتے گرم کر کے باندھنا بھی مفید ہے۔

☆.....



چکن ٹلٹس و نوڈلز

چکن منچورین

اجزاء	چکن ٹلٹس	چکن منچورین
چکن ٹلٹس	ایک پکٹ	پون لیس چکن
نوڈلز (اگلے ہوئے)	تین کپ	چکن اشاک
مٹر کے دانے	آدھا کپ (بال لیس)	ہری پیاز (چو پٹ)
گاجر	ایک عدد	ہری مرچ
ہری پیاز	ایک عدد	شملہ مرچ
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچ	اٹھا
سرکہ	ایک چائے کا چمچ	سٹری (چو پٹ)
لہسن (چو پٹ)	ایک چائے کا چمچ	ٹماٹو کچپ
آئل	دو کھانے کے چمچ	میدہ
کالی مرچ پاؤڈر	حسب ذائقہ	کارن فکور
ہمک	حسب ذائقہ	سویا ساس
آئل	فرانگ کے لیے	اورک (چو پٹ)
سلا دہا	گارفشنگ کے لیے	سرخ مرچ پاؤڈر
ترکیب: گرم آئل میں لہسن فرائی کر کے مٹھا اور گاجر کو ہلکا فرائی کریں۔ پھر ہمک، کالی مرچ، سرکہ، سویا ساس اور نوڈلز ڈال کر مکس کریں۔ چولے سے اتار کر ہری پیاز مکس کر دیں۔ اب ٹلٹس کو گرم آئل میں ڈیپ فرائی کر لیں۔ سر دیک ڈش میں سلا دہا پتے بچھا کر اوپر نوڈلز ڈالیں اور ٹلٹس سے سجا کر سرو کریں۔		ہری پیاز (ہر اصد)
		ترکیب: میدہ، اٹھا، آدھا کارن فکور، آدھی سویا سوس اور سرخ مرچ پاؤڈر مکس کر کے پیسٹ بنالیں۔ اس پیسٹ میں چکن ڈپ کر کے گرم آئل میں ڈیپ فرائی کر لیں۔ دوسرے تین میں تین کھانے کے چمچ

آئل گرم کر کے ہری پیاز، لہسن، اورک، ہری مرچ، شملہ مرچ اور سٹری کو ہلکا فرائی کر لیں۔ پھر ہمک، بقیہ سویا ساس، ٹماٹو کچپ اور چکن اشاک ڈال کر پکائیں۔ اٹھنے لگے تو بقیہ کارن فکور تھوڑے سے پانی میں گھول کر شامل کریں اور گاڑھا کر لیں۔ اب چکن مکس کر کے چولے سے اتار لیں۔ ہری پیاز سے گارفشنگ کر کے سرو کریں۔

چاکلیٹ ڈیزرٹ

سبزی پلاؤ

آئل گرم کر کے ہری پیاز، لہسن، اورک، ہری مرچ، شملہ مرچ اور سٹری کو ہلکا فرائی کر لیں۔ پھر ہمک، بقیہ سویا ساس، ٹماٹو کچپ اور چکن اشاک ڈال کر پکائیں۔ اٹھنے لگے تو بقیہ کارن فکور تھوڑے سے پانی میں گھول کر شامل کریں اور گاڑھا کر لیں۔ اب چکن مکس کر کے چولے سے اتار لیں۔ ہری پیاز سے گارفشنگ کر کے سرو کریں۔

اجزاء	چکن	چاکلیٹ ڈیزرٹ
چکن	ایک لیٹر	دودھ
پالک	ایسی گرام (پکھلا لیں)	کوئنگ چاکلیٹ
میتھی	چار عدد	اٹھے کی زردی
اورک لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچ	کارن فکور
چینی	ایک کھانے کا چمچ	کیسٹ شوگر
چاول	دو کپ (بھگو لیں)	وٹالا
پیاز	ایک عدد (چو پٹ)	اٹھوٹ (چو پٹ)
ہری مرچ	چھ عدد (چو پٹ)	ترکیب: اٹھے کی زردیوں میں کارن فکور اور کیسٹ شوگر ڈال کر اچھی طرح پیسٹ لیں۔ دودھ گرم کر کے زردیوں کا کچھ شامل کریں اور ہلکی آگ پر پکائیں۔ دودھ گاڑھا ہو جانے پر چاکلیٹ، اٹھوٹ اور وٹالا اسٹنس شامل کر کے چھ سیکنڈ پکائیں اور چولے سے اتار لیں۔ شفا کر کے سرو کریں۔
پودینہ	آدھی ٹمبی (چو پٹ)	وٹگی ٹیکل فرائیز رائس
ہر ادھیا	ایک ٹمبی (چو پٹ)	
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچ	
کالی مرچ	دو چائے کے چمچ	
زیرہ	آدھا چائے کا چمچ	
زرد رنگ	پون چائے کا چمچ	
آئل	تھوڑے سے پانی میں گھول لیں)	
ہمک	حسب ضرورت	
ترکیب: گرم آئل میں زیرہ کڑکڑائیں۔ اب چکن، اورک، لہسن پیسٹ اور پیاز ڈال کر ہلکا فرائی کریں۔ پالک، ہری مرچ، پودینہ، میتھی اور ہر ادھیا		چاول (اگلے ہوئے)
		گاجر (باریک ٹکی ہوئی)
		ہری پیاز (چو پٹ)
		مٹر کے دانے
		سویا ساس
		لہسن (چو پٹ)
		آئل

جلد کی دیکھ بھال

ہماری جلد پر ہر روز مردہ خلیوں کی ایک تہہ جمع ہو جاتی ہے جس کے باعث یہ بے رونق اور کھردری نظر آنے لگتی ہے۔ زیادہ تر خواتین چہرے کی کلیمزنگ، ٹونک اور مونچھ اڑنگ کی اہمیت سے توجہ دہاں ہیں لیکن وہ اس بات سے آگاہ نہیں کہ اس کی کڑکھلائی اس کی جلد کے بغیر اور

رہتا ہے۔ عام تصور یہ ہے کہ روزانہ اسکریننگ سے
چہرے کی جلد خراب ہو جاتی ہے۔ جب کہ سچ یہ
ہے کہ اگر آپ باقاعدگی کے ساتھ کسی نرم اثر
اسکرب سے چہرے کی اسکریننگ نہ کریں تو مردہ
کھال جمع ہو کر اسے خشک اور کھو رہا بنادے گی۔

یہ بے جان خلیے جلد کی تازگی چھین لیتے ہیں کیوں کہ ان کے باعث آپ کی جلد مکمل کر سانس نہیں لے سکتی۔ مہاجرین کی رائے کے مطابق جلد سے

مرد و عورتیں اتارے بغیر ٹخنوں تک اور ٹونگ کرنا دانے اور مہا سے پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے کیوں کہ مردہ خلیوں کے باعث جلد کے مسامات بند ہو سکتے ہیں اور بیکٹیریا کی افزائش کے نتیجے میں اس پر اپنی نمودار ہو سکتی ہے۔

باقاعدہ اسکریننگ سے جلد کے مسامات بند نہیں ہوتے اور خواتین کے ذہن میں اسکریننگ سے متعلق غلط تصورات پائے جانے کی وجہ عام طور پر غلط اسکریننگ کا استعمال ہے۔ لہذا اس مسئلے میں

کتاب و دوا یونیز اورک پیٹ : ایک چائے کا بیج
نمک : حسب ذائقہ

اورج : ایک عدد (رس نکالیں)
 لمبن : تین جوے (چھ پڑے)
 اورج زریٹ : ایک کھانے کا کچ
 بے بھلا ہوتا : تم کو : کہو

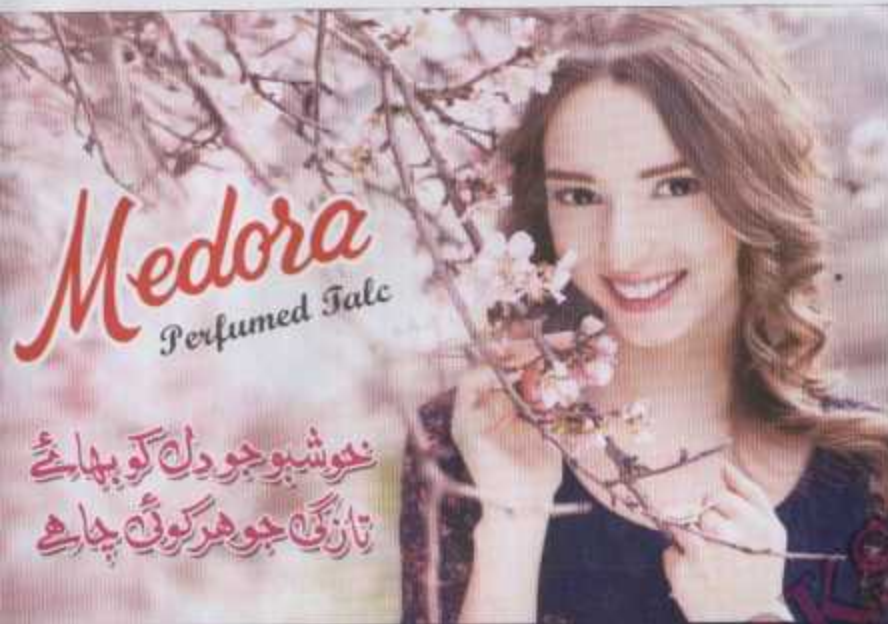
ہندی اور لارک ڈال کر چھ منٹ حریم جھنیں۔ اب اس
 میں نمک اور پھر شال کر کے تیز آج پر مڑ گئے تک
 پکا لیں۔ ہر سہ منٹ سے سجا کر پیش کریں۔

ایک عدد (بال کر سلاسنو کاٹ لیں) : اثرا
ایک عدد (سلاسنو) : لہذا

کے لیے دفتر میں رہ دیں۔ اب ایجنڈہ میں
 پروگرام کر لیں۔ ایجنڈہ کے تمام اجلاس کر لیں۔ بریل
 اور سلاہ پر کیا یہ بھی ادارہ ایجنڈہ ڈال کر سرور کریں۔

مترجم

آگل : بارہ گرام : ۲۲۴ : ۲۰۱۵



خوشبو کی دنیا کے شگفتہ احساس



8 مختلف و اقرب خوشبوؤں میں دستیاب ہے

MEDORA OF LONDON

سے اوجھل نہ ہو جائے۔ کلیننگ، اسکرنگ، ٹونک اور موچر انرنگ کو اپنے روز کے معمول میں شامل رکھیں۔ پھر دیکھیں کہ اس کے کتنے حیرت انگیز نتائج آپ کے سامنے آتے ہیں۔

بیوٹی ٹپس

گرمی کے موسم میں اگر چند کھنکے باہر گزارنا چاہتی ہیں تو کمرے سے نکلنے سے پہلے بالوں میں تھوڑا سا کیوں کا عرق لگائیں۔ اس سے آپ کے بال ریشمی اور خوب صورت نظر آئیں گے۔ مزید یہ کہ دھوپ کے برے اثرات سے بھی بہت حد تک محفوظ رہیں گے۔

☆ اگر زیادہ دیر باہر دھوپ میں گزارنے کے باعث آپ "سن برن" کا شکار ہو گئی ہیں تو متاثرہ جگہ پر الیویرا کا عرق لگائیں یا ایسا کوئی لوشن لگائیں جس میں الیویرا شامل ہو۔ اس سے نہ صرف آرام آئے گا بلکہ جلد بھی جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی۔

☆ گرمیوں کے موسم میں چونکہ خواتین باریک فیتوں والے سینڈل اور چلیں پہنتی ہیں جن میں پاؤں زیادہ تر کھلے رہتے ہیں۔ لہذا اس موسم میں پیروں کی صفائی سحرانی اور دیکھ بھال بہت ضروری ہے۔ گھر پر فٹ اسکرپ تیار کرنے کے لیے دانے دار نمک یا چینی اور زیتون کا تیل ملا لیں اور اسے نرمی کے ساتھ پیروں پر لگائیں۔ اس عمل سے آپ کے پیروں کی مردہ کھال آسانی سے اتر جائے گی اور وہ صاف سحرے نظر آئیں گے۔

☆ اگر آپ کے پاؤں کے ناخن، نیکل پالش لگانے یا کسی اور وجہ سے پیلے ہو گئے ہیں تو پانی کے عذب میں لٹکا کر ڈال کر اس میں تھوڑی دیر تک پاؤں بھگوئیں۔ ناخنوں کا پیلہ پن دور ہو جائے گا۔

☆ موسم گرما کے دوران آبی میک اپ ریوور ہمیشہ اپنے پرس میں رکھیں تاکہ یہ وقت ضرورت آنکھوں کا میک اپ صاف کر سکیں۔

☆ گرمی کے موسم میں زیادہ پینے کے باعث چہرے کے مسامات کھل جاتے ہیں اور چہرے پر دانے اور مہاسے پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ لہذا دن میں کئی بار منہ دھوئیں اور وقتاً فوقتاً ٹھنڈے عرق گلاب کو چہرے پر چھپتائیں۔

نیم کے فوائد

نیم کے بے شمار فوائد ہیں۔ یہ ایک سستا اور آسانی سے فراہم ہونے والا قدرتی تھقبہ جس کے ذریعے کم قیمت میں با آسانی بے شمار فوائد اٹھائے جاسکتے ہیں۔ اس کا کوئی سائیڈ انٹیکٹ نہیں۔ چھ اہم فوائد درج ذیل ہیں:

☆ خون صاف کرتا ہے۔ چہرے کے دانے، مہاسے، کیل، مہاسے ختم کرتا ہے۔ جسم کے تمام امیگیشن میں مفید ہے۔ شوکر کنٹرول کرتا ہے۔ لی پی کنٹرول کرتا ہے۔ جسم سے بھدک ایسڈ ختم کرتا ہے۔

☆ یورین کے ذریعے تمام قاسمہ مادوں کا اخراج کرتا ہے۔ بہترین ماؤتھ واش ہے۔

☆ دانتوں کو صاف کرتا ہے۔ Plaque کو صاف کرتا ہے۔ کینسر کے خلیوں کو متحرک نہیں ہونے دیتا۔ نیم کے اندر Antioxidants 400 ہوتے ہیں۔ جو جسم سے ریڈیکل کا اخراج کرتے ہیں۔ ریڈیکل وہ عناصر ہوتے ہیں جو اعضا کو تباہ ہونے سے روکتے ہیں۔

☆ بالوں کو لمبا، گھنا، صحت مند اور چمکدار کرتا ہے۔